اسلام اور جدید معاشی مسائل

جلد ہفتم

اسلام کا معاشی نظام

۷

شیخ الاسلام جسٹس (ر) مولانا مُحمّد تقی عثمانی دامت برکاتہم

ادارۂ اسلامیات
پبلشرز، بک سیلرز، ایکسپورٹرز

اسلام اور جدید معاشی مسائل

جلد ہفتم

اسلام کا معاشی نظام

اِسلام
اور
جدید معاشی مسائل

جلد ہفتم

اسلام کا معاشی نظام

شیخ الاسلام جسٹس (ر) مولانا مُحمّد تقی عثمانی دامت برکاتہم

ترتیب و تالیف

مولانا مفتی محمود احمد صاحب
دارالافتاء جامعہ اشرفیہ۔ لاہور

اِدارہ اسلامیات
پبلشرز، بک سیلرز، ایکسپورٹرز

★ ۱۴ دینا ناتھ مینشن مال روڈ، لاہور
فون ۷۳۲۴۴۱۲، فیکس ۹۲-۴۲-۷۳۲۴۷۸۵

★ ۱۹۰ انارکلی، لاہور، پاکستان
فون ۷۲۴۳۹۹۱، ۷۳۵۳۲۵۵

★ موہن روڈ چوک اُردو بازار، کراچی
فون ۲۷۲۲۴۰۱

نام کتاب

اسلام
اور
جدید معاشی مسائل

جلد ہفتم

اسلام کا معاشی نظام

اشاعت اول

جمادی الاولیٰ ۱۴۲۹ھ —— جون ۲۰۰۸ء

ادارہ اسلامیات
پبلشرز، بک سیلرز، ایکسپورٹرز

۱۴- دینا ناتھ مینشن، مال روڈ، لاہور فون ۷۳۲۴۴۱۲ فیکس ۷۳۲۴۷۸۵-۴۲-۹۲+

۱۹۰- انارکلی، لاہور- پاکستان ....فون ۷۲۴۳۹۹۱-۷۳۵۳۲۵۵

موہن روڈ، چوک اردو بازار، کراچی- پاکستان.....فون ۲۷۲۲۴۰۱

ملنے کے پتے

ادارۃ المعارف، جامعہ دار العلوم، کورنگی، کراچی نمبر۱۴

مکتبہ دار العلوم، جامعہ دار العلوم، کورنگی، کراچی نمبر۱۴

ادارۃ القرآن والعلوم الاسلامیہ، چوک لسبیلہ، کراچی

دار الاشاعت، اردو بازار، کراچی نمبر۱

بیت القرآن، اردو بازار، کراچی نمبر۱

بیت العلوم، نابھہ روڈ، لاہور

فہرست مضامین

☆☆

بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم
الحمدللّٰہ رب العالمین والصلوۃ والسلام علی رسولہ
الکریم وعلی آلہ واصحابہ اجمعین

عُرفِ زمانہ کی واقفیت

حضرات فقہائے کرام فرماتے ہیں

"من جھل باھل زمانہ فھو جاھل"
(شرح عقود رسم المفتی ص۹۸)

''اور جو آدمی اپنے اہل زمانہ سے واقف نہ ہو (یعنی اہل زمانہ کے طرزِ زندگی، ان کی معاشرت اور ان کے مزاج و مذاق سے واقف نہ ہو) تو جاہل ہے''

ایک عالم کے لیے جس طرح قرآن وسنت کے احکام سے واقف ہونا ضروری ہے اسی طرح اس کے لیے زمانہ کے ''عرف'' اور زمانہ کے حالات سے واقف ہونا بھی ضروری ہے اس کے بغیر وہ شرعی مسائل میں صحیح نتائج تک نہیں پہنچ سکتا۔ حضرت امام محمد بن الحسن شیبانیؒ کے حالات میں یہ بات وضاحت کے ساتھ ملتی ہے کہ فقہ کی تدوین کے دوران وہ باقاعدہ بازاروں میں جا کر تاجروں کے پاس بیٹھتے، اور ان کے معاملات کو سمجھتے تھے اور یہ دیکھا کرتے تھے کہ کونسے طریقے بازار میں رائج ہیں، ظاہر ہے کہ ان کا مقصد خود تجارت کرنا نہیں تھا، وہ صرف یہ جاننے کے لیے تاجروں کے پاس بیٹھا کرتے تھے کہ ان کے کیا طریقے ہیں اور ان کے درمیان آپس میں کیا عرف رائج ہے؟ اس لیے کہ ان چیزوں سے واقفیت ایک عالم اور بالخصوص ایک فقیہ اور مفتی کے فرائض میں داخل ہے کہ جب اس کے بارے میں اس کے پاس سوال آئے تو وہ اس سوال کے پس منظر سے اچھی طرح واقف ہو، اس کے بغیر وہ صحیح نتائج تک نہیں پہنچ سکتا ...... بلکہ یہاں تک کہا گیا ہے کہ جب کسی علاقے یا معاشرے میں ناجائز کاروبار کی کثرت ہو تو چونکہ عالم اور مفتی صرف فتویٰ جاری کرنے والا نہیں ہوتا بلکہ وہ ایک داعی بھی ہوتا ہے اس لیے اس کا کام اس حد پر جا کر ختم نہیں ہو جاتا کہ وہ یہ کہہ دے کہ فلاں کام ناجائز اور حرام ہے، بلکہ بحیثیت داعی اس کے فرائض میں یہ بھی داخل ہے کہ اس کام کے حرام اور ناجائز کہنے کے بعد یہ بھی بتائے کہ اس کا متبادل حلال طریقہ کیا ہے؟ وہ متبادل قابل عمل بھی ہونا چاہیے اور شریعت کے مطابق

بھی ۔ حضرت یوسف علیہ السلام کا واقعہ قرآن کریم میں مذکور ہے کہ جب ان کے پاس قید خانہ میں بادشاہ کا پیغام پہنچا اور خواب کی تعبیر ان سے پوچھی گئی تو حضرت یوسفؑ نے خواب کی تعبیر تو بعد میں بتلائی کہ سات سال کا قحط آنے والا ہے لیکن اس قحط سے نجات پانے کا طریقہ پہلے ہی بتا دیا، چنانچہ فرمایا کہ

"فما حصدتم فذروه فی سنبله الا قليلا مما تاکلون"

اس آیت سے یہ استنباط کیا گیا ہے کہ داعی حق صرف حرام کام کو حرام کہہ دینے پر اکتفانہ کرے کہ یہ مصیبت آنے والی ہے بلکہ اپنے امکان کی حد تک اس سے نکلنے کا راستہ بھی بتائے اور یہ راستہ اسی وقت بتایا جا سکتا ہے جب آدمی معاملات اور حقائق سے واقف ہو۔ اسی بات کے پیش نظر یہ ضروری سمجھا گیا کہ معاملاتِ جدیدہ کے متعلق ایک درس تخصص کے نصاب میں شامل ہو۔ معاشیات آجکل ایک مستقل فن بن چکا ہے اور اس کے متخصص ماہرین ہوتے ہیں، اس وقت فنِ معاشیات کو بتمام وکمال پڑھانا پیش نظر نہیں ہے، بلکہ اس کے ان حصوں سے آپ کو متعارف کرانا ہے جن کی ضرورت ایک عالم اور فقیہ کو بحیثیت فقیہ پیش آتی ہے، اور جس کے بارے میں بکثرت سوالات بھی آتے ہیں، اور ان کا جواب تلاش کرنا ہوتا ہے۔ عموماً ماہرینِ معاشیات ایک عالم کی ان ضروریات سے واقف نہیں ہوتے جن کی عالم کو تحقیقِ مسائل میں ضرورت پیش آتی ہے اس لیے میں نے خود ہی اس درس کا اہتمام کیا۔

نظامہائے معیشت اور ان پر تبصرہ

دنیا میں اس وقت جو مختلف معاشی نظام رائج ہیں ان میں دو نظام سب سے زیادہ نمایاں ہیں، ایک سرمایہ دارانہ نظام (Capitalism) جس کو عربی میں "الرأس المالية" کہتے ہیں، اور دوسرا اشتراکی نظام (Socialism) جس کو عربی میں "الا شتراكية" کہتے ہیں، اسی کی انتہائی صورت اشتمالیت (Communism) ہے جسے عربی میں "الشيوعية" کہا جاتا ہے۔ دنیا میں جو کچھ کاروبار یا معاملات ہو رہے ہیں وہ انہی دو نظاموں کے تحت ہو رہے ہیں، سوویت یونین کے زوال کے بعد اگرچہ سوشلزم ایک سیاسی طاقت کی حیثیت سے تو ختم ہو چکا اور اس کے ساتھ ہی اس نظریئے کی طاقت بھی کمزور پڑ گئی تھی لیکن ایک معاشی نظریہ کے اعتبار سے وہ دنیا کے معاشی نظریات میں اب بھی خاصی اہمیت کا حامل ہے اس لئے اس کا سمجھنا بھی ضروری ہے، لہٰذا سب سے پہلے ان دو معاشی نظاموں کا تعارف پیش کیا جاتا ہے اور پھر اس کے مقابلہ میں اسلام کے وجوہ امتیاز کو بیان کیا جائیگا۔

بنیادی معاشی مسائل

سب سے پہلے یہ جاننا ضروری ہے کہ معاشیات کیا ہوتی ہے؟ اور اس کے بنیادی مسائل کیا ہوتے ہیں؟ آج جس کو ہم ''معاشیات'' کہتے ہیں وہ درحقیقت انگریزی کے لفظ ''اکنامکس'' (Economics) کا ترجمہ ہے، اور دراصل ''اکنامکس'' کا صحیح ترجمہ ''معاشیات'' نہیں ہے، بلکہ اس کا صحیح ترجمہ وہ ہے جو عربی کے لفظ ''اقتصاد'' سے کیا جاتا ہے اور اسی لفظ سے یہ بات نکل رہی ہے کہ یہ مفروضہ تمام معاشی افکار میں تسلیم کیا گیا ہے کہ ''انسانی ضروریات اور خواہشات انسانی وسائل کے مقابلہ میں زیادہ ہیں'' اور ''ضرورت'' کا لفظ جب موجودہ معاشیات میں استعمال ہوتا ہے تو اس میں خواہشات بھی داخل ہوتی ہیں۔ غرض انسانی وسائل محدود ہیں اور اس کے مقابلہ میں انسانی خواہشات اور ضروریات بہت زیادہ ہیں۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان لامحدود ضروریات اور خواہشات کو محدود وسائل سے کس طرح پورا کیا جائے؟

''اقتصاد'' اور ''اکنامکس'' کے یہی معنی ہیں کہ ان وسائل کو اس طریقے سے استعمال کیا جائے کہ ان کے ذریعے زیادہ سے زیادہ ضرورتیں پوری ہوسکیں۔ اس وجہ سے اس علم کو ''اکنامکس'' اور ''اقتصاد'' کہتے ہیں۔ اس نقطۂ نظر سے ہر معیشت میں کچھ بنیادی مسائل ہوتے ہیں جن کو حل کیے بغیر وہ معیشت نہیں چل سکتی، عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ وہ بنیادی مسائل چار ہوتے ہیں۔

ا۔ترجیحات کا تعین (Determination of Priorities)

پہلا مسئلہ جس کو معیشت کی اصطلاح میں ''ترجیحات کا تعین'' کہا جاتا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ انسان کی ضروریات اور خواہشات بے شمار ہیں اور ان کے مقابلہ میں وسائل محدود ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان محدود وسائل کے ذریعہ تمام ضروریات اور خواہشات پوری نہیں ہوسکتیں لہٰذا کچھ ضروریات اور خواہشات کو مقدم کرنا پڑے گا اور کچھ کو موخر کرنا پڑے گا۔ لیکن کونسی ضرورت کو مقدم کیا جائے اور کونسی ضرورت کو موخر کیا جائے؟ مثلاً میرے پاس پچاس روپے ہیں، ان پچاس روپے سے آٹا بھی خرید سکتا ہوں، کپڑا بھی خرید سکتا ہوں، کسی ہوٹل میں بیٹھ کر ریفریشمنٹ کھانے پر بھی خرچ کرسکتا ہوں۔ یہ چار پانچ اختیارات (Options) میرے سامنے ہیں، اب میں یہ پچاس روپے ان میں سے کس کام پر خرچ کروں؟ اس کو ''ترجیحات کا تعین'' کہا جاتا ہے۔

یہ مسئلہ ایک انسان کو پیش آتا ہے، اسی طرح پورے ملک اور پوری ریاست کو بھی پیش آتا ہے

مثلاً پاکستان کے کچھ قدرتی وسائل ہیں۔ کچھ انسانی وسائل ہیں، کچھ معدنی وسائل ہیں، کچھ نقد وسائل ہیں، یہ سارے وسائل محدود ہیں اور اس کے مقابلے میں ضروریات اور خواہشات لامتناہی ہیں۔ (۱) اب یہ متعین کرنا پڑے گا کہ ان وسائل کو کس کام میں صرف کیا جائے؟ اور کس چیز کی پیداوار کو ترجیح دی جائے؟ اس مسئلہ کا نام ''ترجیحات کا تعین'' ہے۔

۲۔ وسائل کی تخصیص (Allocation of Resources)

دوسرا مسئلہ ہے ''وسائل کی تخصیص''، ہمارے پاس وسائل پیداوار ہیں یعنی سرمایہ، محنت، زمین، ان کو ہم کن کاموں میں کس مقدار میں لگائیں؟ مثلاً ہماری زمینیں ہیں، اب کتنی زمین پر ہم گندم کاشت کریں؟ کتنی زمین پر چاول کاشت کریں؟ اور کتنی زمین پر روئی کی کاشت کریں؟ یا اسی طرح ہمارے پاس کارخانے لگانے کی صلاحیت ہے جس سے ہم کپڑا بھی بنا سکتے ہیں، جوتے بھی بنا سکتے ہیں، اور کھانے پینے کی اشیاء بھی بنا سکتے ہیں، اب کتنے کارخانوں کو کپڑا بنانے میں استعمال کریں؟ اور کتنے کارخانوں کو جوتے بنانے میں لگائیں اور کتنے کارخانوں کو کھانے پینے کی اشیاء میں استعمال کریں؟ اس سوال کے تعین کو معیشت کی اصطلاح میں ''وسائل کی تخصیص'' کہا جاتا ہے۔

۳۔ آمدنی کی تقسیم (Distribution of Income)

تیسرا مسئلہ ہے ''آمدنی یا پیداوار کی تقسیم''، یعنی مندرجہ بالا وسائل کو کام میں لگانے کے بعد اس کے نتیجے میں جو پیداوار یا آمدنی حاصل ہوئی اس کو کس طرح معاشرے میں تقسیم کیا جائے؟ اس کو کس بنیاد پر تقسیم کیا جائے؟ اس کو معاشیات کی اصطلاح میں ''آمدنی کی تقسیم'' کہا جاتا ہے۔

۴۔ ترقی (Development)

چوتھا مسئلہ ہے ''ترقی'' یعنی اپنی معاشی حاصلات کو کس طرح ترقی دی جائے؟ تا کہ جو پیداوار حاصل ہو رہی ہے وہ معیار کے لحاظ سے پہلے سے زیادہ اچھی ہو، اور مقدار کے اعتبار سے اس

(۱) ہمارے ملک کی ضرورت یہ بھی ہے کہ اس کی سڑکیں اچھی بنیں، اس کے ہسپتال اچھے تعمیر ہوں، اس کی تعلیم گاہیں اچھی ہوں، اس کا دفاع مضبوط ہو، یہ بے شمار ضروریات ہیں، لیکن ان ضروریات اور خواہشات کو پورا کرنے کے لیے جو وسائل ہیں وہ کم اور محدود ہیں لہٰذا اس کے بغیر چارہ نہیں کہ انسان کچھ ضروریات اور خواہشات کو مقدم رکھے اور کچھ کو موخر رکھے۔ ۱۲ انعام الباری

میں اضافہ ہو، اور کس طرح نئی نئی ایجادات اور مصنوعات وجود میں لائی جائیں تاکہ معاشرہ ترقی کرے اور لوگوں کے پاس اسبابِ معیشت میں اضافہ ہو اور لوگوں کو آمدنی کے ذرائع مہیا ہوں۔ اس مسئلہ کو معاشیات کی اصطلاح میں ''ترقی'' کہا جاتا ہے

یہ چار بنیادی مسائل ہیں جنہیں حل کرنا ہر معاشی نظام کے لیے ضروری ہے، یعنی ترجیحات کا تعین، وسائل کی تخصیص، آمدنی کی تقسیم، اور ترقی۔ پہلے یہ سمجھ لینا چاہیے کہ یہ مسائل اگرچہ فطری مسائل ہیں، لیکن ایک نظام کے تحت ان کو سوچنے، ان کا حل تلاش کرنے کی فکر آخری صدیوں میں زیادہ پیدا ہوئی اور اس کے نتیجے میں دو متقابل نظریات ہمارے سامنے آئے ایک سرمایہ دارانہ نظام (Capitalism) اور دوسرا اشتراکی نظام (Socialism)۔

❁❁❁

سرمایہ دارانہ نظام

(Capitalism)

سرمایہ دارانہ نظام
(Capitalism)

سب سے پہلے سرمایہ دارانہ نظام کے بارے میں سمجھئے کہ اس نے ان چار مسائل کو کن بنیادوں پر حل کرنے کا دعویٰ کیا ہے؟ اور ان کو حل کرنے کے لیے کیا فلسفہ پیش کیا ہے؟

سرمایہ دارانہ نظام کا کہنا یہ ہے کہ ان چاروں مسائل کو حل کرنے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ ہر انسان کو تجارتی اور صنعتی سرگرمیوں کے لیے بالکل آزاد چھوڑ دیا جائے، اور اسے یہ چھوٹ دی جائے کہ وہ زیادہ سے زیادہ نفع کمانے کے لیے جو طریقہ مناسب سمجھے اختیار کرے۔ اس سے معیشت کے مذکورہ بالا چاروں مسائل آپ ہی آپ حل ہوتے چلے جائیں گے۔ کیونکہ جب ہر شخص کی فکر یہ ہوگی کہ میں زیادہ سے زیادہ نفع کماؤں تو ہر شخص معاشیات کے میدان میں وہی کام کرے گا جس کی معاشرے کو ضرورت ہے۔ اور اس کے نتیجے میں چاروں مسائل خود بخود ایک خاص توازن کے ساتھ طے ہوتے چلے جائیں گے۔ اب سوال یہ ہے کہ چاروں مسائل خود بخود کس طرح حل ہوں گے؟ اس سوال کے جواب کے لیے تھوڑی سی تفصیل کی ضرورت ہے۔

قانون قدرت

۱۔ درحقیقت اس کائنات میں بہت سے قدرتی قوانین کارفرما ہیں، جو ہمیشہ ایک جیسے نتائج پیدا کرتے ہیں، انہی میں سے ایک قانون رسد (Supply) اور طلب (Demand) کا بھی ہے۔ رسد کسی بھی سامانِ تجارت کی اس مجموعی مقدار سے عبارت ہے جو بازار میں فروخت کے لیے لائی گئی ہو اور طلب خریداروں کی اس خواہش کا نام ہے کہ وہ یہ سامانِ تجارت قیمتاً بازار سے خریدیں۔ اب رسد اور طلب کا قدرتی توازن یہ ہے کہ بازار میں جس چیز کی طلب اس کی رسد کے مقابلے میں زیادہ ہو، اس کی قیمت گھٹ جاتی ہے اور جس چیز کی طلب اس کی رسد کے مقابلے میں بڑھ جائے تو اس کی قیمت بڑھ جاتی ہے۔ مثلاً جب گرمی کے موسم میں گرمی زیادہ پڑنے لگے تو بازار میں برف کے خریدار زیادہ ہو جاتے ہیں۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ برف کی طلب بڑھ گئی۔ اب اگر برف کی مجموعی پیداوار یا بازار میں پائی جانے والی برف کی مجموعی مقدار اس طلب کے مقابلے میں کم ہو تو یقیناً برف کی قیمت بڑھ جائیگی۔ الا یہ کہ اس وقت برف کی پیداوار میں اتنا ہی اضافہ ہو جائے جتنا طلب میں اضافہ ہوا ہے تو پھر قیمت نہیں بڑھے گی۔ دوسری طرف سردی کے موسم میں برف کے خریدار کم ہو جاتے ہیں۔

جس کا مطلب یہ ہے کہ برف کی طلب گھٹ گئی۔ اب اگر بازار میں برف کی مجموعی مقدار اس طلب کے مقابلہ میں زیادہ ہو تو یقیناً برف کی قیمت میں کمی آجائے گی۔ یہ ایک قدرتی قانون ہے۔ جس کو قانونِ رسد وطلب (Law of Demand and Supply) کہا جاتا ہے۔

۲۔ سرمایہ دارانہ نظام کا فلسفہ یہ کہتا ہے کہ رسد وطلب کا یہ قدرتی قانون ہی درحقیقت زراعت پیشہ افراد کے لیے اس بات کا تعین کرتا ہے کہ وہ اپنی زمینوں میں کیا چیز اُگائیں۔ اور یہی قانون صنعت کاروں اور تاجروں کے لیے اس بات کا تعین کرتا ہے کہ وہ کیا چیز کتنی مقدار میں بازار میں لائیں۔ اور اس طرح معیشت کے چاروں مذکورہ بالا مسائل خود بخود طے ہو جاتے ہیں۔

۳۔ طلب ورسد کے قانون سے ترجیحات کا تعین اس طرح ہوتا ہے کہ جب ہم نے ہر شخص کو زیادہ سے زیادہ منافع کمانے کے لیے آزاد چھوڑ دیا تو ہر شخص اپنے منافع کی خاطر وہی چیز بازار میں لانے کی کوشش کرے گا جس کی ضرورت یا طلب زیادہ ہوگی تاکہ اسے اس کی زیادہ سے زیادہ قیمت مل سکے۔ زراعت پیشہ افراد وہی چیز اگانے کو ترجیح دیں گے جن کی بازار میں طلب زیادہ ہے اور صنعت کار وہی چیز تیار کریں گے جس کی بازار میں مانگ زیادہ ہے کیونکہ اگر یہ لوگ ایسی چیزیں بازار میں لائیں جن کی طلب کم ہے تو انہیں زیادہ منافع نہیں مل سکے گا۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہر شخص اگرچہ اپنے منافع کے لیے کام کر رہا ہے، لیکن رسد وطلب کی قدرتی طاقتیں اسے مجبور کر رہی ہیں کہ وہ معاشرے کی طلب اور ضرورت کو پورا کرے یہاں تک کہ جب کسی چیز کی پیداوار بازار میں اتنی آجائے کہ وہ اس کی طلب کے برابر ہو جائے تو اب اسی چیز کا مزید پیدا کرنا چونکہ تاجر اور صنعتکار کے لیے نفع بخش نہیں ہوگا، اس لیے اب وہ اس کی پیداوار بند کر دے گا۔ اس طرح معاشرے میں صرف وہی چیزیں پیدا ہوں گی جن کی معاشرے کو ضرورت ہے۔ اور اتنی ہی مقدار میں پیدا ہوں گی جتنی اس مقدار کو پورا کرنے کے لیے واقعتاً درکار ہے۔ اور اسی کا نام ترجیحات کا تعین ہے۔

۴۔ وسائل کی تخصیص (Allocation of Resources)

اس کا تعلق بھی درحقیقت ترجیحات کے تعین سے ہی ہے، جب، کوئی شخص ترجیحات کا باقاعدہ تعین کر لیتا ہے تو اسی حساب سے موجودہ وسائل کو مختلف کاموں میں لگاتا ہے۔ لہٰذا رسد وطلب کے قوانین جس طرح ترجیحات کا تعین کرتے ہیں، اسی طرح وسائل کی تخصیص کا کام بھی ساتھ ساتھ انجام دیتے ہیں جس کے نتیجے میں ہر شخص اپنے وسائل یعنی زمین، سرمایہ اور محنت کو ایسے کام میں لگاتا ہے تاکہ وہ ایسی چیزیں بازار میں لا سکے جن کی بازار میں طلب زیادہ ہے تاکہ اس کا منافع زیادہ حاصل

ہو۔لہٰذا رسد وطلب کے قوانین کے ذریعہ وسائل کی تخصیص کا مسئلہ بھی خود بخود حل ہو جاتا ہے۔

۵۔ تیسرا مسئلہ آمدنی کی تقسیم کا ہے۔بعض عملِ پیدائش کے نتیجے میں جو پیداوار یا آمدنی حاصل ہوئی اسے معاشرے میں کس بنیاد پر تقسیم کیا جائے؟ سرمایہ دارانہ نظام کا کہنا یہ ہے کہ جو کچھ آمدنی حاصل ہو وہ انہی عوامل کے درمیان تقسیم ہونی چاہیے جنہوں نے پیدائش کے عمل میں حصہ لیا۔سرمایہ دارانہ فلسفہ کے مطابق یہ عوامل کل چار ہیں: (۱) زمین (۲) محنت (۳) سرمایہ (۴) آجر یا تنظیم۔(۱)

آجر یا تنظیم سے مراد وہ شخص ہے جو ابتداءً کسی عملِ پیدائش کا ارادہ کرکے اس کام کے لیے تین عوامل کو اکٹھا کرتا ہے اور نفع نقصان کا خطرہ مول لیتا ہے۔سرمایہ دارانہ نظام کا کہنا یہ ہے کہ عملِ پیدائش کے نتیجے میں جو کچھ آمدنی ہو وہ اس طرح تقسیم ہونی چاہیے کہ زمین مہیا کرنے والے کو کرایہ دیا جائے، محنت کرنے والے کو اجرت دی جائے، سرمایہ فراہم کرنے والے کو سود دیا جائے۔اور وہ آجر جو اس عملِ پیدائش کا اصل محرک تھا، اسے نفع دیا جائے۔یعنی زمین کا کرایہ، محنت کی اجرت اور سرمایہ کا سود ادا کرنے کے بعد جو کچھ بچے وہ آجر کا منافع ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ یہ تعین کس طرح کیا جائے کہ زمین کو کتنا کرایہ دیا جائے گا؟ محنت کو کتنی اجرت دی جائے گی؟ اور سرمایہ کو کتنا سود دیا جائے گا؟ اس سوال کے جواب میں سرمایہ دارانہ فلسفہ پھر اس قانونِ رسد وطلب کو پیش کرتا ہے، یعنی یہ کہتا ہے کہ ان تینوں عوامل کے معاوضے کا تعین ان کی رسد وطلب کی بنیاد پر ہوتا ہے۔ان عوامل میں سے جس عامل کی طلب زیادہ ہوگی اس کا معاوضہ بھی اتنا ہی زیادہ ہوگا۔

فرض کریں کہ زید ایک کپڑے کا کارخانہ لگانا چاہتا ہے کیونکہ وہ اس صنعت کے قائم کرنے کا محرک ہے اور وہی نفع ونقصان کا خطرہ مول لے کر عواملِ پیداوار کو اکٹھا کرنے کا ذمہ دار ہے اس لیے معاشی اصطلاح میں اس کو آجر (Entrepreneur) کہا جاتا ہے۔اب اسے کارخانہ لگانے کے لیے پہلے تو زمین کی ضرورت ہے۔اگر زمین اس کے پاس نہیں ہے تو پہلے اسے زمین کرایہ پر لینی پڑے گی اب اس کرایہ کا تعین زمین کی رسد وطلب کی بنیاد پر ہوگا۔یعنی اگر زمین کرایہ پر دینے والے

---

(۱) آجر یا تنظیم چوتھی چیز جس کا اُردو میں ترجمہ بڑا مشکل ہے بعض اس کو آجر کہتے ہیں اور بعض تنظیم کہتے ہیں۔ایسا آدمی جو ان تینوں عوامل کو اکٹھا کر کے ان کی تنظیم کرے اور ان سے کام لے اس کو انگریزی میں (Entrepreneur) کہتے ہیں۔یہ اصل میں فرانسیسی لفظ ہے اس کا اُردو میں صحیح ترجمہ ''مہم جو'' ہے یعنی جو یہ بیڑا اُٹھائے کہ مجھے یہ کام کرنا ہے اور اس میں اپنے مستقبل کو داؤ پر لگائے کہ میں یہ کام کروں گا۔

بہت سے ہیں یعنی زمین کی رسد زیادہ ہے اور لینے والے اس کے مقابلہ میں کم ہیں یعنی طلب کم ہے تو زمین کا کرایہ سستا ہوگا اور اگر اس کے برعکس صورت ہو تو زمین کا کرایہ مہنگا ہوگا۔ اس طرح رسد وطلب کے قوانین کرایہ کا تعین کریں گے۔

پھر اسے کارخانے میں کام کرنے کے لیے مزدور درکار ہوں گے، جن کو معاشی اصطلاح میں محنت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ انہیں اجرت دینی پڑے گی۔ اس اجرت کا تعین بھی رسد وطلب پر ہوگا۔ یعنی اگر بہت سے مزدور کام کرنے کے لیے تیار ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ مزدوروں کی رسد زیادہ ہے۔ لہٰذا اس کی اجرت کم ہوگی لیکن اگر اس کارخانے میں کام کرنے کے لیے زیادہ مزدور مہیا نہیں ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کی رسد کم ہے۔ لہٰذا انہیں زیادہ اجرت دینی پڑے گی۔ اس طرح اجرت باہمی گفت وشنید کے نتیجے میں اس مقام پر متعین ہوگی، جس پر رسد وطلب دونوں کا اتفاق ہو جائے۔

اسی طرح کارخانے لگانے والے کو مشینری اور خام مال وغیرہ خریدنے کے لیے سرمایہ کی ضرورت ہوگی جس پر سرمایہ دارانہ نظام میں اسے سود دینا پڑے گا۔ اس سود کی مقدار بھی رسد وطلب کی بنیاد پر طے ہوگی۔ اگر قرض دینے والے بہت سے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ سرمایہ کی رسد زیادہ ہے لہٰذا کم شرح سود پر کام چل جائے گا لیکن اگر سرمایہ کو قرض دینے والے کم ہیں تو زیادہ شرح سود ادا کرنا پڑے گی۔ اس طرح شرح سود کا تعین بھی رسد وطلب کی بنیاد پر ہوگا اور جب رسد وطلب کی مذکورہ بنیادوں پر کرایہ، اجرت اور سود کا تعین ہوگیا تو کارخانے کی پیداوار کے نتیجے میں جو آمدنی ہوگی، اس کا باقی ماندہ حصہ آجر کو نفع کے طور پر ملے گا۔ (۱)

اس طرح آپ نے دیکھا کہ آمدنی کی تقسیم کا بنیادی مسئلہ بھی سرمایہ دارانہ نظام میں رسد وطلب کے قوانین کے تحت انجام پاتا ہے۔

۴۔ چوتھا معاشی مسئلہ ترقی کا ہے یعنی ہر معیشت کو اس بات کی ضرورت ہوتی ہے کہ وہ اپنی پیداوار کو ترقی دے اور اپنی پیداوار میں کمّا اور کیفًا اضافہ کرے۔ سرمایہ دارانہ نظام کے فلسفے کے مطابق یہ مسئلہ بھی اسی بنیاد پر حل ہوتا ہے کہ ہر شخص کو جب زیادہ نفع کمانے کے لیے آزاد چھوڑا جائے گا تو

(۱) سوال: مہم جو یعنی آجر یا تنظیم کا منافع تو رسد وطلب سے متعین نہیں ہوا؟
جواب: وہ اس طرح سے متعین ہوا کہ جب طلب و رسد سے اجرت بھی متعین ہوئی، سود بھی متعین ہوا، کرایہ بھی متعین ہوا اور جو چیز باقی بچے اس کا نام منافع ہے اور باقی بچنے والی مقدار کتنی ہے؟ وہ موقوف ہے ان تینوں چیزوں کے تعین پر اور تینوں چیزیں رسد وطلب سے متعین ہوتی ہیں لہٰذا وہ بھی بالواسطہ رسد وطلب سے متعین ہو رہا ہے۔

رسد وطلب کے قدرتی قوانین اسے خود بخود اس بات پر آمادہ کریں گے کہ وہ نئی سے نئی چیزیں اور بہتر سے بہتر کوالٹی بازار میں لائے، تاکہ اس کی مصنوعات کی طلب زیادہ ہو اور اسے زیادہ نفع حاصل ہو۔

سرمایہ دارانہ نظام کے اصول

سرمایہ دارانہ نظام کے بنیادی اصول تین ہیں۔

۱۔ ذاتی ملکیت (Private Property)

پہلا اصول یہ ہے کہ اس نظام میں ہر انسان کو اس بات کا حق حاصل ہے کہ وہ اپنی ذاتی ملکیت میں اشیاء بھی رکھ سکتا ہے۔

اشتراکی نظام میں اگرچہ ذاتی استعمال کی اشیاء تو ذاتی ملکیت میں آسکتی ہیں لیکن وسائل پیداوار مثلاً زمین یا کارخانہ، عموماً ذاتی ملکیت میں نہیں ہوتے، البتہ سرمایہ دارانہ میں ہر قسم کی چیز چاہے وہ استعمالی اشیاء سے تعلق رکھتی ہو یا اشیائے پیداوار میں سے ہو وہ ذاتی ملکیت میں آسکتی ہے۔

۲۔ ذاتی منافع کا محرک (Profit Motive)

دوسرا اصول یہ ہے کہ پیداوار کے عمل میں جو محرک کارفرما ہوتا ہے وہ ہر انسان کے ذاتی منافع کے حصول کا محرک ہوتا ہے۔

۳۔ حکومت کی عدم مداخلت (Laissez Faire)

سرمایہ دارانہ نظام کا تیسرا اصول یہ ہے کہ حکومت کو تاجروں کی تجارتی سرگرمیوں میں مداخلت نہیں کرنی چاہیے، وہ جس طرح کام کر رہے ہیں ان کی معاشی سرگرمی میں رکاوٹ نہ ڈالنی چاہیے، نہ ان پر حکومت کی طرف سے زیادہ پابندیاں عائد کرنی چاہیے۔ عام طور پر اس اصول کے لیے (Laissez Faire) کی اصطلاح استعمال ہوتی ہے۔ اصل میں یہ فرانسیسی لفظ ہے یعنی "حکومت کی عدم مداخلت کی پالیسی" اور اس کے معنی ہیں "کرنے دو" یعنی حکومت سے کہا جا رہا ہے کہ جو لوگ اپنی معاشی سرگرمیوں میں مصروف ہیں وہ جس طرح بھی کام کر رہے ہیں ان کو کرنے دو اس میں کوئی رکاوٹ نہ ڈالو۔ اور حکومت کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ لوگوں سے کہے کہ فلاں کام کرو، فلاں کام نہ کرو، اور نہ یہ حق حاصل ہے کہ یہ کہے کہ اس طرح تجارت کرو اور اس طرح نہ کرو۔ یہ سرمایہ دارانہ نظام کا

تیسرا اصول ہے اور سرمایہ دارانہ نظام کا اصل بنیادی فلسفہ یہی ہے۔

اگرچہ بعد میں خود سرمایہ دارانہ ممالک میں رفتہ رفتہ اس پالیسی کو محدود کر دیا گیا اور عملاً ایسا نہیں ہوا کہ حکومت بالکل مداخلت نہ کرے۔ بلکہ حکومت کی طرف سے بہت سی پابندیاں سرمایہ دارانہ ممالک میں نظر آئیں گی، مثلاً کبھی ٹیکسوں کے ذریعہ بہت سی پابندیاں عائد کر دی جاتی ہیں یا کسی کام کی ہمت افزائی کے لیے حکومت بہت سے اقدامات کرتی ہے۔ آج پوری دنیا میں کوئی ایسا ملک موجود نہیں ہے جس میں تجارت کے اندر حکومت کی بالکل مداخلت موجود نہ ہو۔ لیکن سرمایہ دارانہ معیشت کا بنیادی فلسفہ یہی تھا کہ حکومت مداخلت نہ کرے، بلکہ تاجروں کو کھلی چھٹی دیدے، چنانچہ اسی بنیاد پر یہ کہا جاتا رہا ہے کہ ''سب سے اچھی حکومت وہ ہے جو کم حکومت کرے'' یعنی مداخلت نہ کرے۔

چونکہ سرمایہ دارانہ معیشت میں ذاتی منافع کا محرک کارفرما ہوتا ہے اس لیے اس کو ''سرمایہ دارانہ نظام'' کہتے ہیں اور اس کا دوسرا نام ہے ''مارکیٹ اکانومی'' (Market Economy) یعنی بازار پر مبنی معیشت، اس لیے کہ اس میں مارکیٹ کی قوتوں (Market Forces) یعنی رسد اور طلب سے کام لیا جاتا ہے۔

❀❀❀

اشتراکیت

(Socialism)

اشتراکیت

(Socialism)

اشتراکیت درحقیقت سرمایہ دارانہ نظام کے ردعمل کے طور پر وجود میں آئی۔ سرمایہ دارانہ فلسفے کا پورا زور چونکہ اس بات پر تھا کہ زیادہ سے زیادہ منافع کمانے کے لیے ہر شخص آزاد ہے۔ اور معیشت کا ہر مسئلہ بنیادی طور پر رسد وطلب کی بنیاد پر طے ہوتا ہے۔ اس لیے اس فلسفے میں فلاحِ عامہ اور غریبوں کی بہبود وغیرہ کا کوئی واضح اہتمام نہیں تھا۔ اور زیادہ منافع کمانے کی دوڑ میں کمزور افراد کے پسنے کے واقعات بکثرت پیش آئے۔ جس کے نتیجہ میں غریب اور امیر کے درمیان فاصلے بہت بڑھ گئے۔ اس لیے اشتراکیت ان خرابیوں کے سدباب کا دعویٰ لے کر میدان میں آئی اور اس نے سرمایہ دارانہ نظام کے بنیادی فلسفے کو چیلنج کرتے ہوئے یہ ماننے سے انکار کیا کہ معیشت کے مذکورہ بالا چار بنیادی مسائل محض ذاتی منافع کے محرک، شخصی ملکیت اور بازار کی قوتوں کی بنیاد پر حل کیے جاسکتے ہیں۔

اشتراکیت نے کہا کہ سرمایہ دارانہ نظام میں معیشت کے تمام بنیادی مسائل کو رسد وطلب کی اندھی بہری طاقتوں کے حوالے کر دیا گیا ہے جو خالصتاً ذاتی منافع کے محرک کے طور پر کام کرتی ہیں اور ان کو فلاحِ عامہ کے مسائل کا ادراک نہیں ہوتا۔ خاص طور سے آمدنی کی تقسیم میں یہ قوتیں غیر منصفانہ نتائج پیدا کرتی ہیں۔ جس کی ایک سادہ سی مثال یہ ہے کہ اگر مزدوروں کی رسد زیادہ ہو تو ان کی اجرت کم ہو جاتی ہے اور بسا اوقات مزدور اس بات پر مجبور ہوتے ہیں کہ وہ انتہائی کم اجرت پر کام کریں اور جو پیداوار ان کے گاڑھے پسینے کی محنت سے تیار ہو رہی ہے اس میں سے انہیں اتنا بھی حصہ نہ مل سکے جس کے ذریعے وہ اپنے اور اپنے بچوں کے لیے صحت مند زندگی کا انتظام کر سکیں۔ چونکہ ان کی محنت کی طلب رکھنے والے سرمایہ دار کو اس سے غرض نہیں کہ جس اجرت پر وہ ان سے کام لے رہا ہے وہ واقعتاً ان کی محنت کا مناسب صلہ اور ان کی ضروریات کا واقعی کفیل ہے یا نہیں؟ اسے تو صرف اس بات سے غرض ہے کہ رسد کی زیادتی کی وجہ سے وہ اپنی طلب کی تسکین نہایت کم اجرت پر کر سکتا ہے، جس سے اس کے منافع میں اضافہ ہو۔ لہٰذا اشتراکیت کے نظریہ کے مطابق آمدنی کی تقسیم کے لیے رسد وطلب کا فارمولا ایک ایسا بے حس فارمولا ہے جس میں غریبوں کی ضروریات کی رعایت نہیں، بلکہ وہ سرمایہ دار کے ذاتی منافع کے محرک کا تابع ہے اور اسی مدار پر گردش کرتا ہے۔ اسی طرح ترجیحات کے تعین، وسائل کی تخصیص اور ترقی جیسے اہم معاشی مسائل بھی اشتراکیت کے نزدیک رسد وطلب کی

اندھی بہری قوتوں کے حوالے کرنا معاشرے کے لیے نہایت خطرناک ہے۔ ایک نظریاتی فلسفے کے طور پر تو یہ بات درست ہوسکتی ہے کہ ذاتی منافع کے محرک کے تحت ایک زراعت پیشہ شخص، یا ایک صنعت کار اس وقت تک اپنی پیداوار جاری رکھے گا جب تک اس کی رسد طلب کے برابر نہ ہو جائے اور جب رسد طلب سے بڑھ جائے گی تو وہ پیداوار بند کر دے گا، لیکن عملی دنیا میں دیکھا جائے تو کسی تاجر یا زراعت پیشہ کے پاس کوئی نپا تلا پیمانہ نہیں ہوتا جس کی مدد سے وہ بروقت یہ جان سکے کہ اب فلاں پیداوار کی رسد طلب کے برابر ہوگئی ہے لہٰذا وہ بسا اوقات یہ سوچ کر رسد میں اضافہ کرتا جاتا ہے کہ ابھی اس چیز کی رسد ضرورت اور طلب کے مقابلے میں کم ہے۔ حالانکہ بازار میں حقیقی رسد زیادہ ہو چکی ہوتی ہے اور اسے اس حقیقت کا پتہ کافی دیر میں چلتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ بازار میں بسا اوقات ایسی چیزوں کی فراوانی ہو جاتی ہے، جن کی طلب اتنی زیادہ نہیں ہے اور اس طرح معیشت کساد بازاری کا شکار ہوتی ہے، تاجر دیوالیہ ہو جاتے ہیں اور طرح طرح کی معاشی خرابیاں پیدا ہوتی ہیں۔ لہٰذا محض رسد و طلب کی بنیاد پر ترجیحات کا تعین اتنے توازن کے ساتھ نہیں ہوسکتا جس کی معاشرے کو واقعی ضرورت ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ پھر مذکورہ بالا چاروں مسائل کو حل کرنے کا کیا طریقہ ہونا چاہیے؟ اس کے جواب میں اشتراکیت نے یہ فلسفہ پیش کیا کہ بنیادی خرابی یہاں سے پیدا ہوتی ہے کہ وسائلِ پیداوار یعنی زمینوں اور کارخانوں کو لوگوں کی انفرادی ملکیت قرار دے دیا گیا۔ ہونا یہ چاہیے کہ تمام وسائلِ پیداوار افراد کی شخصی ملکیت میں ہونے کی بجائے ریاست کی اجتماعی ملکیت میں ہوں اور جب یہ سارے وسائل ریاست کی ملکیت میں ہوں گے تو حکومت کو پتہ ہوگا کہ اس کے پاس کل وسائل کتنے ہیں؟ اور معاشرے کی ضرورت کیا کیا ہے؟ اس بنیاد پر حکومت ایک منصوبہ بندی کرے گی کہ معاشرے کی کن ضروریات کو مقدم رکھا جائے؟ کونسی چیز کس مقدار میں پیدا کی جائے؟ اور مختلف وسائل کو ترتیب کے ساتھ کن کن کاموں میں لگایا جائے۔ گویا ترجیحات کا تعین، وسائل کی تخصیصات اور ترقی کے تینوں کام حکومت کی منصوبہ بندی کے تحت انجام پائیں۔ رہا آمدنی کی تقسیم کا سوال! سو اشتراکیت نے یہ دعویٰ کیا کہ حقیقتاً عاملِ پیداوار صرف دو چیزیں ہیں۔ زمین اور محنت۔ زمین چونکہ انفرادی ملکیت نہیں بلکہ اجتماعی ملکیت میں ہے لہٰذا اس پر لگا بندھا کرایہ یا لگان دینے کی ضرورت نہیں۔ اب صرف محنت رہ جاتی ہے۔ اس کی اجرت کا تعین بھی حکومت اپنی منصوبہ بندی کے تحت یہ بات مدنظر رکھتے ہوئے کرے گی کہ مزدوروں کو ان کی محنت کا مناسب صلہ ملے۔

جس طرح سرمایہ دارانہ نظام نے مذکورہ چاروں بنیادی مسائل کو صرف ذاتی منافع کے محرک

اور بازار کی قوتوں کی بنیادوں پر حل کرنا چاہا تھا۔ اسی طرح اشتراکیت نے ان چاروں مسائل کے حل کے لیے ایک ہی بنیادی حل تجویز کیا۔ یعنی منصوبہ بندی۔ اسی لیے اشتراکی معیشت کو منصوبہ بند معیشت (Planned Economy) کہا جاتا ہے۔ جس کا عربی ترجمہ ''اقتصاد موجہ'' یا ''اقتصاد مخطط'' کیا گیا ہے۔

اشتراکیت کے بنیادی اصول

اشتراکیت کے مذکورہ بالا فلسفے کے نتیجے میں اشتراکی معیشت میں مندرجہ ذیل بنیادی اصول کارفرما ہوتے ہیں۔

۱۔ اجتماعی ملکیت (Collective Property)

اس اصول کا مطلب یہ ہے کہ وسائلِ پیداوار یعنی زمینیں اور کارخانے وغیرہ کسی شخص کی ذاتی ملکیت میں نہیں ہوں گے بلکہ وہ قومی ملکیت میں ہوں گے اور حکومت کے زیر انتظام چلائے جائیں گے ذاتی استعمال کی اشیاء ذاتی ملکیت میں ہو سکتی ہیں لیکن وسائلِ پیداوار میں کوئی ذاتی ملکیت نہیں ہو سکتی۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ٹھیٹ اشتراکی ممالک میں نہ صرف زمینیں اور کارخانے، بلکہ تجارتی دکانیں بھی کسی فرد کی ذاتی ملکیت میں نہیں ہوتیں۔ ان میں کام کرنے والے افراد سب حکومت کے ملازم ہوتے ہیں اور حاصل ہونے والی آمدنی تمام تر سرکاری خزانے میں جاتی ہے اور کام کرنے والے ملازمین کو تنخواہ یا اجرت حکومت کی منصوبہ بندی کے تحت دی جاتی ہے۔

۲۔ منصوبہ بندی (Planning)

اشتراکی نظام کا دوسرا بنیادی اصول منصوبہ بندی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ تمام بنیادی معاشی فیصلے حکومت منصوبہ بندی کے تحت انجام دیتی ہے اس منصوبہ بندی میں تمام معاشی ضروریات اور تمام معاشی وسائل کے اعداد و شمار جمع کیے جاتے ہیں اور یہ فیصلہ کیا جاتا ہے کہ کون سے وسائل کس چیز کی پیداوار میں لگائے جائیں؟ اور کون سی چیز کس مقدار میں پیدا کی جائے؟ اور نیز کس شعبے میں محنت کرنے والوں کی کیا اجرت مقرر کی جائے؟

حکومت کی طرف سے معیشت کی منصوبہ بندی کا تصور اصلاً تو اشتراکیت نے پیش کیا تھا لیکن رفتہ رفتہ سرمایہ دار ملکوں نے بھی جزوی طور پر منصوبہ بندی اختیار کرنا شروع کر دی۔ جس کی وجہ یہ ہے

کہ سرمایہ دار ممالک رفتہ رفتہ اپنے اس اصول پر مکمل طور پر قائم نہ رہ سکے کہ حکومت معیشت کے کاروبار میں بالکل مداخلت نہ کرے بلکہ مختلف اجتماعی مقاصد کے تحت سرمایہ دار حکومتوں کو بھی تجارت و معیشت میں کچھ نہ کچھ مداخلت کرنی پڑی۔ یہاں تک کہ مخلوط معیشت (Mixed Economy) کے نام سے ایک نئی اصطلاح وجود میں آئی۔ جس کا بنیادی مطلب یہ ہے کہ اگرچہ بنیادی طور پر معیشت کو بازار کی قوتوں کے تحت ہی چلایا جائے لیکن ضرورت کے تحت تجارتؔ وصنعت کے بعض شعبے خود سرکاری تحویل میں بھی ہو سکتے ہیں۔ جیسے بعض سرمایہ دار ملکوں میں ریلوے، بجلی، ٹیلیفون اور فضائی سروس وغیرہ سرکاری تحویل میں ہوتی ہے اور جو تجارتیں نجی طور پر چلائی جارہی ہیں حکومت ان کو بھی کچھ قواعد وضوابط کا پابند بنادیتی ہے۔ پہلی قسم کی تجارتوں کو سرکاری شعبہ (Public Sector) اور دوسری قسم کو نجی شعبہ (Private Sector) کہا جاتا ہے۔ اب اس مخلوط معیشت میں چونکہ حکومت کی فی الجملہ مداخلت ہوتی ہے اس لیے اس کو جزوی طور پر منصوبہ بندی کرنا پڑتی ہے۔ اس جزوی منصوبہ بندی کے نتیجے میں حکومت کی طرف سے عموماً پنج سالہ منصوبے تیار کیے جاتے ہیں لیکن یہ جزوی منصوبہ بندیاں ہیں جبکہ اشتراکیت کی منصوبہ بندی، کلی منصوبہ بندی ہے۔ یعنی اس میں ہر معاشی فیصلہ اس سرکاری منصوبہ بندی کا تابع ہوتا ہے۔

۳۔ اجتماعی مفاد (Collective Interest)

اشتراکیت کا تیسرا اصول اجتماعی مفاد ہے۔ یعنی اشتراکیت کا دعویٰ یہ ہے کہ سرمایہ دارانہ معیشت میں ساری معاشی سرگرمیاں افراد کے ذاتی مفاد کے تابع ہوتی ہیں لیکن اشتراکی نظام میں منصوبہ بندی کے تحت اجتماعی مفاد کو بنیادی طور پر مدنظر رکھا جاتا ہے

۴۔ آمدنی کی منصفانہ تقسیم

(Equitable Distribution of Income)

اشتراکیت کا چوتھا اصول یہ ہے کہ پیداوار سے جو کچھ آمدنی حاصل ہو وہ افراد کے درمیان منصفانہ طور پر تقسیم ہو۔ اور غریب و امیر کے درمیان زیادہ فاصلے نہ ہوں، آمدنیوں میں توازن ہو۔ شروع میں دعویٰ یہ کیا گیا تھا کہ اشتراکیت میں آمدنی کی مساوات ہوگی۔ یعنی سب کی آمدنی برابر ہو گی۔ لیکن عملاً ایسا کبھی نہیں ہوا، لوگوں کی اجرتیں اور تنخواہیں کم زیادہ ہوتی رہیں۔ البتہ اشتراکیت میں یہ دعویٰ ضرور کیا گیا تھا کہ اس نظام میں تنخواہوں اور اجرتوں کے درمیان تفاوت بہت زیادہ نہیں ہے۔

دونوں نظاموں پر تبصرہ

دونوں نظاموں پر تبصرہ

اشتراکیت اور سرمایہ داری کے درمیان ایک صدی سے زیادہ مدت سے شدید معرکہ آرائی رہی، فکری سطح پر دونوں کے درمیان بحث و مناظرہ کا بازار بھی گرم رہا اور سیاسی سطح پر جنگ و پیکار کا بھی۔ دونوں طرف سے ایک دوسرے پر جو تنقیدیں ہوتی رہی ہیں اور اس موضوع پر جتنی کتابیں لکھی گئی ہیں اگر ان سب کو جمع کیا جائے تو ایک پورا کتب خانہ بھر سکتا ہے۔ یہاں ان تنقیدوں کو پیش کرنا تو ممکن نہیں لیکن اختصار کے ساتھ دونوں نظاموں پر تبصرہ کیا جا سکتا ہے۔ جو میں یہاں مختصراً پیش کرنا چاہتا ہوں۔

اشتراکی نظام پر تبصرہ

پہلے اشتراکیت پر تبصرہ کرنا اس لحاظ سے مناسب ہے کہ اس کی خرابیوں کو سمجھنا نسبتاً آسان ہے۔ اشتراکیت کی اتنی بات تو واقعی درست تھی کہ سرمایہ دارانہ نظام میں ذاتی منافع کے محرک کو اتنی کھلی چھوٹ دیدی گئی کہ اس کے نتیجہ میں فلاحِ عامہ کا تصور یا تو بالکل نہیں رہا یا بہت پیچھے چلا گیا۔ لیکن اس کا حل جو اشتراکیت نے تجویز کیا وہ بذاتِ خود بہت انتہا پسندانہ تھا۔ سرمایہ دارانہ نظام نے فرد کو اتنا آزاد اور بے لگام چھوڑ دیا کہ وہ اپنے منافع کی خاطر جو چاہے کرتا پھرے، اس کے مقابلے میں اشتراکیت نے فرد کو اتنا گھونٹ دیا کہ اس کی فطری آزادی بھی سلب ہو کر رہ گئی۔ سرمایہ دارانہ نظام نے بازار کی قوتوں یعنی رسد و طلب کو تمام مسائل کا حل قرار دیا، لیکن اشتراکیت نے ان قدرتی قوانین کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور اس کی جگہ سرکار کی طرف سے کی ہوئی منصوبہ بندی کو ہر مرض کا علاج قرار دیا۔ حالانکہ انسان کی اپنی کی ہوئی منصوبہ بندی ہر جگہ کام نہیں دیتی اور بہت سے مقامات پر اس کا نتیجہ ایک مصنوعی جکڑ بندی کے علاوہ کچھ نہیں نکلتا۔

انسان کو اپنی زندگی میں بہت سے معاشرتی مسائل پیش آتے ہیں۔ ان سب مسائل کو پلاننگ کی بنیاد پر حل کرنا ممکن نہیں ہوتا۔ مثلاً ایک معاشرتی مسئلہ یہ بھی ہے کہ ہر مرد کو شادی کے لیے مناسب بیوی درکار ہے، اور بیوی کو شوہر، یہ معاشرتی مسئلہ ابتدائے آفرینش سے آج تک لوگوں کی ذاتی پسند ناپسند اور لوگوں کے ذاتی فیصلوں کی بنیاد پر طے ہوتا رہا ہے۔ ہر شخص اپنے لیے مناسب رفیقِ حیات

تلاش کرتا ہے اور جس پر دونوں کا اتفاق ہو جائے شادی عمل میں آ جاتی ہے۔ اس نظام کے نتیجے میں بیشک بعض خرابیاں سامنے آئیں۔ مثلاً یہ ذاتی فیصلہ بعض اوقات غلط بھی ہو جاتا ہے جس کے نتیجے میں ناچاقی اور نااتفاقی پیدا ہو جاتی ہے اور ایسا بھی ہوتا ہے کہ کوئی عورت یا کوئی مرد اس لیے نکاح سے محروم رہ جاتا ہے کہ اس کی طرف کسی کو کوئی کشش نہیں ہوتی، لیکن ان خرابیوں کا یہ علاج آج تک کسی نے نہیں سوچا کہ شادیوں کے نظام کو ذاتی پسند اور ناپسند کے بجائے سرکار کے حوالے کر دینا چاہیے۔ وہی منصوبہ بندی کرے کہ کتنے مرد اور کتنی عورتیں ہیں اور کونسا مرد کس عورت کے لیے زیادہ مناسب ہے۔ اگر کوئی حکومت یا ریاست اس قسم کی کوئی منصوبہ بندی کرنا چاہے تو ظاہر ہے کہ یہ ایک غیر فطری اور مصنوعی نظام ہوگا۔ جس سے کبھی خوشگوار نتائج برآمد نہیں ہو سکتے۔

اسی طرح یہ مسئلہ کہ انسان کونسا پیشہ اختیار کرے؟ پیدائش کے کس عمل میں کتنا حصہ لے؟ یا کس انداز سے اپنی خدمات معاشرے کو پیش کرے؟ درحقیقت ایک معاشرتی مسئلہ ہے۔ اس مسئلے کو اگر صرف خشک منصوبہ بندی کی بنیاد پر حل کرنے کی کوشش کی جائے گی تو اس سے مندرجہ ذیل خرابیاں لازم آئیں گی۔

۱۔ منصوبہ بندی کا کام ظاہر ہے کہ اشتراکی نظام میں حکومت انجام دیتی ہے اور حکومت فرشتوں کے کسی گروہ کا نام نہیں، جس سے کوئی غلطی یا بددیانتی سرزد نہ ہو۔ ظاہر ہے حکومت کرنے والے بھی گوشت پوست کے انسان ہوتے ہیں وہ اپنی خواہشات اور ذاتی مفادات سے بھی مغلوب ہو سکتے ہیں اور ان کی سوچ میں بھی غلطی کا امکان ہے۔ دوسری طرف جب سارے ملک کے تمام وسائلِ پیداوار انسانوں کے اس گروہ کے حوالے کر دیئے گئے تو اس سے ان کی نیت میں فتور آنے کی صورت میں اس کے نتائج پوری قوم کو بھگتنے پڑیں گے۔ اگر سرمایہ دارانہ نظام میں ایک چھوٹا سرمایہ دار محدود وسائلِ پیداوار پر ملکیت حاصل کر کے چند افراد کو ظلم کا نشانہ بنا سکتا ہے تو اشتراکی نظام میں چند برسرِ اقتدار افراد پورے ملک کے وسائل پر قابض ہو کر اس سے کہیں زیادہ ظلم کر سکتے ہیں اور اس کا نتیجہ یہ ہو سکتا ہے کہ بہت سارے چھوٹے چھوٹے سرمایہ دار ختم ہو جائیں اور ان سب کی جگہ ایک بڑا سرمایہ دار وجود میں آ جائے جو دولت کے سارے وسائل کو من مانے طریقے سے استعمال کرے۔

۲۔ اشتراکیت کا منصوبہ بند نظام ایک انتہائی طاقتور بلکہ جابر حکومت کے بغیر نہ قائم ہو سکتا ہے نہ چل سکتا ہے۔ کیونکہ افراد کو ہمہ گیر ریاست کی منصوبہ بندی کے تابع بنانے کے لیے ریاستی جبر لازم ہے۔ کیونکہ ہر شخص کو اپنی مرضی کے مطابق کام کرنے کے بجائے ریاستی منصوبہ بندی کے تحت کام کرنا پڑتا ہے اس لیے یہ منصوبہ بندی ایک زبردست قوتِ قاہرہ کے بغیر کام نہیں کر سکتی۔ چنانچہ اشتراکی نظام

میں سیاسی آزادیوں کا خاتمہ لازمی ہے اور اس طرح فرد کی آزادی بہر طور کچلی جاتی ہے۔

۳۔ چونکہ اشتراکیت میں ذاتی منافع کے محرک کا بالکل خاتمہ کر دیا جاتا ہے۔ اس لیے لوگوں کی کارکردگی پر اس کا برا اثر پڑتا ہے۔ انسان یہ سوچتا ہے کہ وہ خواہ چستی اور محنت اور اپج کے ساتھ کام کرے یا سستی اور کاہلی کے ساتھ، دونوں صورتوں میں اس کی آمدنی یکساں ہے۔ اس لیے اس میں بہتر کارکردگی کا ذاتی جذبہ برقرار نہیں رہتا۔ ذاتی منافع کا محرک علی الاطلاق بری چیز نہیں۔ بلکہ اگر وہ اپنی حد میں ہو تو انسان کی صلاحیتوں کو اجاگر کرتا ہے اور اسے نت نئی مہم جوئی پر آمادہ کرتا ہے۔ اس فطری جذبے کو حد میں رکھنے کی بیشک ضرورت ہے لیکن اس کو بالکلیہ کچل دینے سے انسان کی بہت سی صلاحیتیں ضائع ہو جاتی ہیں (۱)

یہ تمام خرابیاں محض نظریاتی نوعیت کی نہیں ہیں، بلکہ اشتراکیت کی پہلے تجربہ گاہ روس میں چوہتر سال کے تجربہ نے یہ تمام خرابیاں پوری طرح ثابت کر دی ہیں۔ ایک زمانے میں کچھ عرصہ پہلے تک اشتراکیت اور نیشنلائزیشن کا طوطی بولتا تھا اور جو شخص اس کے خلاف زبان کھولتا اسے رجعت پسند اور سرمایہ دار کا ایجنٹ کہا جاتا تھا۔ لیکن سوویت یونین کے خاتمے کے موقع پر خود روس کے صدر یلسن نے کہا کہ:

''کاش اشتراکیت (Utopian)(۲) نظریے کا تجربہ روس جیسے عظیم ملک میں

(۱) الجزائر میں ایک دوکان میں خود میرا ایک واقعہ پیش آیا کہ مجھے ایک تفسیر (التنویر والتحریر) جو علامہ طاہر بن عاشور کی ہے وہ خریدنی تھی، تو شام کے وقت پانچ بجنے کا وقت قریب تھا، میں نے اس سے کہا کہ بھئی میں یہ تفسیر خریدنا چاہتا ہوں اور تفسیر خریدنے کے معنی یہ تھے کہ وہ بارہ سو (الجزائری) دینار کی تھی، لیکن میرے پاس الجزائری دینار نہیں تھے امریکی ڈالر تھے۔ میں نے اس سے کہا کہ بھئی میں جا کر اسے کھلوا کر لاتا ہوں آپ براہ کرم اتنی دیر میرا انتظار کیجئے تو اس نے جواب دیا کہ نہیں پانچ بجے دوکان بند ہو جائے گی۔ میں نے کہا کہ مجھے صرف پانچ منٹ مہلت دیجئے۔ میں جلدی سے جا کر اس کو الجزائری دینار میں تبدیل کرا کر دوڑتا ہوا پہنچا اور پانچ بج کر ایک یا دو منٹ ہوئے تھے کہ دوکان بند ہو گئی تھی اور دوکان دار غائب۔ نتیجہ یہ کہ وہ الجزائری دینار آج تک میرے پاس پڑے ہوئے ہیں، کہیں اس کی کوئی قیمت نہیں ہے، اور کبھی الجزائر جانا ہوا تو استعمال ہوں گے ورنہ دنیا میں کوئی اس کو لینے کو تیار نہیں ہے۔ (انعام الباری)

(۲) Utopia کا ترجمہ ''لامکان'' ہے اور یہ درحقیقت ایک کتاب کا نام ہے۔ جو قدیم زمانے کے کسی لاطینی یا یونانی بادشاہ نے لکھی تھی۔ جس میں ایک خیالی ریاست کا تصور پیش کیا گیا تھا۔ جہاں تمام اشیاء انسانوں کی مشترک ملکیت ہیں۔ ہر شخص جو چیز چاہتا ہے اپنی خواہش کے مطابق قیمت دیئے بغیر حاصل کر لیتا ہے اور کسی پر کوئی پابندی نہیں ہے۔ یہ چونکہ ایک ناممکن العمل تصور تھا' اس لیے یہ لفظ ایک خیالی جنت کے معنی میں استعمال ہونے لگا' جس کے حاصل کرنے کا کوئی امکان نہ ہو اور جو کوئی شخص اس دھن کے خیالی منصوبے بنائے اس کو Utopian کہا جاتا ہے۔

کرنے کے بجائے افریقہ کے کسی چھوٹے رقبے میں کر لیا گیا ہوتا تاکہ اس کی تباہ کاریوں کو جاننے کے لیے چوہتر سال نہ لگتے''(نیوز ویک)

سرمایہ دارانہ نظام پر تبصرہ

اب مختصراً سرمایہ دارانہ نظام کے فلسفے پر تبصرہ کرنا ہے۔اشتراکیت کی ناکامی کے بعد سرمایہ دار مغربی ممالک میں بڑے شدومد کے ساتھ بغلیں بجائی جارہی ہیں اور یہ دعویٰ کیا جارہا ہے کہ چونکہ اشتراکیت عمل کی دنیا میں ناکام ہوگئی۔اس لیے سرمایہ دارانہ نظام کی حقانیت ثابت ہوگئی۔حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ اشتراکیت کی ناکامی کی وجہ یہ نہیں تھی کہ مروجہ سرمایہ دارانہ نظام برحق تھا، بلکہ اس کی وجہ یہ تھی کہ اشتراکیت نے سرمایہ دارانہ نظام کی حقیقی غلطیوں کی اصلاح کے بجائے ایک دوسرا راستہ اختیار کر لیا،لہٰذا اب سرمایہ دارانہ نظام کی فکری غلطیوں کو زیادہ باریک بینی کے ساتھ سمجھنے کی ضرورت ہے۔

دراصل بات یہ ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام کے فلسفے میں اس حد تک تو بات درست تھی کہ معاشی مسائل کے حل کے لیے ذاتی منافع کے محرک اور بازار کی قوتوں یعنی رسد وطلب سے کام لینے کی ضرورت ہے۔ کیونکہ یہ انسانی فطرت کا تقاضہ ہے۔اور قرآن وسنت سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے (جیسا کہ چند صفحات کے بعد آپ اس کو ملاحظہ فرمائیں گے) لیکن غلطی یہاں سے لگی کہ ایک شخص کو زیادہ سے زیادہ منافع کی بے لگام آزادی دی گئی،جس میں حلال وحرام کی کوئی تفریق نہیں تھی اور نہ اجتماعی فلاح کی طرف خاطر خواہ توجہ تھی۔ چنانچہ اس کے لیے ایسے طریقے اختیار کرنا بھی جائز ہوگیا جن کے نتیجے میں وہ زیادہ سے زیادہ دولت مند بن کر بازار پر اپنی اجارہ داری (Monopoly) قائم کرلے۔اجارہ داری کا مطلب یہ ہے کہ کسی خاص چیز کی رسد فراہم کرنا کسی ایک شخص یا ایک گروپ میں منحصر ہو کر رہ جائے۔یعنی صورتِ حال ایسی پیدا ہو جائے کہ اس شخص یا گروپ کے سوا کوئی اور چیز پیدا نہ کر پائے اس اجارہ داری کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ لوگ وہ چیز اس کی مقرر کی ہوئی من مانی قیمت پر لینے پر مجبور ہوتے ہیں۔

انسان کے ذاتی منافع محرک کو کھلی چھوٹ دینے اور اس پر ضرورت سے زیادہ زور دینے کے نتیجے میں جو خرابیاں سرمایہ دار معاشرے میں پیدا ہوئیں،وہ مختصراً حسب ذیل ہیں:

۱۔ چونکہ منافع کے حصول کے لیے حلال وحرام کی کوئی تفریق نہیں تھی۔اس لیے اس سے بہت سی اخلاقی برائیاں معاشرے میں پھیلیں۔اس لیے کہ زیادہ سے زیادہ منافع کمانے کا محرک اکثر لوگوں کے سفلی جذبات کو اپیل کر کے ان کی غلط خواہشات کا سامان فراہم کرتا ہے۔جس سے معاشرے میں

اخلاقی بگاڑ پھیلتا ہے۔ چنانچہ مغربی ممالک میں عریانی اور فحاشی کا ایک اہم سبب یہ بھی ہے۔ عریاں تصاویر اور فلموں کا ایک سیلاب ہے، جسے معاشرے میں پھیلا کر لوگ ذاتی منافع کے محرک کی تسکین کر رہے ہیں۔ عورتیں اپنے جسم کا ایک ایک عضو اس محرک کے تحت بازار میں فروخت کر رہی ہیں۔ ابھی ایک حالیہ رپورٹ کے مطابق سروسز کے کاروبار میں سب سے زیادہ نفع بخش کاروبار ماڈل گرلز کا ہے، جو اپنی تصویریں صنعت کاروں کو اپنی مصنوعات پر چھاپنے کے لیے یا اشتہار کا حصہ بنانے کے لیے فراہم کرتی ہیں، اور اس کا بہت بھاری معاوضہ وصول کرتی ہیں۔ یہاں تک کہ ان کا طبقہ امریکہ کے سب سے زیادہ کمانے والوں میں شامل ہے۔

ایک عریاں بالکل مادرزاد برہنہ تصویروں کا رسالہ ہے، اس کے ایک مہینہ میں بیس ملین نسخے فروخت ہوتے ہیں۔ بیس ملین کے معنی ہیں دو کروڑ، ایک مہینہ میں دو کروڑ نسخے فروخت ہوتے ہیں، تو جب نفع کمانے کے لیے آزاد چھوڑ دیا گیا تو انسان کے فطری جذبات کو برانگیختہ کر کے نفع کمایا۔

کچھ عرصہ پہلے ایک امریکی رسالہ ٹائمز (Times) میں اطلاع آئی تھی کہ امریکہ میں خدمات کے میدان میں جو سب سے زیادہ کمانے والا طبقہ ہے وہ ماڈل گرل (Model Girl) کا ہے۔ وہ کئی ملین ڈالر یومیہ کماتی ہے۔ تو جب منافع کمانے کا ہر طریقہ جائز ہو گیا تو اس میں حلال وحرام کی کوئی تفریق نہیں رہی، جائز ناجائز، اخلاقی وغیر اخلاقی، مناسب اور نامناسب کی کوئی تفریق نہیں رہی۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عصمت فروشی کے کاروبار کو بہت سے مغربی ملکوں میں قانونی تحفظ حاصل ہے اگرچہ بہت سے ملکوں میں اب بھی قانوناً منع ہے لیکن بہت سے ملکوں نے اس کو قانونی تحفظ فراہم کر دیا ہے۔ پچھلے دنوں لاس اینجلس میں عصمت فروش عورتوں کی کانفرنس منعقد ہوئی جس میں یہ مطالبہ کیا گیا تھا کہ جن ملکوں نے ابھی تک لائسنس نہیں دیا وہ بھی لائسنس دیدیں، تو جب منافع کمانے کے لیے ہر شخص آزاد ہے اور اس پر کوئی پابندی، کوئی رکاوٹ نہیں ہے تو وہ ہر طریقہ اختیار کرے گا۔

ایک انٹرنیشنل ماڈل گرل کے بارے میں لکھا گیا کہ وہ دوسرے ملکوں کی کمپنیوں کے ساتھ بھی ماڈلنگ کرتی ہے، اس کی فیس اس کے لگ بھگ ہوتی ہے وہ تو علیحدہ اور دوسرے ملکوں میں جانے کا فسٹ کلاس ٹکٹ کا کرایہ الگ اور فائیو اسٹار ہوٹل میں ٹھہرنے کا خرچہ الگ اور معاہدہ یہ ہوتا ہے کہ تین سال تک وہ کمپنی جتنی مصنوعات بنائے گی اس کی منہ مانگی مقدار اس کو مفت فراہم کرے گی۔

ظاہر ہے کہ ان پر جو لاکھوں ڈالر خرچ کیے جاتے ہیں وہ بالآخر پیداوار کی لاگت میں شامل ہو کر عام صارفین کی جیب پر پڑتے ہیں اور اس طرح پوری قوم ان بداخلاقیوں کی مالی قیمت بھی ادا کرتی ہے۔

۲۔ چونکہ ذاتی منافع کے حصول پر کوئی خاص اخلاقی پابندی عائد نہیں، اس لیے ترجیحات کے تعین اور وسائل کی تخصیص میں اجتماعی مصالح کا کما حقہ لحاظ نہیں ہو پاتا۔ جب زیادہ منافع کا حصول ہی منتہائے مقصود ٹھہرا تو اگر یہ زیادہ منافع عریاں فلموں کے ذریعے حاصل ہو رہا ہو تو ایک شخص بے گھر لوگوں کو مکان فراہم کرنے میں روپیہ کیوں لگائے؟ جبکہ مقابلتاً اس میں نفع کم ہو۔

۳۔ ذاتی منافع کے محرک پر حلال وحرام کی پابندی نہ ہونے کی وجہ سے سود، قمار، سٹہ وغیرہ سب سرمایہ دارانہ نظام میں جائز ہیں، حالانکہ یہ وہ چیزیں ہیں جو کہ معیشت کے فطری توازن میں بگاڑ پیدا کرتی ہیں۔ جس کا ایک مظاہرہ یہ ہے کہ ان کے نتیجے میں بکثرت اجارہ داریاں قائم ہو جاتی ہیں۔ اور ان اجارہ داریوں کی موجودگی میں بازار کی فطری قوتیں یعنی رسد وطلب کے قوانین مفلوج ہو جاتے ہیں اور کما حقہ کام نہیں کر پاتے، یعنی ایک طرف تو سرمایہ دارانہ نظام کا دعویٰ یہ ہے کہ ہم مارکیٹ کی قوتیں یعنی رسد وطلب سے کام لینا چاہتے ہیں اور دوسری طرف ذاتی منافع کے محرک کو بے مہار چھوڑ کر اس میں اجارہ داریوں کے مواقع فراہم کیے گئے ہیں، جن سے رسد وطلب کی قوتیں ناکارہ یا بے اثر ہو جاتی ہیں۔

اس کی تھوڑی سی تشریح یہ ہے کہ رسد وطلب کی قوتیں معیشت میں توازن پیدا کرنے کے لیے اس وقت کارآمد ہوتی ہیں جب بازار میں آزاد مقابلے (Free Competition) کی فضا ہو، لیکن جب کسی شخص کی اجارہ داری قائم ہو جائے تو قیمتوں کا نظام متوازن نہیں رہتا اور معیشت کے چار بنیادی مسائل کے بارے میں ہونے والے فیصلے معاشرے کی حقیقی ضرورت اور طلب کی عکاسی نہیں کرتے، اور یہاں بھی ایک مصنوعی نظام وجود میں آجاتا ہے۔ اس بات کو ایک مثال سے سمجھیں، مثلاً چینی کی پیداوار ضرورت کے مطابق اتنی ہونی چاہیے کہ بازار میں اس کی مناسب قیمت رسد وطلب کے ذریعہ متعین ہو جائے، لیکن مناسب قیمت پہ تعین اسی وقت ممکن ہے جب چینی بنانے کے لیے مختلف کارخانے موجود ہوں، اور خریدنے والے کو یہ اختیار ہو کہ اگر ایک کارخانے کی چینی مہنگی ہے تو وہ دوسرے کارخانے سے خرید سکے۔ اگر بازار میں مقابلے کی یہ فضا ہو تو کوئی بھی کارخانہ قیمت کے تعین میں من مانی نہیں کر سکتا، اس صورت میں بازار میں چینی کی جو قیمت متعین ہوگی وہ وقعتاً طلب ورسد کے توازن سے وجود میں آئے گی اور متوازن قیمت ہوگی۔ لیکن اگر ایک ہی شخص چینی کے کاروبار کا اجارہ دار بن گیا اور لوگ صرف اسی سے چینی خریدنے پر مجبور ہیں تو پھر لوگوں کے پاس اس کے علاوہ چارہ نہیں ہوتا کہ اس کی مقرر کی ہوئی قیمت پر چینی خریدیں۔ ایسی صورت میں چینی کی جو قیمت ہوگی وہ یقیناً اس صورت سے زیادہ ہوگی جب بازار میں ایک سے زیادہ چینی فراہم کرنے والے ہوتے اور ان

میں تجارتی مقابلہ ہوتا۔ فرض کیجیے کہ آزاد مقابلے کی صورت میں چینی کی قیمت آٹھ روپے کلو ہوتی، تو اجارہ داری کی صورت میں وہ دس یا بارہ روپے کلو ہو سکتی ہے۔ اب اگر لوگ بارہ روپے میں چینی خرید رہے ہیں تو یہ معاملہ ان کی حقیقی طلب کی نمائندگی نہیں کر رہا ہے بلکہ ایک مصنوعی صورت حال کی نمائندگی کر رہا ہے جو چینی کے ایک تاجر کی اجارہ داری سے پیدا ہوئی اور اس طرح اجارہ داری نے حقیقی طلب و رسد کے نظام کو بگاڑ دیا۔

لہٰذا اگرچہ یہ کہنا درست تھا کہ معاشی مسائل کا فیصلہ بڑی حد تک طلب و رسد کی طاقتوں کو کرنا چاہیے لیکن اس مقصد کے حصول کے لیے جب ذاتی منافع کے محرک کو حلال و حرام کی تفریق کے بغیر بے مہار چھوڑ دیا گیا تو اس نے اجارہ داریاں قائم کر کے خود طلب و رسد کی قوتوں کو ٹھیک ٹھیک کام کرنے سے روک دیا۔ اور اس طرح سرمایہ دارانہ نظام کے ایک اصول نے عملاً خود اپنے دوسرے اصول کی نفی کر دی۔

۴۔ اگرچہ سرمایہ دارانہ نظام کا اصل تصور یہ تھا کہ کاروبار اور تجارت میں کسی قسم کی مداخلت نہ ہو۔ لیکن رفتہ رفتہ تجربات سے گزرنے کے بعد عملاً یہ اصول پوری طرح برقرار نہیں رہ سکا۔ تقریباً تمام سرمایہ دارانہ ممالک میں حکومت کی طرف سے کچھ نہ کچھ مداخلت ہوتی رہی ہے۔ مثلاً حکومت مختلف قوانین کے ذریعہ بالخصوص ٹیکسوں کے ذریعہ کسی تجارت کی ہمت افزائی اور کسی کی ہمت شکنی کرتی رہی ہے اور اب شاید کوئی سرمایہ دار ملک ایسا نہیں ہے جس میں کاروبار اور تجارت پر حکومت کی طرف سے کوئی نہ کوئی پابندی عائد نہ ہو۔ لہٰذا حکومت کی عدم مداخلت (Laissez Faire) کے اصول پر صحیح طور پر عمل کرنے والا دنیا میں کوئی ملک موجود نہیں۔ لیکن حکومت کی یہ مداخلتیں بسا اوقات تو نوکر شاہی اور سرمایہ داروں کے باہمی گٹھ جوڑ کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ جن کا فائدہ صرف بااثر سرمایہ داروں کو پہنچتا ہے اور اس کی وجہ سے اجتماعی فلاح و بہبود حاصل نہیں ہوتی اور اگر یہ پابندیاں اس قسم کے گٹھ جوڑ اور بددیانتی سے خالی ہوں تب بھی وہ خالص سیکولر سوچ پر مبنی ہوتی ہیں۔ اپنی عقل کی روشنی میں جو پابندی مناسب سمجھی لگا دی۔ حالانکہ تنہا عقل تمام انسانی مسائل حل کرنے کے لیے ناکافی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ پابندیاں معاشی ناہمواریوں کا صحیح علاج نہیں بن سکیں۔

۵۔ سرمایہ دارانہ نظام میں خاص طور پر تقسیم دولت کا نظام ناہمواری کا شکار رہتا ہے۔ اس ناہمواری کا ایک بڑا سبب سود اور قمار ہے، اس کے نتیجے میں دولت کے بہاؤ کا رخ امیروں کی طرف رہتا ہے غریبوں اور عوام کی طرف نہیں ہوتا۔ اس کی پوری تشریح ان شاء اللہ تقسیم دولت پر گفتگو کرتے ہوئے آئے گی۔

معیشت کے اسلامی احکام

معیشت کے اسلامی احکام

سرمایہ داری اور اشتراکیت کے مختصر تعارف کے بعد اب میں مختصراً یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ معیشت کے جو بنیادی مسائل بیان کیے گئے تھے، ان کے بارے میں اسلامی نقطہ نظر کیا ہے؟ یہ بات پہلے ہی قدم پر واضح رہنی چاہیے کہ اسلام کوئی معاشی نظام نہیں ہے، بلکہ وہ ایک دِین ہے، جس کے احکام ہر شعبہ زندگی سے متعلق ہیں۔ جس میں معیشت بھی داخل ہے۔ لہٰذا قرآن وحدیث نے معروف معنوں میں کوئی معاشی نظام پیش نہیں کیا، جس کو موجودہ دور کی معاشی اصطلاحات میں تعبیر کیا گیا ہو۔ لہٰذا ترجیحات کا تعین، وسائل کی تخصیص، آمدنی کی تقسیم، اور ترقی کے عنوان سے قرآن وسنت یا اسلامی فقہ میں براہِ راست کوئی بحث موجود نہیں ہے، لیکن زندگی کے دوسرے شعبوں کی طرح اسلام نے معیشت کے بارے میں بھی کچھ احکام دیئے ہیں ان احکام کے مجموعی مطالعے سے ہم یہ مستنبط کر سکتے ہیں کہ مذکورہ چار مسائل کے سلسلے میں اسلام کا نقطہ نظر کیا ہے؟ اور اسی مطالعے اور استنباط کا حاصل اس وقت پیش کرنا مقصود ہے۔ اسلام کے معاشی احکام اور تعلیمات پر غور کرنے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اسلام نے بازار کی قوتوں یعنی رسد وطلب کے قوانین کو تسلیم کیا ہے اور وہ معیشت کے حل کے لیے ان کے استعمال کا فی الجملہ حامی ہے۔ چنانچہ قرآن کریم کا ارشاد ہے:

"نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُمْ مَّعِيْشَتَهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَرَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجَاتٍ لِّيَتَّخِذَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا سُخْرِيًّا" (زخرف:۳۲)

''ہم نے ان کے درمیان معیشت کو تقسیم کیا ہے اور ان میں سے بعض کو بعض پر درجات میں فوقیت دی ہے تاکہ ان میں سے ایک دوسرے سے کام لے سکے۔''

ظاہر ہے کہ ایک دوسرے سے کام اس طرح لیا جائے گا کہ کام لینے والا کام کی طلب اور کام دینے والا کام کی رسد ہے۔ اس طلب اور رسد کی باہمی کشمکش اور باہمی امتزاج سے ایک متوازن معیشت وجود میں آتی ہے۔ اسی طرح آنحضرت ﷺ کے زمانے میں جب دیہاتی اپنی زرعی پیداوار شہر میں فروخت کے لیے لاتا تو بعض شہری لوگ اس دیہاتی سے کہتے کہ تم اپنا مال خود شہر میں لے جا کر مت بیچو، بلکہ یہ سامان مجھے دیدو، میں مناسب قیمت پر اس کو فروخت کردوں گا، تاکہ اس کی قیمت زیادہ ملے۔ آنحضرت ﷺ نے شہریوں کو ایسا کرنے سے روکا، اور اس کے ساتھ ہی یہ جملہ ارشاد فرمایا:

"دعوا الناس یرزق اللّٰہ بعضھم عن بعض"

''لوگوں کو آزاد چھوڑ دو تا کہ اللہ تعالیٰ ان میں سے بعض کو بعض کے ذریعے رزق عطا فرمائے''

اس طرح آنحضرت ﷺ نے بیچنے اور خریدنے والے کے درمیان تیسرے شخص کی مداخلت کو اس لیے مسترد فرمایا تا کہ بازار میں طلب و رسد کا صحیح توازن قائم ہو۔ ظاہر ہے کہ دیہاتی جب براہِ راست بازار میں کوئی چیز فروخت کرے گا تو اپنا مناسب نفع رکھ کر ہی فروخت کرے گا۔ لیکن اسے چونکہ جلدی واپس جانا ہے، اس لئے اس کے پاس ذخیرہ اندوزی کی گنجائش نہیں اور اس کے خود بازار میں پہنچنے کی صورت میں طلب و رسد کا ایسا امتزاج ہوگا جو صحیح قیمت متعین کرنے میں مدد دے گا۔ اس کے برخلاف اگر کوئی تیسرا آدمی ان دونوں کے درمیان آجائے اور مال کی ذخیرہ اندوزی کر کے اس کی مصنوعی قلت پیدا کرے تو وہ طلب و رسد کے قدرتی نظام میں بگاڑ پیدا کرے گا۔ لہٰذا اس حدیث سے بھی یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ حضور اقدس ﷺ نے طلب و رسد کے قدرتی نظام کو تسلیم فرمایا اور اس کو باقی رکھنے کی کوشش فرمائی۔

اسی طرح جب آپ ﷺ سے یہ درخواست کی گئی کہ آپ بازار میں فروخت ہونے والی چیزوں کی قیمت متعین فرمادیں تو اس موقع پر بھی حضور اکرم ﷺ نے یہ الفاظ ارشاد فرمائے:

"ان اللّٰہ ھو المسعر القابض الباسط الرازق"

''بیشک اللہ تعالیٰ ہی قیمت متعین کرنے والے ہیں۔ وہی چیزوں کی رسد میں کمی کرنے والے اور زیادتی کرنے والے ہیں اور وہی رازق ہیں''

اللہ تعالیٰ کو قیمت مقرر کرنے والا قرار دینے کا واضح مطلب اس حدیث کے سیاق میں بھی ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے طلب و رسد کے فطری اصول مقرر فرمائے ہیں جن سے قیمتیں فطری طور پر متعین ہوتی ہیں اور اس فطری نظام کو چھوڑ کر مصنوعی طور سے قیمتوں کا تعین پسندیدہ نہیں۔

قرآن وسنت کے ان ارشادات سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اسلام نے بازار کی قوتوں یعنی طلب و رسد کے قوانین کو فی الجملہ تسلیم کیا ہے۔ اسی طرح ذاتی منافع کے محرک سے بھی فی الجملہ کام لیا ہے۔ لیکن فرق یہ ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام میں اس محرک کو بالکل آزاد چھوڑ دیا گیا، جسکے نتیجے میں وہ خرابیاں پیدا ہوئیں جن کا ذکر پیچھے کیا گیا ہے۔ اسلام نے ذاتی منافع کے محرک کو برقرار رکھتے ہوئے اور طلب و رسد کے قوانین کو تسلیم کرتے ہوئے تجارتی اور معاشی سرگرمیوں پر کچھ ایسی پابندیاں عائد کر دیں کہ ان پر عمل کی صورت میں ذاتی منافع کا محرک ایسے غلط رخ پر نہیں چل سکتا جو معیشت کو غیر

متوازن کرے یا اس سے دوسری اخلاقی یا اجتماعی خرابیاں پیدا ہوں۔ اسلام نے ذاتی منافع کے محرک پر جو پابندیاں عائد کی ہیں، انہیں تین قسموں پر منقسم کیا جا سکتا ہے:

ا۔ خدائی پابندی

سب سے پہلے تو اسلام نے معاشی سرگرمیوں پر حلال و حرام کی کچھ ابدی پابندیاں عائد کی ہیں جو ہر زمانے میں اور ہر جگہ نافذ العمل ہیں۔ مثلاً سود، قمار، سٹہ، اکتناز، احتکار، یعنی ذخیرہ اندوزی اور دوسری تمام بیوع باطلہ کو کلی طور پر ناجائز قرار دیدیا، کیونکہ یہ چیزیں عموماً اجارہ داریوں کے قیام کا ذریعہ بنتی ہیں اور ان سے معیشت میں ناہمواریاں پیدا ہوتی ہیں۔ اسی طرح ان تمام چیزوں کی پیداوار اور خرید و فروخت کو حرام قرار دیا جن سے معاشرہ کسی بداخلاقی کا شکار ہو، اور جس میں لوگوں کے سفلی جذبات بھڑکا کر ناجائز طریقے سے آمدنی حاصل کرنے کا راستہ پیدا کیا جائے۔

یہاں یہ بات واضح رہنی چاہیے کہ یہ پابندیاں قرآن وسنت کے ذریعہ عائد کی گئی ہیں۔ انہیں اسلام نے انسان کی ذاتی عقل پر نہیں چھوڑا کہ اگر اس کی عقل مناسب سمجھے تو پابندی عائد کر دے اور اگر مناسب نہ سمجھے تو پابندی عائد نہ کرے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کسی چیز کی اچھائی یا برائی کا فیصلہ کرنے کے لیے بسا اوقات انسانون کی عقلوں میں تفاوت اور اختلاف ہوتا ہے۔ ایک انسان کی عقل ایک چیز کو اچھا اور دوسرے انسان کی عقل اس کو برا سمجھ سکتی ہے، لہٰذا اگر ان پابندیوں کو بھی محض عقلِ انسانی کے حوالے کیا جاتا تو اس بات کا امکان تھا کہ لوگ ان پابندیوں کو اپنی عقل کی روشنی میں نامناسب قرار دے کر معاشرے کو ان سے آزاد کر دیتے اور چونکہ اللہ تبارک وتعالیٰ کے علم میں یہ پابندیاں ہر زمانے اور ہر جگہ کے لیے ضروری تھیں اس لیے ان کو وحی کے ذریعے ابدی حیثیت دی گئی، تاکہ انسان اپنی عقلی تاویلات کے سہارے ان سے چھٹکارا حاصل کر کے معیشت اور معاشرے کو ناہمواریوں میں مبتلا نہ کر سکے۔

یہیں سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ یہ خدائی پابندیاں جو قرآن وسنت نے عائد کی ہیں، بہرصورت واجب العمل ہیں۔ خواہ انسان کو ان کی عقلی حکمت سمجھ میں آئے یا نہ آئے۔

جیسا کہ پیچھے عرض کیا گیا، موجودہ دور میں بیشتر سرمایہ دار ممالک بھی ذاتی منافع کے محرک پر کچھ نہ کچھ پابندیاں ضرور عائد کرتے ہیں لیکن وہ پابندیاں چونکہ وحی الٰہی سے مستفید نہیں ہوتیں اس لیے وہ متوازن معیشت کے قیام کے لیے کافی نہیں ہوتیں۔ چنانچہ ان سرمایہ دار ملکوں میں کہیں بھی سود، قمار، اور سٹہ وغیرہ پر کوئی پابندی عائد نہیں کی گئی، جو معاشی ناہمواریوں کا بہت بڑا سبب ہے۔

۲- ریاستی پابندیاں

مذکورہ خدائی پابندیاں تو ابدی نوعیت کی تھیں۔ انہی کے ساتھ اسلامی شریعت نے حکومتِ وقت کو یہ اختیار بھی دیا ہے کہ وہ کسی عمومی مصلحت کے تحت کسی ایسی چیز یا ایسے فعل پر پابندی عائد کر سکتی ہے، جو بذاتِ خود حرام نہیں، بلکہ مباحات کے دائرے میں آتی ہے، لیکن اس سے کوئی اجتماعی خرابی لازم آتی ہے۔ یہ پابندی ابدی نوعیت کی نہیں ہوتی، جو ہر زمانے میں اور ہر جگہ نافذ العمل ہو۔ بلکہ اس کی حیثیت وقتی حکم کی ہوتی ہے، جو وقتی مصلحت کے تحت ہوتا ہے۔ اس کی سادہ سی مثال یہ ہے کہ فقہائے کرام نے لکھا ہے کہ جب ہیضہ کی وبا پھوٹ رہی ہو تو حکومت یہ پابندی لگا سکتی ہے کہ خربوزے کی خرید و فروخت اور اس کا کھانا ممنوع ہے جب تک حکومت کی طرف سے عائد کردہ یہ پابندی باقی رہے اس وقت تک خربوزہ کھانا اور اسکا بیچنا شرعاً بھی ناجائز ہو جائے گا۔ اسی طرح اصولِ فقہ میں سدِ ذرائع کے نام سے ایک مستقل باب ہے کہ اگر ایک کام فی نفسہٖ جائز ہو لیکن اس کی کثرت کسی معصیت یا مفسدے کا سبب بن رہی ہو تو حکومت کے لئے یہ جائز ہے کہ وہ اس جائز کام کو بھی ممنوع قرار دیدے۔

اس اصول کے تحت حکومت تمام معاشی سرگرمیوں کی نگرانی کر سکتی ہے اور جن سرگرمیوں سے معیشت میں ناہمواری پیدا ہونے کا اندیشہ ہو، ان پر مناسب پابندی عائد کر سکتی ہے۔ کنز العمال میں روایت منقول ہے کہ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ ایک مرتبہ بازار میں آئے تو دیکھا کہ ایک شخص کوئی چیز اس معروف نرخ سے بہت کم داموں میں فروخت کر رہا ہے۔ آپ نے اس سے فرمایا کہ:

"اما ان تزید فی السعر و اما ترفع عن سوقنا" (۱)

"یا تو دام میں اضافہ کرو، ورنہ ہمارے بازار سے اٹھ جاؤ"

روایت میں یہ بات واضح نہیں ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کس وجہ سے اس پر پابندی لگائی۔ ہو سکتا ہے کہ وجہ یہ ہو کہ وہ متوازن قیمت لگا کر دوسرے تاجروں کے لئے جائز نفع کا راستہ بند کر رہا ہو، اور یہ بھی ممکن ہے کہ پابندی کی وجہ یہ ہو کہ قیمت کم پر مہیا ہونے کی صورت میں لوگ اسے ضرورت سے زیادہ خرید رہے ہوں، جس سے اسراف کا دروازہ کھلتا ہو، یا لوگوں کے لئے ذخیرہ اندوزی کی گنجائش نکلتی ہو۔ بہرصورت قابلِ غور بات یہ ہے کہ اصل شرعی حکم یہ ہے کہ ایک شخص اپنی ملکیت کی چیز جس دام پر چاہے فروخت کر سکتا ہے، لہٰذا کم قیمت پر بیچنا فی نفسہٖ جائز تھا، لیکن کسی اجتماعی مصلحت کی

(۱) کما فی کنز العمال، باب الاحتکار ج:۴، ص:۵۶۔

وجہ سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس پر پابندی عائد کی۔

اس قسم کی ریاستی پابندیوں کے واجب ہونے کا مآخذ قرآن کریم کا یہ ارشاد ہے:

"یاایھا الذین آمنوا اطیعوا اللّٰہ و اطیعوا الرسول واولی الامرمنکم"

اے ایمان والو! اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اور اپنے میں سے بااختیار لوگوں کی اطاعت کرو۔

اس آیت میں "اولی الامر" (بااختیار افراد) کی اطاعت کو، اللہ اور رسول کی اطاعت سے الگ کر کے ذکر کیا گیا ہے۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ جن چیزوں میں قرآن وسنت نے کوئی معین حکم نہیں دیا ان میں اولی الامر کے احکام واجب التعمیل ہیں۔

یہاں یہ بات واضح رہنا ضروری ہے کہ حکومت کو مباحات پر پابندی عائد کرنے کا یہ اختیار غیر محدود نہیں ہے بلکہ اس کے بھی کچھ اصول وضوابط ہیں۔ ایک یہ کہ حکومت کا وہی حکم واجب التعمیل ہے جو قرآن وسنت کے کسی حکم سے متصادم نہ ہو اور دوسرے یہ کہ حکومت کو اس قسم کی پابندی عائد کرنے کا اختیار صرف اس وقت ملتا ہے جب کوئی اجتماعی مصلحت اس کی داعی ہو۔ چنانچہ ایک مشہور فقہی قاعدے میں اس بات کو اس طرح تعبیر کیا گیا ہے کہ:

"تصرف الامام بالرعیة منوط بالمصلحة"

''عوام پر حکومت کے اختیارات مصلحت کے ساتھ بندھے ہوئے ہیں''

لہٰذا اگر کوئی حکومت کسی اجتماعی مصلحت کے بغیر کوئی پابندی عائد کرے تو یہ پابندی جائز نہیں اور قاضی کی عدالت سے اس کو منسوخ کرایا جاسکتا ہے۔

۳۔اخلاقی پابندیاں

جیسا کہ پیچھے عرض کیا گیا کہ اسلام ٹھیٹ معنوں میں کسی معاشی نظام کا نام نہیں بلکہ ایک دین کا نام ہے۔ اس دین کی تعلیمات اور احکام زندگی کے دوسرے شعبوں کی طرح معیشت سے بھی متعلق ضرور ہیں۔ لیکن اس دین کی تعلیمات میں یہ بات قدم قدم پر واضح کی گئی ہے کہ معاشی سرگرمیاں اور ان سے حاصل ہونے والے مادی فوائد انسان کی زندگی کا منتہائے مقصود نہیں ہے۔ قرآن وسنت کا تمام تر زور اس بات پر ہے کہ دنیاوی زندگی ایک محدود اور چند روزہ زندگی ہے اور اس کے بعد ایک ایسی ابدی زندگی آنے والی ہے جس کی کوئی انتہاء نہیں اور انسان کا اصل کام یہ ہے کہ وہ دنیوی زندگی کو اس آخرت کی زندگی کے لئے زینہ بنائے، اور وہاں کی بہبود کی فکر کرے۔ لہٰذا انسان کی اصل کامیابی

یہ نہیں ہے کہ وہ دوسرں کے مقابلے میں چار پیسے زیادہ کما لے، بلکہ اس کی کامیابی یہ ہے کہ وہ آخرت کی ابدی زندگی میں زیادہ سے زیادہ عیش و آرام کا انتظام کرے جس کا راستہ یہ ہے کہ دنیا میں رہتے ہوئے وہ کام کرے، جو اس کے لئے زیادہ سے زیادہ اجر وثواب کا موجب ہو۔

جب یہ ذہنیت افراد میں پیدا ہو جاتی ہے تو ان کے معاشی فیصلوں پر اثر انداز ہونے والی چیز صرف یہ نہیں ہوتی کہ کونسی صورت میں ہماری تجوری زیادہ بھرے گی، بلکہ بسا اوقات ان کے معاشی فیصلے اس بنیاد پر بھی ہوتے ہیں کہ کون سے کام میں مجھے آخرت میں زیادہ فائدہ حاصل ہوگا؟ اس طرح بہت سے معاملات میں شریعت نے کوئی وجوبی حکم (Manadatory Order) تو نہیں دیا۔ لیکن کسی خاص بات کے اخروی فضائل بیان فرمائے ہیں۔ جو مومن کے لئے بہت بڑی کشش کا ذریعہ ہیں۔ اور ان کے توسط سے انسان خود اپنے اوپر بہت سی پابندیاں عائد کر لیتا ہے۔ اخلاقی پابندیوں سے میری مراد اسی قسم کی پابندیاں ہیں۔

اس کی ایک سادہ سی مثال یہ ہے کہ اگر ایک شخص کے پاس سرمایہ کاری کے لئے دو راستے ہیں۔ ایک یہ کہ وہ اپنا سرمایہ کسی جائز تفریحی مگر تجارتی منصوبے میں لگائے، جس میں اسے زیادہ آمدنی کی توقع ہے اور دوسرا یہ کہ وہ یہ سرمایہ بے گھر لوگوں کے لیے سستے مکان تعمیر کر کے فروخت کرنے پر صرف کرے جس میں اسے نسبتاً کم منافع کی توقع ہے، تو ایک سیکولر ذہنیت کا حامل شخص یقیناً پہلے راستے کو اختیار کرے گا کیونکہ اس میں منافع زیادہ ہے لیکن جس شخص کے دل میں آخرت کی فکر بسی ہوئی ہو، وہ اس کے برعکس یہ سوچے گا کہ اگرچہ رہائشی منصوبہ میں مالی نفع نسبتاً کم ہے، لیکن میں غریب لوگوں کے لئے رہائشی مکان فراہم کر کے اپنے لئے آخرت میں اجر وثواب زیادہ حاصل کر سکتا ہوں۔ اس لئے مجھے تفریحی منصوبے کے بجائے رہائشی منصوبے کو اختیار کرنا چاہئے۔

یہاں اگرچہ دونوں راستے شرعی اعتبار سے جائز تھے، اور ان میں سے کسی پر کوئی ریاستی پابندی بھی عائد نہیں تھی۔ لیکن عقیدۂ آخرت پر مبنی اخلاقی پابندی نے لوگوں کی ضرورت کو مدنظر رکھتے ہوئے اس شخص کے دل میں ایک اندرونی رکاوٹ پیدا کر دی۔ جس سے ترجیحات کا بہتر تعین اور وسائل کی بہتر تخصیص عمل میں آئی۔ یہ ایک چھوٹی سی مثال ہے۔ لیکن اگر واقعتاً اسلام کا عقیدۂ آخرت دل میں پوری طرح جاگزیں اور مستحضر ہو تو وہ معاشی فیصلوں کی بہتری میں بہت زبردست کردار ادا کرتا ہے۔

مجھے اس سے انکار نہیں کہ غیر اسلامی معاشروں میں بھی اخلاق کا ایک مقام ہے۔ اور بعض مرتبہ اخلاقی نقطۂ نظر معاشی فیصلوں پر بھی اثر انداز ہوتا ہے، لیکن چونکہ ان اخلاقی تصورات کی پشت پر آخرت کا مضبوط عقیدہ نہیں اس لئے وہ بحیثیت مجموعی معیشت کے اوپر کوئی بہت نمایاں اثرات نہیں

چھوڑتا۔ اس کے برخلاف اسلام اپنی تمام تعلیمات کے ساتھ بتمام وکمال نافذ العمل ہوتو اس کی اخلاقی تعلیمات کا معیشت پر بہت نمایاں ہوگا جیسا کہ ماضی میں اس کی بے شمار جیتی جاگتی مثالیں سامنے آچکی ہیں۔ لہٰذا اخلاقی پابندیوں کا عنصر ٹھیٹ اسلامی معیشت کے تناظر میں کسی طرح کوئی کمزور عنصر نہیں، بلکہ اس کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔

ایک اشکال اور اس کا جواب

بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ اشتراکیت نے چوہتر سال میں دم توڑا اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ وہ نظام بذات خود غلط تھا یا خراب تھا، بلکہ اس کی وجہ یہ پیش آئی کہ جو اصل نظام تھا اس پر عمل میں کوتاہی کی گئی جس کے نتیجے میں وہ تباہ ہوا، بعض لوگ اس کی مثال یوں دیتے ہیں کہ اسلام اور مسلمان ایک عرصہ تک دنیا میں حکمران رہے اور بعد میں ان پر زوال آیا۔

اب اگر کوئی شخص یہ کہنے لگے کہ معاذ اللہ اسلام ناکام ہو گیا، تو یہ غلط ہے، اس لئے کہ حقیقت میں اسلام ناکام نہیں ہوا بلکہ اسلام کی تعلیمات کو چھوڑنے پر زوال آیا۔ تو اشتراکیت والے بھی یہ کہتے ہیں کہ جو اصل نظام تھا اس کو چھوڑنے کے نتیجے میں یہ زوال آیا ورنہ فی نفسہٖ وہ نظام غلط نہیں تھا؟

اس کا جواب یہ ہے کہ یہ بات کہ آیا یہ زوال اصل نظام کو چھوڑنے سے آیا یا اصل نظام کو اختیار کرنے کے باوجود آیا اس کا فیصلہ بڑا آسان ہے۔

اشتراکیت ایک معاشی نظام ہے، سوال یہ ہے کہ اشتراکیت کے جو بنیادی اصول تھے ان کو کس مرحلہ پر اور کہاں چھوڑا گیا تھا؟ اشتراکیت کے دو اصول قومی ملکیت اور منصوبہ بندی یہ کسی دور میں نہیں چھوٹے، چاہے وہ لینن کا دور ہو یا گورباچوف کا دور ہو۔ یہ دو اصول ہر جگہ برقرار رہے ہیں کہ ساری پیداوار قومی ملکیت میں اور معیشت کے فیصلے منصوبہ بندی کے ذریعے طے ہوں۔

اب زوال جو آیا وہ اس بناء پر کہ اس کے نتیجے میں جو ملکی پیداوار گھٹی، پیداوار گھٹنے کے نتیجے میں لوگوں کے اندر بے روزگاری پھیلی اور لوگوں کو شدید مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔

گورباچوف جو سویت یونین کا آخری سربراہ تھا، اس نے تعمیر نو کے نام سے ایک تحریک چلائی، اس کی کتاب بھی چھپی ہوئی ہے، اس نے تھوڑی سی یہ کوشش کی کہ قوم تباہ ہو رہی ہے اور اس تباہی سے بچنے کے لیے تھوڑی سی لچک دکھانے کی کوشش کی کہ لوگوں کو تھوڑا سا تجارت کی طرف لایا جائے تاکہ معاشی سرگرمیوں میں دوبارہ جان پیدا ہو، لیکن اس کو موقع ہی نہیں ملا کہ اس کو بروئے کار لاتا، اگر اصولوں سے انحراف ہوتا تو وہ گورباچوف کے زمانے میں ہوتا کہ جب اس کا اس طرف میلان

ہوا تھا کہ بازار کی قوتوں کو بروئے کار لائیں، لیکن ابھی وہ یہ نہیں کر سکا تھا کہ خود لوگوں نے ہی بغاوت کر دی یہاں تک کہ قصہ ہی ختم ہو گیا۔

لہٰذا یہ کہنا کہ اصل اصولوں کو چھوڑنے کی وجہ سے زوال آیا یہ اس وجہ سے درست نہیں کہ جو بنیادی اصول تھے ان پر وہ اول سے آخر تک کاربند رہے اور انہی کے نتیجے میں جو دیکھا وہ دیکھا۔

رہی یہ بات کہ وہ استبداد کا نظام تھا اور ہم نے جمہوریت لانے کی کوشش کی، ایسا کبھی نہیں ہوا، وہ بھی جمہوریت کا تابعدار تھا، وہ بھی جمہوریت چاہتا تھا، لیکن وہ کہتا تھا کہ جمہوریت یعنی مزدوروں کی قائم کردہ جمہوریت لینن کے دور میں بھی تھی، اسٹالن کے دور میں بھی تھی، اور گورباچوف کے دور میں بھی تھی، کسی کے دور میں بھی سیاسی نظام میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی، لینن کے دور میں بھی ایک جماعتی نظام تھا جو آخر تک رہا۔

لہٰذا یہ کہنا کہ ہم اپنے اصولوں کو چھوڑنے کے نتیجے میں زوال کا شکار ہوئے ہیں، یہ غلط ہے۔ کیونکہ وہ ہمیشہ اصولوں کو اپناتے رہے اور اسی کے نتیجے میں زوال آیا۔

مخلوط معیشت کا نظام (Mixed Economy)

بعض ممالک میں ایک تصور پیدا ہوا ہے جس کا نام مخلوط معیشت ہے، جس میں ایک طرف سرمایہ دارانہ نظام کی بازار کی قوتوں کو برقرار رکھا گیا ہے اور دوسری طرف اس میں کچھ منصوبہ بندی بھی شامل کی گئی، مثلاً کچھ چیزیں ایسی ہیں جو قومی ملکیت میں ہیں اور کچھ چیزیں ایسی ہیں جو آزاد ملکیت میں ہیں۔ جو قومی ملکیت میں ہوتی ہیں ان کو پبلک سیکٹر (Public Sector) کہتے ہیں، مثلاً پانی، بجلی، ٹیلیفون اور ایئر لائنز وغیرہ، ہمارے ملک میں ایسا ہی ہے کہ یہ سب قومی ملکیت ہیں بعض ذاتی ملکیت (Private Sector)، بہت سے ملکوں میں مخلوط معیشت کا نظام چل رہا ہے۔

سرمایہ دارانہ نظام کا جو بنیادی اصول تھا یعنی عدم مداخلت، اس پر شاید کوئی بھی سرمایہ دارانہ ملک قائم نہیں رہا، ہر ایک نے کچھ نہ کچھ مداخلت کی ہے، کسی نے کم کسی نے زیادہ، اسی کو معیشت مخلوط (Mixed Economy) کہا جاتا ہے اور وہ مداخلت اپنی عقل کی بنیاد پر ہے، وہ مداخلت کیا ہے؟ کہ پارلیمنٹ (Parlement) جو پابندی عائد کرے وہ عائد کی جائے گی۔ یعنی پارلیمنٹ کی اکثریت جس کے حق میں ووٹ دیدے وہ پابندی عائد کر دی جائے گی اور پارلیمنٹ میں اکثریت ایسے لوگوں کی ہوتی ہے جو خود سرمایہ دار ہیں، لہٰذا وہ پابندیاں عائد تو ضرور کرتے ہیں لیکن وہ پابندیاں متعصبانہ ہوتی ہیں اور کوئی غیر جانبدارانہ پابندی عائد نہیں ہوتی۔ اس کے نتیجے میں جو خرابیاں اور

ناہمواریاں ہوتی ہیں وہ برقرار رہتی ہیں۔ کسی خدائی پابندی کو تسلیم نہیں کیا گیا جو انسانی سوچ سے ماوراء ہو، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ انسان کی عقل محدود ہے اور اس کے تحت جو پابندی عائد کی گئی ان میں سے خرابیاں زائل نہیں کیں۔

خدائی پابندی کو جب تک تسلیم نہیں کیا جائے گا، اللہ تبارک وتعالیٰ کی حاکمیت مطلقہ کو جب تک تسلیم نہیں کیا جائے گا تو اس وقت تک افراط وتفریط میں مبتلا رہیں گے، اس کے سوا کوئی اور راستہ نہیں ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی حاکمیت مطلقہ کو تسلیم کر کے اس کے تحت کاروبار چلایا جائے۔

مختلف نظامہائے معیشت میں دولت کی پیدائش اور تقسیم

مختلف نظامہائے معیشت میں دولت کی پیدائش اور تقسیم

اب تک جو بحث کی گئی، وہ معیشت کے بارے میں بنیادی نظریاتی بحث تھی۔ اب میں مختصراً اس موضوع پر گفتگو کرنا چاہتا ہوں کہ مختلف نظامہائے معیشت کے جو بنیادی نظریات پیچھے بیان کیے گئے ان پر عمل کرنے کے لئے ہر نظامِ معیشت کیا طریق کار اختیار کرتا ہے؟ اس طریق کار کو عموماً علم معاشیات میں چار عنوانات کے تحت بیان کیا جاتا ہے۔

۱۔ پیدائشِ دولت (Production of Wealth)

اس عنوان کے تحت ان مسائل سے بحث ہوتی ہے جو دولت کی پیداوار سے متعلق ہیں، یعنی یہ بتایا جاتا ہے کہ ہر نظامِ معیشت کے تحت پیداوار حاصل کرنے کے لئے کیا طریقے اختیار کیے جاتے ہیں؟ اس میں افراد، اداروں اور حکومت وغیرہ کا کیا کردار ہوتا ہے؟ اس عنوان کا عربی نام "انتاج الثروه" ہے۔

۲۔ تقسیمِ دولت (Distribution of Wealth)

اس عنوان کے تحت اس بات سے بحث ہوتی ہے کہ حاصل شدہ پیداوار کو اس کے مستحقین کے درمیان کس طریق کار کے تحت تقسیم کیا جائے؟ اس کو عربی میں ''توزیع الثروه" کہتے ہیں۔

۳۔ مبادلۂ دولت (Exchange of Wealth)

اس عنوان کے تحت ان طریقوں سے بحث کی جاتی ہے جو لوگ ایک چیز کے بدلے دوسری چیز حاصل کرنے کے لئے اختیار کرتے ہیں۔ اس عنوان کو عربی زبان میں ''مبادلة الثروه" کہتے ہیں۔

۴۔ صرفِ دولت (Consumption of Wealth)

اس عنوان کے تحت حاصل شدہ پیداوار یا دولت کو خرچ کرنے سے متعلق مسائل سے بحث ہوتی ہے۔ اس کو عربی میں ''استهلاك الثروه" کہا جاتا ہے۔

جہاں تک ''مبادلۂ دولت'' اور ''صرفِ دولت'' کا تعلق ہے۔ میں فی الحال ان عنوانات کو

نظرانداز کرتا ہوں۔ان سے متعلق بعض اہم مسائل اگلے مباحث کے ضمن میں انشاء اللہ آ جائیں گے۔ البتہ پیدائشِ دولت اور تقسیم دولت کے بارے میں چند بنیادی باتیں اشتراکیت، سرمایہ داری اور اسلام کے تقابلی مطالعے کے لئے ضروری ہیں، ان کو مختصراً بیان کرنا پیشِ نظر ہے۔

پیدائش اور تقسیم کا سرمایہ دارانہ نظریہ

سرمایہ دارانہ نظام میں یہ بات ایک مسلمہ کے طور پر طے شدہ ہے کہ کسی بھی چیز کی پیداوار میں چار عوامل کارفرما ہوتے ہیں۔جن کو اردو میں ''عواملِ پیداوار'' اور عربی میں ''عوامل الانتاج'' اور انگریزی میں (Factors of Production) کہتے ہیں۔

۱۔زمین (Land)

اس سے مراد قدرتی عاملِ پیدائش ہے۔جو براہِ راست اللہ تعالیٰ کی تخلیق ہے، اور اس کے پیدا کرنے میں کسی عمل کا کوئی دخل نہیں۔

۲۔محنت (Labour)

اس سے مراد وہ انسانی عمل ہے، جس کے ذریعے کوئی نئی پیداوار وجود میں آتی ہے۔

۳۔سرمایہ (Capital)

اس کی تعریف سرمایہ دارانہ نظام میں یہ کی گئی ہے کہ سرمایہ ''پیدا کردہ عاملِ پیدائش'' (Produced Factor of Production) کا نام ہے۔اس تعریف کو ذرا وضاحت کے ساتھ یوں کہا جاسکتا ہے کہ سرمایہ وہ عاملِ پیداوار ہے جو قدرتی نہ ہو، بلکہ کسی عملِ پیدائش کے نتیجے میں پیدا ہو، اور اس کے بعد کسی اگلے عملِ پیدائش میں استعمال ہو رہا ہو۔

۴۔آجر (Entrepreneur)

اس سے مراد وہ شخص یا ادارہ ہے جو کسی عملِ پیدائش کا محرک ہوتا ہے، اور مذکورہ بالا تین عواملِ پیداوار جمع کر کے انہیں پیدائش کے عمل میں استعمال کرتا ہے اور نفع و نقصان کا خطرہ مول لیتا ہے۔ سرمایہ دارانہ نظریہ یہ ہے کہ موجودہ دور میں پیدائش کا عمل ان چار عوامل کی مشترک کارروائی کا نتیجہ ہوتا

ہے اگر چہ بعض اوقات یہ عوامل ایک ہی شخص کی ذات میں بھی جمع ہو جاتے ہیں یعنی وہی زمین فراہم کرتا ہے، وہی محنت کرتا ہے، اور وہی سرمایہ فراہم کرتا ہے۔ لیکن بڑے پیمانے کی صنعتوں میں عموماً یہ چاروں عوامل الگ الگ شخصیتوں میں ظاہر ہوتے ہیں۔ اور چونکہ پیداوار ان کے اشتراک سے عمل میں آتی ہے، لہٰذا حاصل شدہ پیداوار کے مستحق بھی یہی ہیں۔ چنانچہ تقسیمِ دولت کا سرمایہ دارانہ نظریہ یہ ہے کہ زمین کو لگان یا کرایہ (Rent) ملنا چاہیے، محنت کو اجرت (Wages)، سرمایہ کو سود (Interest) اور آجر کو نفع (Profit)۔ ان میں سے تقسیم کی پہلی تین مدات یعنی کرایہ، اجرت اور سود پہلے سے متعین ہوتی ہیں۔ اور ان کا تعین رسد و طلب کی بنیاد پر ہوتا ہے، جس کی تشریح پیچھے گزر چکی، البتہ تقسیم کی چوتھی مد یعنی منافع کاروبار شروع کرتے وقت متعین طور سے معلوم نہیں ہوتا، بلکہ اس کا تعین کاروبار کے نتیجہ خیز ہونے کے بعد ہوتا ہے۔ یعنی پہلی تین مدات میں دولت تقسیم کرنے کے بعد جو کچھ بچے، وہ آجر کا منافع ہوتا ہے۔

اشتراکی نظام میں پیدائش و تقسیم

اشتراکیت کا کہنا یہ ہے کہ حقیقتاً عواملِ پیداوار چار نہیں، بلکہ صرف دو ہیں۔ ایک زمین دوسرے محنت۔ انہی دونوں کے اشتراک سے پیداوار وجود میں آتی ہے۔ سرمایہ کو اس لئے عاملِ پیداوار نہیں کہہ سکتے کہ وہ خود کسی عملِ پیدائش کا نتیجہ ہوتا ہے اور آجر کو اس لئے مستقل عاملِ پیداوار قرار دینے کی ضرورت نہیں کہ اس کا عمل محنت میں داخل ہو سکتا ہے۔ دوسرے خطرہ مول لینے کی صفت کسی شخص یا پرائیوٹ ادارے میں تسلیم کرنے کی اس لئے ضرورت نہیں کہ یہ کام اشتراکی نظام میں حکومت کرتی ہے، افراد کو کاروباری مہم جوئی کی نہ اجازت ہے اور نہ ضرورت۔

چونکہ اشتراکی نظام میں حقیقی عاملِ پیداوار صرف زمین اور محنت ہیں، زمین کسی کی شخصی ملکیت نہیں ہوتی، اس لئے اس کو الگ سے معاوضہ دینے کی ضرورت نہیں۔ لہٰذا تقسیم دولت کی صرف ایک مدرہ جاتی ہے، اور وہ ہے اجرت، جس کا تعین سرکاری منصوبہ بندی کے تحت ہوتا ہے۔ کارل مارکس کا مشہور نظریہ یہ ہے کہ کسی چیز کی قدر میں اضافہ صرف محنت سے ہوتا ہے۔ اس لئے اجرت کا استحقاق صرف محنت کو ہے۔ سرمایہ کا سود، زمین کا لگان اور آجر کا نفع ایک فالتو چیز ہے، جسے مصنوعی طور پر پیدا کیا گیا ہے۔ اس نظریہ کو "قدر زائد کا نظریہ" (Theory of Surplus Value) کہا جاتا ہے۔ اور اس کا عربی نام "نظرية القدر" ہے۔

اسلامی تعلیمات

قرآن وسنت میں پیدائشِ دولت اور تقسیم دولت پر اس انداز سے تو گفتگو نہیں کی گئی، جس طرح کسی معاشیات کی کتاب میں کی جاتی ہے، لیکن معیشت کے مختلف ابواب میں قرآن وسنت نے جو احکام عطا فرمائے ہیں۔ ان پر غور کرنے سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ اسلام میں سرمایہ (Capetal) اور آجر (Entrepreneur) کی تفریق کو تسلیم نہیں کیا گیا۔ سرمایہ دارانہ نظام میں کاروبار کے نفع ونقصان کا خطرہ آجر پر ڈالا گیا ہے اور سرمایہ کو معین شرح سے سود دیا جاتا ہے۔ اسلام میں چونکہ سود حرام ہے۔ اس لئے نفع ونقصان کا خطرہ خود سرمائے پر عائد ہوتا ہے، لہٰذا ہر وہ شخص جو کاروبار میں سرمایہ کاری کر رہا ہو، اسے نفع کی امید کے ساتھ نقصان کا خطرہ مول لینا پڑے گا۔ اس طرح یا تو یوں کہا جائے کہ اسلامی تعلیمات کی رو سے اگر چہ سرمایہ اور آجر الگ الگ عاملِ پیدائش ہیں لیکن سرمایہ فراہم کرنے والا ہر فرد چونکہ خطرہ بھی لیتا ہے، اس لئے وہ جزوی یا کلی طور پر آجر بھی ہے، اور تقسیم دولت میں سرمائے اور آجر دونوں کا صلہ منافع ہے۔ یا یوں کہا جائے کہ سرمایہ اور آجر دو الگ الگ عامل پیداوار نہیں، بلکہ یہ ایک ہی عامل ہے اور تقسیم دولت میں اس کو منافع ملتا ہے بہر صورت جس طرح زمین کو کرایہ اور محنت کو معین اجرت دی جاتی ہے، اس طرح سرمائے کو معین سود نہیں دیا جاسکتا، سرمایہ دارانہ نظام میں سرمائے کو زمین پر قیاس کیا جاتا ہے کہ جس طرح زمین فراہم کر کے ایک شخص معین کرایہ وصول کر سکتا ہے اسی طرح سرمایہ فراہم کر کے معین سود بھی وصول کر سکتا ہے۔ لیکن اسلامی احکام کی رو سے یہ قیاس درست نہیں۔ صورتِ حال یہ ہے کہ زمین اور سرمائے میں مندرجہ ذیل تین وجوہ سے زبردست فرق پایا جاتا ہے۔

۱۔ زمین بذاتِ خود ایک قابلِ انتفاع چیز ہے، اس سے فائدہ اٹھانے کے لئے اسے خرچ کرنا نہیں پڑتا بلکہ اس کا وجود برقرار رکھتے ہوئے اسے عاملِ پیدائش کے طور پر بھی استعمال کیا جاسکتا ہے، اور اس سے دوسرے فوائد بھی حاصل کیے جاسکتے ہیں۔ لہٰذا اس کا کرایہ درحقیقت ان فوائد کا معاوضہ ہے جو زمین براہِ راست دے رہی ہے۔ اس کے برعکس سرمایہ یعنی روپیہ ایسی چیز ہے جو بذاتِ خود قابل انتفاع نہیں وہ اس وقت تک انسان کو فائدہ نہیں پہنچاتا جب تک اسے خرچ کر کے اس کے بدلے کوئی قابل انتفاع چیز خرید نہ لی جائے۔ لہٰذا جس نے کسی کو روپیہ فراہم کیا، اس نے کوئی ایسی چیز فراہم نہیں کی براہ راست قابل انتفاع ہو۔ لہٰذا اس پر کرایہ وصول کرنے کا سوال نہیں، کیونکہ کرایہ اس چیز کا ہوتا ہے جس سے اس کا وجود برقرار رکھتے ہوئے فائدہ اٹھایا جائے۔

۲۔ زمین، مشینری، آلات وغیرہ ایسی چیزیں ہیں کہ ان کے استعمال سے ان کی قدر میں کمی ہوتی ہے، اسی لئے ان چیزوں کو جتنا زیادہ استعمال کیا جائے گا، ان کی قدر اتنی ہی گھٹتی جائے گی۔ لہٰذا ان چیزوں کا جو کرایہ وصول کیا جاتا ہے اس میں قدر کے نقصان کی تلافی بھی شامل ہوتی ہے، اس کے برخلاف روپیہ ایسی چیز ہے کہ محض استعمال سے اس کی قدر میں کوئی کمی نہیں ہوتی۔

۳۔ اگر کوئی شخص کوئی زمین، مشینری یا سواری کرایہ پر لیتا ہے تو یہ چیزیں اس کے ضمان (Risk) میں نہیں ہوتیں، بلکہ اصل مالک کے ضمان میں رہتی ہیں۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ اگر یہ چیزیں کرایہ دار کی کسی غفلت یا زیادتی کے بغیر کسی سماوی آفت کے نتیجے میں تباہ ہو جائیں یا چوری ہو جائیں تو نقصان کرایہ دار کا نہیں، بلکہ اصل مالک کا ہوگا اور چونکہ اصل مالک ان کی تباہی کا خطرہ برداشت کر رہا ہے اور کرایہ دار کو اس خطرہ سے آزاد کر کے اپنی ملکیت کے استعمال کا حق دے رہا ہے، اس لئے وہ ایک معین کرایہ کا بجا طور پر حق دار ہے۔ اس کے برعکس جو شخص کسی کو روپیہ قرض دے رہا ہے، وہ روپیہ اس کے ضمان (Risk) میں نہیں رہتا، بلکہ قرض دار کے ضمان میں چلا جاتا ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ قرض دار کے قبضے میں جانے کے بعد اگر وہ روپیہ کسی سماوی آفت سے تباہ ہو جائے، یا چوری ہو جائے تو نقصان قرض دینے والے کا نہیں، قرض لینے والے کا ہے۔ یعنی قرض دار شخص اس صورت میں بھی اتنا روپیہ قرض خواہ پر لوٹانے کا ذمہ دار اور پابند ہے اور چونکہ قرض دینے والے نے قرض دے کر اس روپیہ کا کوئی خطرہ مول نہیں لیا، اس لئے وہ اس پر کسی معاوضے کا حقدار نہیں۔

اس تشریح کی روشنی میں تقسیم دولت کے اسلامی اصول کا سرمایہ دارانہ اصول سے ایک بنیادی فرق تو یہ ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام میں سرمائے کو معین شرح سے سود دیا جاتا ہے جبکہ اسلام میں سرمایہ کا حق منافع ہے، جو اسے اسی وقت ملے گا جب وہ نقصان کا خطرہ بھی برداشت کرے۔ یعنی کاروبار کے نفع و نقصان دونوں میں شریک ہو، جس کا طریقہ شرکت یا مضاربت ہے۔

اور دوسرا بنیادی فرق یہ ہے کہ سرمایہ داری ہو یا اشتراکیت، دونوں نظاموں میں دولت کا استحقاق صرف ان عاملینِ پیدائش کی حد تک محدود رکھا گیا ہے، جنہوں نے عملِ پیدائش میں ظاہری طور پر براہِ راست حصہ لیا۔ لیکن اسلام کی تعلیمات کا خلاصہ یہ ہے کہ ہر چیز پر حقیقی ملکیت اللہ تعالیٰ کی ہے اور ہر چیز کی پیدائش کا اصل کارنامہ اللہ تعالیٰ ہی انجام دیتے ہیں۔ جن کی توفیق کے بغیر کوئی عاملِ پیدائش ایک ذرّہ بھی وجود میں نہیں لا سکتا، لہٰذا کوئی بھی عامل پیدائش بذاتہ آمدنی کا مالک اور مستحق نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ جس کو مستحق قرار دیں گے وہی مستحق ہوگا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اگرچہ آمدنی کا اولین مستحق تو عوامل پیدائش ہی کو قرار دیا ہے، لیکن دولت کے ثانوی مستحقین کی ایک طویل فہرست

رکھی ہے، جو پیدا شدہ دولت میں اسی طرح حقدار ہیں جس طرح خود عوامل پیدائش۔ یہ ثانوی مستحقین معاشرے کے وہ افراد ہیں، جو اگرچہ قلتِ وسائل کی وجہ سے اس عمل میں براہ راست حصہ نہیں لے سکے۔ لیکن اسی انسانی معاشرے کا فرد ہونے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی پیدا کی ہوئی دولت میں ان کا بھی حصہ ہے۔ ان ثانوی مستحقین تک دولت پہنچانے کے لئے اسلام نے زکوۃ، عشر، صدقات، خراج، کفارات، قربانی اور وراثت کے احکام دیئے ہیں۔ جن کے ذریعہ دولت کا بڑا حصہ ان ثانوی مستحقین تک پہنچ جاتا ہے۔ دولت کے اوّلین مستحق یعنی عوامل پیداوار، آمدنی خواہ کرائے کی صورت میں حاصل ہوئی ہو یا اجرت کی صورت میں منافع کی صورت میں، ان میں سے ہر شخص اس بات کا پابند ہے کہ وہ اپنی آمدنی میں سے ایک معتد بہ حصہ ان ثانوی مستحقین تک پہنچائے اور یہ اس کی طرف سے کوئی احسان نہیں، بلکہ اس کے ذمے ان کا حق ہے۔ چنانچہ قرآن کریم نے ارشاد فرمایا:

"وفی اموالهم حق معلوم O للسائل و المحروم O"

''اور ان کے مالوں میں محتاج اور محروم کا معین حق ہے''

اسی طرح زرعی پیداوار کے بارے میں ارشاد فرمایا:

"واتوا حقه یوم حصاده"

''اور کھیتی کٹنے کے دن اس کا حق ادا کرو''

پیدائشِ دولت پر تینوں نظاموں کے مجموعی اثرات

یہ تھا اشتراکیت، سرمایہ اور اسلام کی معاشی تعلیمات کا ایک مختصر تعارف۔ تینوں نظاموں میں معیشت پر مجموعی حیثیت سے کیا اثرات مرتب ہوتے ہیں، یہ ایک بہت طویل الذیل موضوع ہے جس کی طرف یہاں محض اشارہ ہی کیا جا سکتا ہے۔ جہاں تک پیدائش دولت کا تعلق ہے تو پیچھے یہ بتایا جا چکا ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام میں ذاتی منافع کے محرک کو بالکل آزاد چھوڑنے کے نتیجے میں کیا خرابیاں پیدا ہوئیں؟ یہ خرابیاں معاشی بھی ہیں اور اخلاقی بھی۔ اشتراکیت نے ذاتی منافع کے محرک کو بالکل ختم کر دیا۔ جس کے نتیجے میں پیداوار کی کمیت (Quantity) اور کیفیت (Quality) دونوں میں کمی آئی کیونکہ اشتراکیت میں ہر کام کرنے والے کو طے شدہ اجرت ہی ملتی ہے تو اس کو اس کام سے ذاتی دلچسپی نہیں ہوتی جو اسے کارکردگی بہتر بنانے پر آمادہ کرتی۔ اس کا تھوڑا سا اندازہ آپ اس بات سے کر سکتے ہیں کہ پاکستان میں ایک مرتبہ مختلف صنعتوں کو قومی ملکیت میں لے لیا گیا تھا اور یہ اسی اشتراکی پروپیگنڈے کا نتیجہ تھا۔ سالہا سال کے تجربے کے بعد قومی ملکیت میں لئے گئے ادارے مسلسل انحطاط

پذیر پر ہے۔ جس کے نتیجے میں بالآخر اب انہیں دوبارہ ذاتی ملکیت میں دیا جارہا ہے۔ جس کے لئے آج کل نج کاری (Privatization) کی اصطلاح استعمال ہو رہی ہے۔

یہی حال روس میں ہوا کہ پیداوار کی کمیت اور کیفیت میں اتنا نقصان آیا کہ ملک دیوالیہ ہونے کے قریب ہو گیا۔ سوویت یونین تو بعد میں شکست وریخت کا شکار ہوا، لیکن اس سے کئی سال پہلے جب سوویت یونین کے حکمران کمیونزم کو سنبھالا دینے کی کوشش کر رہے تھے۔ اس وقت سوویت یونین کے صدر میخائل گورباچوف نے ملک کی تعمیر نو کا پروگرام اپنی کتاب پیرس ٹرائیکا (Perestroica) میں پیش کیا تھا۔ اس کتاب میں اس نے کمیونزم کی براہ راست تردید نہیں کی تھی، لیکن اس بات پر زور دیا کہ اشتراکیت کی نئی تشریح کی ضرورت ہے اور اس نئی تشریح میں اس بات کا بار بار اعتراف کیا کہ اب ہمیں اپنی معیشت از سرنو تعمیر کرنے کے لئے بازار کی قوتوں (Market Forces) سے ضرور کام لینا پڑے گا۔

اسلام نے ایک طرف ذاتی منافع کے محرک کو تسلیم کیا، جو پیداوار کی کمیت اور کیفیت میں اضافے کا موجب ہوتا ہے، لیکن دوسری طرف اس پر وہ پابندیاں عائد کر دیں جو اسے ان معاشی اور اخلاقی خرابیوں سے باز رکھ سکے جو سرمایہ دارانہ نظام کا لازمی خاصہ ہے۔ اس کے علاوہ سرمایہ دارانہ نظام میں سود کی اجازت کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ کسی کاروبار کو سرمایہ فراہم کرنے والا کاروبار کی بہبود سے قطعی لاتعلق رہتا ہے، اس کو اس سے غرض نہیں ہوتی کہ کاروبار کو فائدہ ہوا یا نقصان، کیونکہ اس کو ہر صورت میں معین شرح سے سود ملنا ہے۔ اس کے برخلاف اسلام میں چونکہ سود حرام ہے، اس لئے کسی کاروبار کو سرمایہ فراہم کرنے (Financing) کی بنیاد شرکت اور مضاربت پر ہی ہو سکتی ہے۔ اس صورت میں سرمایہ فراہم کرنے والے کی پوری خواہش اور کوشش یہ ہوگی کہ جس کاروبار میں اس نے سرمایہ لگایا ہے' وہ ترقی کرے، اور نفع حاصل ہو، ظاہر ہے کہ اس سے پیدائشِ دولت پر بہتر اثرات قائم ہوں گے۔

تقسیم دولت پر تینوں نظاموں کے اثرات

جہاں تک تقسیم دولت کا تعلق ہے' اشتراکیت نے ابتداءً یہ دعویٰ کیا تھا کہ منصوبہ بند معیشت میں آمدنی کی مساوات قائم ہوگی، جس کا مطلب یہ تھا کہ تمام افراد کو برابر آمدنی ملے۔ لیکن یہ محض ایک نظریاتی خواب تھا اور بعد میں نہ صرف یہ کہ عملاً کبھی مساوات قائم نہیں ہوئی، بلکہ نظریاتی طور پر بھی مساوات کا دعویٰ واپس لے لیا گیا۔ اور وہاں بھی اجرتوں کے درمیان شدید تفاوت قائم ہوا۔ چونکہ

اجرتوں کا تعین تمام تر حکومت کرتی تھی، اس لئے اس تعین میں ایک عام مزدور کو کوئی دخل نہیں تھا اور اگر اس کو اجرت کا یہ تعین غیر منصفانہ محسوس ہوتا تو اس کے خلاف چارہ جوئی کی بھی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ سرمایہ دارانہ نظام میں کم از کم یہ ہوتا ہے کہ اگر مزدور اپنی اجرت بڑھوانا چاہیں تو اس کے لئے نہ صرف یہ کہ آواز بلند کر سکتے ہیں بلکہ احتجاج کے دوسرے ذرائع مثلاً ہڑتال وغیرہ بھی اختیار کر سکتے ہیں۔ لیکن اشتراکی نظامِ سیاست میں اس قسم کی آواز بلند کرنے یا احتجاج کے ذرائع اختیار کرنے کی بھی کوئی گنجائش نہیں۔ اس لئے عملاً اشتراکی نظام میں مزدور کو کوئی خاص فائدہ نہیں پہنچا، بلکہ آخر میں نتیجہ یہی نکلا کہ اشتراکی ممالک کے محنت کشوں کا معیارِ زندگی سرمایہ دارانہ نظام کے مزدور سے بھی کم تر رہا۔ اور بالآخر لوگوں نے تنگ آ کر پھر اسی سرمایہ دارانہ نظام کا خیر مقدم کیا جس سے وہ نکل کر بھاگے تھے۔ یہ نتائج ان ملکوں میں زیادہ واضح طور پر مشاہدے میں آئے، جہاں ایک ہی ملک کا کچھ حصہ اشتراکیت کے زیر اثر تھا اور دوسرا حصہ سرمایہ دارانہ نظام کے زیر اثر تھا۔ مثلاً مشرقی اور مغربی جرمنی، مغربی جرمنی ترقی کرتا ہوا کہیں سے کہیں پہنچ گیا اور مشرقی جرمنی اس کے مقابلے میں بہت پیچھے رہا۔ وہاں کے مزدوروں کی حالت بھی مغربی جرمنی کے مقابلے میں پسماندہ رہی۔ یہاں تک کہ لوگوں نے تنگ آ کر دیوار برلن توڑ دی، اور اشتراکیت کی ناکامی کا عملاً اعتراف کر لیا۔ لیکن اس کا مطلب نہیں کہ سرمایہ دارانہ نظام میں تقسیم دولت واقعتاً منصفانہ تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام کی جن خرابیوں کے ردِّعمل کے طور پر اشتراکیت وجود میں آئی تھی وہ بڑی حد تک اب بھی برقرار ہیں۔ ذاتی منافع کے محرک کو بے لگام چھوڑنے سے اجارہ داریاں اب بھی وجود میں آتی ہیں۔ سود، قمار، اور سٹے کا بازار اب بھی گرم ہے، جس کے نتیجے میں ہزارہا عوام کی دولت کھنچ کھنچ کر چند افراد کے ہاتھوں میں سمٹتی رہتی ہے، اور عوام کے سفلی جذبات کو برانگیختہ کر کے ان سے پیسے کھینچنے کا عمل اب بھی جاری ہے، بہت سے سرمایہ دار ممالک میں ایسے لاکھوں افراد اب بھی موجود ہیں جن کے پاس سر چھپانے کو گھر نہیں اور سردیوں کی راتوں میں زیرِ زمین ریلوے اسٹیشنوں میں پناہ لیتے ہیں۔

اس صورت حال کی بہت بڑی ذمہ داری سود، قمار اور سٹے پر عائد ہوتی ہے۔ قمار اور سٹے میں تو یہ بات واضح ہے کہ ان کے ذریعہ بہت سے افراد کا سرمایہ کھنچ کھنچ کر اسی ایک شخص کی جیب پر ہن برسا دیتا ہے، لیکن سود کے نتیجے میں تقسیم دولت میں جو ناہمواری پیدا ہوتی ہے، اس کی طرف عام طور سے توجہ نہیں دی جاتی، حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ سود بہرصورت تقسیم دولت کے توازن میں بگاڑ پیدا کرتا ہے، کیونکہ جو شخص کسی دوسرے سے قرض لیکر کاروبار کرتا ہے، اگر اسے کاروبار میں نقصان ہو تو قرض دینے والا بہرصورت اپنے سود کا مطالبہ جاری رکھتا ہے، بلکہ سود در سود ہو کر اس کی واجب الادا رقم کہیں

سے کہیں پہنچ جاتی ہے۔ اس طرح قرض لینے والا سراسر نقصان میں ہے اور قرض دینے والا سراسر فائدہ میں۔ دوسری طرف جو بڑے سرمایہ دار بینکوں سے بھاری رقمیں لے کر بڑے پیمانے کے کاروبار کرتے ہیں ان کو اپنے اس کاروبار میں نفع ہوتا ہے، اس کا وہ بہت تھوڑا حصہ سود کی شکل میں بینک کے واسطے سے امانت دار عوام کو منتقل کرتے ہیں۔ باقی سارا نفع خود رکھتے ہیں اور اس طرح دونوں صورتوں میں تقسیم دولت غیر متوازن ہوتی ہے۔

اس کو ایک سادہ سی مثال سے سمجھنے کی ضرورت ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام میں بکثرت ایسا ہوتا ہے کہ ایک شخص نے اپنی جیب سے دس لاکھ روپے کسی کاروبار میں لگائے اور نوے لاکھ روپے بینک سے قرض لے لئے۔ اور اس طرح ایک کروڑ روپے سے تجارت کی۔ جب اتنی بھاری رقم سے تجارت کی جائے گی تو اس پر نفع کی شرح بھی بہت زیادہ ہوگی۔ فرض کیجئے کہ کاروبار میں پچاس فیصد نفع ہوا اور کروڑ کے ڈیڑھ کروڑ بن گئے، تو یہ سرمایہ دار پچاس لاکھ کے نفع سے صرف پندرہ لاکھ روپے سود کے طور پر بینک کو دے گا، جس میں سے بینک اپنا نفع رکھ کر بمشکل دس یا بارہ لاکھ روپے ان سینکڑوں عوام میں تقسیم کرے گا جن کی امانتیں اس کے پاس جمع ہیں، جس کا خالص نتیجہ یہ ہے کہ اس کاروبار میں جن سینکڑوں افراد نے نوے لاکھ روپے کا سرمایہ لگایا تھا، اور انہی کے سرمایہ نے درحقیقت اتنے بھاری نفع کو ممکن بنایا، ان میں تو دس بارہ لاکھ روپے تقسیم ہوئے اور جس سرمایہ دار نے دس لاکھ کی سرمایہ کاری کی تھی، اسے کاروبار کے نفع کی صورت میں پینتیس لاکھ روپے ملے۔ پھر دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ پندرہ لاکھ روپے جو بینک کو دیے گئے اور بینک کے واسطے سے عوام تک پہنچے، ان کو سرمایہ دار اپنی مصنوعات کی لاگت میں شامل کرتا ہے، اور جو بالآخر اس کی جیب پر نہیں پڑتے بلکہ عام صارفین کی جیب پر پڑتے ہیں، کیونکہ اس کاروبار میں اس نے جو مصنوعات تیار کیں ان کی قیمت مقرر کرتے وقت بینک کو دیئے ہوئے سود کی رقم بھی قیمت میں شامل کرتا ہے اور اس طرح درحقیقت اس کی اپنی جیب سے کچھ خرچ نہیں ہوا اور اگر کاروبار میں کسی سماوی آفت یا کسی حادثے وغیرہ کی وجہ سے نقصان ہونے لگے تو اس کی تلافی انشورنس کمپنی کے ذریعہ کرالی جاتی ہے اور اس انشورنس کمپنی میں بھی ان ہزار ہا عوام کا پیسہ جمع رہتا ہے جو ماہ بماہ یا سال بسال اپنی کمائی کا ایک حصہ یہاں جمع کراتے رہتے ہیں، لیکن نہ ان کے کسی تجارتی مرکز کو آگ لگتی ہے اور نہ کوئی اور حادثہ پیش آتا ہے۔ اس لئے عموماً پیسے جمع ہی کراتے ہیں، نکلوانے کی نوبت کم آتی ہے۔

دوسری طرف اگر اس قسم کے بہت سے سرمایہ دار کسی بھاری نقصان کی وجہ سے بینک کو قرضے واپس نہ کر سکیں، اور اس کے نتیجے میں بینک دیوالیہ ہو جائے، تو اس صورت میں ان سرمایہ داروں کی تو

بہت کم رقم گئی، نقصان سارا ان امانت داروں کا ہوا جن کے پیسے کے بل سرمایہ دار کاروبار کرتے ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ سود کے اس نظام کی وجہ سے پوری قوم کے سرمائے کو چند بڑے سرمایہ دار اپنے مفاد کے لئے استعمال کرتے ہیں اور اس کے بدلے میں قوم کو بہت تھوڑا سا حصہ واپس کرتے ہیں اور یہ تھوڑا حصہ بھی اشیاء کی لاگت میں شامل کرکے دوبارہ عام صارفین ہی سے وصول کر لیتے ہیں اور اپنے نقصان کی تلافی بھی عوام کی بچتوں سے کرتے ہیں اور اس طرح سود کا مجموعی رخ اس طرف رہتا ہے کہ عوام کی بچتوں کا کاروباری فائدہ زیادہ تر بڑے سرمایہ داروں کو پہنچے، اور عوام اس سے کم سے کم مستفید ہوں، اس طرح دولت کے بہاؤ کا رخ ہمیشہ اوپر کی طرف رہتا ہے۔

افسوس یہ ہے کہ جب سے دنیا میں صنعتی انقلاب برپا ہوا، اس وقت سے کوئی ملک ایسی مثال پیش نہیں کرسکا جہاں صنعت اور تجارت کی ترقی کے ساتھ ساتھ اسلام کے معاشی احکام بھی پوری طرح نافذ ہوں۔ اس لئے کسی عملی نمونے کے حوالے سے یہ بات نہیں کہی جاسکتی کہ اسلام کی تعلیمات پر عمل کرنے سے تقسیم دولت میں کس طرح توازن پیدا ہوتا ہے۔ لیکن خالص نظریاتی نقطۂ نظر سے غور کیا جائے تو اس نتیجے تک پہنچنے میں دیر نہیں لگے گی کہ اسلامی تعلیمات پر عمل کی صورت میں دولت کی تقسیم سرمایہ دارانہ نظام کے مقابلے میں کہیں زیادہ متوازن ہوگی۔ اگر حرمتِ سود کے مسئلے ہی کو لیا جائے تو اس سے بھی یہ بات واضح ہوسکتی ہے۔ کیونکہ سود کے ممنوع ہونے کے بعد کسی کاروبار کو سرمایہ کی فراہمی نفع نقصان میں شرکت کی بنیاد ہی پر ہوسکتی ہے۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اگر روپیہ لینے والے کو نقصان ہوا تو اس میں روپیہ دینے والا بھی شریک ہوگا۔ اور اگر نفع ہوا ہے تو روپیہ دینے والا اس نفع کے فیصد حصے کا حق دار ہوگا۔ لہٰذا مذکورہ بالا مثال میں اگر سرمایہ دار نے بینک سے نوے لاکھ روپے لیتے وقت شرکت یا مضاربت کی بنیاد پر معاملہ کیا ہوا اور اس کے اور بینک کے درمیان اگر ساٹھ فیصد اور چالیس فیصد کا تناسب بھی طے ہوا ہو تو پچاس لاکھ کے منافع میں کم از کم بیس لاکھ روپے اسے بینک کو منتقل کرنے پڑیں گے اور بینک کو دیئے جانے والے نفع کا تعین چونکہ اشیاء کی فروختگی کے بعد ہوگا اس لئے اس کو اشیاء کی لاگت میں شامل کرکے قیمت کے ذریعہ عوام سے وصول نہیں کیا جاسکتا۔

پھر جو نفع اس طرح سرمایہ دار کو حاصل ہوگا، اس میں سے بھی زکوٰۃ اور صدقات وغیرہ کے ذریعہ ایک بڑا حصہ وہ غریب عوام کی طرف منتقل کرنے کا پابند اور ذمہ دار ہوگا۔ اس کا واضح نتیجہ یہ ہے کہ دولت کے بہاؤ کا رخ چند سرمایہ داروں کے بجائے ملک کے عام باشندوں کی طرف ہوگا۔ جن عوام کی بچتوں سے ملک کی صنعت وتجارت فروغ پا رہی ہے، اس کے منافع میں وہ زیادہ بہتر شرح سے حصہ دار ہوں گے۔

ہمارا معاشی نظام

ہمارا معاشی نظام

کسی قوم کی معاشی حالت کو بہتر اس وقت کہا جا سکتا ہے جب اس کے تمام افراد کو زندگی کی تمام ضروریات فارغ البالی اور سکون واطمینان کے ساتھ میسر ہوں، ملک کی پیداوار اور آمدنی اگر زیادہ ہو تو ملک کے تمام باشندے اس کی برکات سے مستفید ہوں، اور کسی کو تقسیم دولت کے معاملے میں کسی ناانصافی کی جائز شکایت نہ ہو۔ اس کے برخلاف اگر ملک کی ساری دولت چند ہاتھوں میں سمٹ کر رہ جائے اور قوم کی اکثریت بھوک اور افلاس کا رونا رو رہی ہو، امیروں کے خزانے میں دولت کے انبار پر انبار لگتے چلے جائیں اور محنت کش عوام کی جیب سے ان کے گاڑھے پسینے کی کمائی کا ایک ایک پیسہ سرک کر ختم ہو جائے تو خواہ ملک کی زمینیں سونا اگل رہی ہوں، یا مشینوں سے لعل و جواہر برآمد ہو رہے ہوں۔ اسے ملک کی معاشی ترقی نہیں کہا جا سکتا، یہ وہ اجتماعی دیوالیہ پن ہے جس کی موجودگی میں کسی قوم کے پنپنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

یہ ہماری شومی اعمال ہے کہ ہمارے ملک کی معاشی صورت حال کچھ ایسی ہی بن کر رہ گئی ہے، اوپر اوپر سے دیکھئے تو ہم نے گذشتہ ۲۶ سالوں میں زراعت صنعت اور تجارت کے ہر میدان میں خاصی ترقی کی ہے، لیکن افراد کی نجی زندگی کا مطالعہ کیجئے تو معلوم ہوگا کہ ملک کی دولت صرف چند خاندانوں میں محدود ہو کر رہ گئی، اس سے عام آدمی کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا، وہ اپنا پیٹ بھرنے کے لئے پہلے سے زیادہ سرگرداں ہے، دولت کی چمک دمک اس کے غم کدے میں کوئی اجالا نہیں کر سکی، اس کے شب و روز پہلے سے زیادہ سختیوں کا شکار ہیں۔

مغرب کی بے جا تقلید

ایسا کیوں ہوا؟ ــــــ اس کا جواب بالکل واضح ہے، ہمارے یہاں عرصہ دراز سے نیم جاگیردارانہ اور نیم سرمایہ دارانہ نظام اپنی بدترین صورت میں رائج ہے، مغرب کی دو سو سالہ محکومی نے ہمارے دل و دماغ کو کچھ ایسے سانچے میں ڈھال دیا ہے کہ ہم اپنے مسائل کو آزادی کے ساتھ سوچنے کی بجائے آنکھیں بند کر کے اسی ڈگر پر چل رہے ہیں جو مغرب نے ہمیں دکھا دی تھی، زندگی کے دوسرے گوشوں کی طرح ہم نے اپنی معیشت کو بھی ان ہی بنیادوں پر تعمیر کیا ہے جن پر ہمارے

سرمایہ دار ''حاکم'' نے اپنے معاشرے کو تعمیر کیا تھا، ظاہر ہے کہ اس صورت میں ہمیں اس بے چینی کے سوا کیا مل سکتا ہے جو سرمایہ دارانہ نظام کے لئے مقدر ہو چکی ہے۔

ناقص شعور کی بیداری

سالہا سال تک اس طرز معیشت کو آزمانے کے بعد اب یہ شعور تو بحمد اللہ پیدا ہونے لگا ہے کہ یہ راستہ ترقی کا نہیں تباہی کا ہے، ہم میں سے بیشتر لوگ اب یہ سوچنے پر مجبور ہیں کہ ہماری معاشی ناہمواریوں کی ذمہ داری موجودہ سرمایہ دارانہ اور جاگیری نظام پر عائد ہوتی ہے، لیکن افسوس یہ ہے کہ ابھی ذہن مغرب کے فکری تسلط سے اتنے آزاد نہیں ہوئے کہ اس کی فکری کج روی کو آزما کر خود اپنے ذہن سے کوئی متبادل راستہ تلاش کرنے کی کوشش کریں، اس کے بجائے ہو یہ رہا ہے کہ سرمایہ داری کی مشکلات کا حل تلاش کرنے کے لئے بھی مغرب ہی کا رخ کرتے ہیں اور کسی حل کو قبول کرنے پر آمادہ نہیں ہوتے جو مغرب کی فکری مشینری میں نہ ڈھلا ہو۔

چنانچہ آج ہم میں سے ایک طبقہ بڑے زور شور سے ''سوشلزم'' اور ''اشتراکیت'' کے نعرے لگا رہا ہے۔ حالانکہ اشتراکیت بھی مغرب کی اسی مادی تہذیب کی پیداوار ہے جس نے سرمایہ داری کو جنم دیا تھا۔ حقیقت میں انسان کی معاشی مشکلات کا حل نہ اس کے پاس تھا نہ اس کے پاس ہے، وہ اگر افراط تھی تو یہ تفریط ہے۔ مزدور اور کسان اگر سرمایہ داری میں مظلوم اور مقہور تھے تو اشتراکی نظام میں بھی وہ کچھ کم بے بس نہیں ـــــ!

سرمایہ دارانہ نظام کی بنیاد

سرمایہ دارانہ نظام کی بنیاد اس تصور پر تھی کہ انسان ''سرمایہ'' کا خود مختار مالک ہے، روزمرہ کی ضرورت کے علاوہ ذرائع پیداوار پر بھی اس کی ملکیت بے قید اور آزاد ہے، وہ جس طرح چاہے انہیں استعمال کرے، جس کام میں چاہے انہیں لگائے جس طریقے سے چاہے ان سے نفع حاصل کرے، اپنے تیار شدہ مال کی جو چاہے قیمت مقرر کرے، جتنے آدمیوں سے جن شرائط پر چاہے کام لے، غرض اپنے کاروبار کے بارے میں اسے کھلی آزادی ہے، اور ریاست اس کی ملکیت میں دخل اندازی نہیں کر سکتی۔ اگرچہ رفتہ رفتہ مختلف تجربات سے دو چار ہونے کے بعد اس آزاد ملکیت پر تھوڑی تھوڑی پابندیاں عائد کر دی گئیں، لیکن یہ تصور اب بھی پوری طرح برقرار ہے کہ انسان سرمایہ کا ''مالک'' ہے اور چند قانونی حد بندیوں سے قطع نظر، سرمایہ سے سرمایہ پیدا کرنے کا ہر طریقہ اس کے لئے جائز ہے،

اسی تصور کی بنیاد پر سود، قمار، سٹہ اور اکتناز کو اس نظام میں شیرِ مادر سمجھ لیا گیا ہے، اور یہ چیزیں اس نظام کے عناصرِ اربعہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔

اس نظام کے جو نتائجِ بد دنیا نے دیکھے، اور اب تک دیکھ رہی ہے وہ یہ ہیں کہ معاشرے میں دولت کی گردش نہایت ناہموار اور غیر متوازن ہوتی چلی جاتی ہے، سرمایہ دار سود، قمار، سٹہ اور اکتناز کے ذریعہ چاروں طرف ہاتھ مار کر روپیہ اپنے دامن میں سمیٹ لیتا ہے اور دولت کے اس ذخیرہ کے بل پر پورے بازاروں کا حکمران بن بیٹھتا ہے، قیمتوں کو مصنوعی طور پر چڑھایا جاتا ہے، اور غیر ضروری بلکہ مضر اشیاء کو زبردستی معاشرے پر ٹھونسنے کے لئے ان کی فراوانی کر دی جاتی ہے، اور قوم کی حقیقی ضروریات کا مصنوعی قحط پیدا کر دیا جاتا ہے، یہاں تک کہ اس نظام میں بارہا یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ عین اس وقت جب کہ معاشرے کے سینکڑوں افراد بھوک سے بے تاب ہوتے ہیں، غلے اور اشیائے خوردونوش کے لدے ہوئے جہاز جان بوجھ کر غرق کر دیے جاتے ہیں، ان کے ذخیروں کو آگ لگا دی جاتی ہے تا کہ یہ اشیاء افراط کے ساتھ بازار میں آ کر سستے داموں ضرورت مند افراد تک نہ پہنچ سکیں، اور قیمتوں کا جو معیار سرمایہ دار نے مقرر کر لیا ہے، اس میں کوئی کمی نہ ہونے پائے۔

ظاہر ہے کہ سرمایہ دار کی اس کاروباری آنکھ مچولی میں ایک عام آدمی کو پنپنے کا موقع نہیں مل سکتا، اس کی آمدنی محدود اور اخراجات زیادہ ہوتے چلے جاتے ہیں، اور اس کی زندگی چند گنے چنے افراد کے ذاتی مفادات کے تابع ہو کر رہ جاتی ہے، دولت کے اس سمٹاؤ کا اثر پوری قوم کی صرف معیشت ہی پر نہیں، بلکہ اخلاق و کردار اور طرزِ فکر و عمل پر بھی پڑتا ہے، اور ملکی و بین الاقوامی سیاست بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی۔

اشتراکیت میدان میں آئی تو سرمایہ دارانہ نظام کی ان خرابیوں کو دیکھا، لیکن مرض کے اسباب کی ٹھنڈے دل و دماغ سے تشخیص نہ کر سکی اور معاملہ کی دوسری انتہا پر جا کھڑی ہوئی، سرمایہ داری نے کہا تھا کہ انسان بحیثیت فرد ذرائع پیداوار کا ''مالک'' ہے، اشتراکیت نے کہا کہ کوئی فرد کسی ذریعہ پیداوار کا مالک نہیں، زمینوں اور کارخانوں کو جاگیردار اور سرمایہ دار کے تصرف سے نکال دو تو وہ بانس ہی نہ رہے گا جس سے ظالم کی بانسری بجتی ہے۔ اس کی عملی شکل یہ تجویز کی گئی کہ محنت کش عوام کے انتخاب سے ایک کمیٹی بناؤ، اور ملک کی تمام زمینیں اور ساری بنیادی صنعتیں انفرادی ملکیت سے نکال کر اس کے حوالے کر دو، یہ پارٹی ایک حکومت کی تشکیل کر کے ایک منصوبہ بند معیشت (PLANNED ECONOMY) کی بنیاد ڈالے گی، وہی یہ فیصلہ کرے گی کہ کیا چیز پیدا کرنی ہے؟ پھر وہی محنت کش عوام کو مختلف کاموں میں لگا کر پیداوار حاصل کرے گی اور وہ ہی اس حاصل شدہ پیداوار کو محنت

کرنے والوں کے درمیان ایک خاص تناسب سے تقسیم کرے گی۔

اشتراکی نظام میں غریب کی مشکلات

یہ تجویز بڑے زور شور کے ساتھ پیش کی گئی اور کہا گیا کہ اس طریق کار میں مزدور اور کسان کے ہر دکھ کا علاج ہے۔ لیکن نتائج پر غور کیجئے تو اس نظام معیشت نے نہ صرف یہ کہ کچھ نئی مشکلات کھڑی کر دیں، بلکہ مزدور کی پرانی مصیبتیں بھی تقریباً اسی طرح برقرار ہیں۔

تھوڑی دیر کے لئے اس بات سے قطع نظر کر لیجئے کہ اس تجویز کو عملی طور سے نافذ کرنے میں کتنی مشکلات ہیں؟ اس بحث کو بھی جانے دیجئے کہ یہ نظام شدید ترین ڈکٹیٹر شپ کے بغیر نہیں چل سکتا، اس پہلو کو بھی کچھ دیر کے لئے چھوڑ دیجئے کہ اس سے بسا اوقات مزدور اور کسان کو اس کام پر مجبور ہونا پڑتا ہے جو وہ اپنی افتادِ طبع کے تحت نہیں کرنا چاہتا۔ اس واقعہ کو بھی بالائے طاق رکھئے کہ اس نظام میں ''جبری محنت'' اور ''بیگار کیمپ'' مزدور پر کیا ظلم ڈھاتے ہیں؟ اس بات کو بھی مت سوچئے کہ اس نظام میں مذہب و اخلاق کا کیا حشر ہوتا ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ اس نظام میں بھی ــــ جو خالص مزدور اور کسان ہی کے نام پر ابھرا ہے ــــ ملک کی دولت سے عام آدمی کو کتنا حصہ مل سکتا ہے؟ ظاہر ہے کہ حکومت کرنے والی یہ پارٹی جس میں محنت کش عوام کے بمشکل پانچ فیصد افراد شریک ہوتے ہیں کوئی فرشتوں کی جماعت تو نہیں ہوتی، اگر سرمایہ دارانہ نظام میں انفرادی سرمایہ دار کی نیت مزدور کے حق میں خراب ہو سکتی ہے تو اس پارٹی کی نیت کیوں خراب نہیں ہو سکتی؟ اگر ایک شخص بڑے کارخانے کا صرف مالک ہو کر اپنے زیردستوں پر ظلم ڈھا سکتا ہے تو یہ پارٹی ملک کی ساری زمینوں، سارے کارخانوں اور ساری دولت پر قابض ہو کر اپنے زیردستوں کے حقوق پر کیوں ڈاکہ نہیں ڈال سکتی۔

واقعہ یہ ہے کہ اس صورت میں چھوٹے چھوٹے سرمایہ دار تو بیشک ختم ہو جاتے ہیں، لیکن ان سب کی جگہ ایک بڑا سرمایہ دار وجود میں آ جاتا ہے جو دولت کی اس وسیع جھیل کو من مانے طریقہ سے استعمال کر سکتا ہے، چنانچہ پیداوار کا بہت تھوڑا حصہ محنت کش عوام میں تقسیم ہوتا ہے اور باقی ساری دولت حکمران جماعت کے رحم و کرم پر ہوتی ہے، بیرونی دنیا تو یہی دیکھتی ہے کہ اشتراکی ملک کی صنعت و تجارت دنیا پر چھا رہی ہے، وہاں مصنوعات اور ایجادات کی بہتات ہے اور وہاں کے مصنوعی سیارے ستاروں پر کمندیں ڈال رہے ہیں، لیکن اس بات کو سوچنے والے کم ہوتے ہیں کہ وہاں محنت کش عوام کو ان ترقیات کی کیا قیمت ادا کرنی پڑ رہی ہے اور دولت کے عظیم الشان ذخیروں میں سے انہیں کتنا حصہ مل رہا ہے؟ ورنہ حقیقت یہی ہے کہ جس طرح سرمایہ دار ممالک میں ''ترقی'' کا مطلب چند سرمایہ

داروں کی ترقی ہے، اسی طرح اشتراکی نظام میں بھی ''ترقی'' ایک خاص طبقے کی ''ترقی'' سے عبارت ہے۔ رہا بے چارہ عام مزدور اور کسان، سو وہ دونوں جگہ صرف اتنی اجرت کا مستحق ہوتا ہے جتنی اس کے ''آقا'' اسے دینا چاہیں۔ فرق اتنا ہے کہ وہاں اگر اسے اجرت کم محسوس ہوتی تھی تو وہ ہڑتال، احتجاج اور پیشے کی تبدیلی کے ذریعہ اپنے آنسو دھونے کی کوشش کر لیتا تھا، لیکن یہاں اسے اپنی کسی حق تلفی پر کراہنے کی بھی اجازت نہیں، شاعر مشرق علامہ اقبال مرحوم نے اسی لئے کہا تھا۔

زمامِ کار گر مزدور کے ہاتھوں میں ہو پھر کیا
طریقِ کوہکن میں بھی وہی حیلے ہیں پرویزی

اس کے برعکس اسلام کے عدل عمرانی کی شاہراہ سرمایہ داری اور اشتراکیت دونوں کے بیچ سے گذرتی ہے۔ اسلام کا کہنا یہ ہے کہ اس کائنات کی ہر چیز، خواہ زمین اور کارخانے کی شکل میں ہو، روپے پیسے اور اشیائے صرف کی شکل میں، اصل میں اس کائنات کے پیدا کرنے والے کی ملکیت میں ہے، قرآن کریم کا ارشاد ہے:

"للّٰہ ما فی السمٰوات وما فی الارض" (بقرہ)

''آسمانوں اور زمینوں میں جو کچھ ہے اللہ ہی کا ہے۔''

ہاں وہ اپنی یہ ملکیت نفع اٹھانے کے لئے اپنے بندوں کو دے دیتا ہے۔

"ان الارض للّٰہ یورثھا من یشاء من عبادہ" (الاعراف)

''بلاشبہ زمین اللہ کی ہے، وہ اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے اس کا مالک بنا دیتا ہے۔''

جب انسان کے ہاتھ میں ہر چیز اللہ کی دی ہوئی ہے تو ظاہر ہے کہ اس کا استعمال بھی اللہ کی مرضی کا پابند ہوگا۔ اس کے ذریعہ دوسرے پر ظلم ڈھا کر زمین میں فساد برپا کر دینا اللہ کو کسی طرح گوارہ نہیں، انسان کا کام یہ ہے کہ وہ دوسرے کا خون چوسنے کے بجائے اپنی اصل منزل مقصود یعنی آخرت کو پیش نظر رکھ کر دوسرے کے ساتھ حسن سلوک کرے۔

"وابتغ فیما اتاك اللّٰہ الدار الاخرۃ ولا تنس نصیبکم من الدنیا و احسن کما احسن اللّٰہ الیك ولا تبغ الفساد فی الارض" (قصص)

''اور اللہ نے تمہیں نے جو کچھ دیا اس کے ذریعہ تم دار آخرت (کی بھلائی) تلاش کرو جس طرح اللہ نے تم پر احسان کیا ہے تم دوسروں پر احسان کرو، اور زمین میں فساد پھیلانے کی کوشش نہ کرو''

ان ہدایات کا خلاصہ یہ ہے کہ انسان کو اللہ نے انفرادی طور سے ملکیت عطا تو کی ہے لیکن یہ ملکیت آزاد، خودمختار، خودغرض اور بے لگام نہیں بلکہ یہ اللہ کے دیئے ہوئے احکام کی پابند ہے، اس کو انسان اپنے جائز نفع کے لئے تو استعمال کرسکتا ہے، لیکن اس کے ذریعہ دوسروں کے حقوق پر ڈاکہ نہیں ڈال سکتا۔

سرمایہ دارانہ نظام کی جتنی خرابیوں اور اس کی جتنی ناانصافیوں پر آپ نظر ڈالیں گے، بنیادی طور سے ان کے چار ہی سبب نظر آئیں گے۔ سود، قمار، سٹہ اور اکتناز، سرمایہ دار ایک طرف تو سود، قمار اور سٹہ کے ذریعہ ساری قوم کی دولت کھینچ کھینچ کر اپنے دامن میں سمیٹ لیتا ہے، دوسری طرف اس کے کھانے میں کسی غریب، مفلس، اپاہج یا بے سہارا انسان پر لازمی طور سے کچھ خرچ کرنے کی کوئی مد نہیں، وہ خود اپنی شرافت سے کسی کو کچھ دے دے تو اس کا احسان ہے، اخراجات کی کوئی پابندی اس پر نہیں ہے۔

ناجائز ذرائع کی بندش

اسلام نے اولاً تو آمدنی کے ناجائز ذرائع کا دروازہ بالکل بند کر دیا۔ سود، قمار، سٹہ کے ذریعہ دولت حاصل کرنے کو بدترین جرم قرار دے کر صاف صاف اعلان کر دیا کہ .

"یا ایھا الذین امنوا لا تاکلوا اموالکم بینکم الا ان تکون تجارةً عن تراض منکم"(بقرہ)

''اے ایمان والو! تم ایک دوسرے کے مال کو ناحق طریقہ سے مت کھاؤ، الّا یہ کہ تمہاری رضامندی سے کوئی تجارت ہو۔''

سود میں یہ ہوتا ہے کہ اگر کاروبار کرنے والے کو نقصان ہو جائے تو سارا نقصان اس پر پڑتا ہے اور قرض دینے والے کا سود ہر حال میں کھرا رہتا ہے اور اگر نفع ہو جائے تو سارا نفع وہ لے اڑتا ہے اور قرض دینے والے کو اس کا چالیسواں حصہ بھی مشکل سے ہاتھ آتا ہے، ظاہر ہے کہ اس طرح دولت پھیلنے کے بجائے سکڑتی ہے اور ہموار طریقے سے گردش نہیں کر سکتی۔ اسلام نے اس کے بجائے شراکت و مضاربت کی صورت تجویز کی ہے جس میں نفع ہو تو فریقین کا ہو، اور نقصان ہو تو وہ دونوں اسے برداشت کریں۔

قمار اور سٹہ میں ساری قوم کا تھوڑا تھوڑا روپیہ ایک جگہ ہو جاتا ہے، پھر ایک عام آدمی کا روپیہ یا تو اس جیسے ہزاروں غریب آدمیوں کی جیب سے ایک ایک روپیہ کھینچ کر اس کے پاس جمع کر دیتا ہے، یا

خود بھی کسی سرمایہ دار کی جیب میں جا گرتا ہے۔ غرض دونوں ہی صورتوں میں روپیہ سمٹتا ہے اور اس کی فطری گردش رک جاتی ہے، اسلام نے اس پر اور کاروبار کے ایسے تمام طریقوں پر پابندی بٹھا دی ہے جن میں ایک فریق کا فائدہ اور دوسرے کا نقصان ہو یا جس سے پورے معاشرے کی دولت ایک جگہ سمٹنے لگے۔

آمدنی کے ناجائز ذرائع پر پابندی لگانے کے علاوہ سرمایہ داروں سے غریبوں تک دولت پہنچانے کے لئے اسلام نے سرمایہ دار پر زکوۃ جیسے بہت سے اخراجات واجب کر دیئے ہیں جو اس کا احسان نہیں، بلکہ اس مال پر واجب ہونے والا حق ہے، جسے بزور قانون وصول کیا جا سکتا ہے، زکوۃ کے علاوہ عشر، خراج، صدقۂ فطر، قربانی، کفارات، نفقات، وصیت اور وراثت وہ چھوٹی بڑی مدات ہیں جن کے ذریعہ دولت کے تالاب سے چاروں طرف نہریں نکلتی ہیں اور ان سے پورے معاشرے کی کھیتی سرسبز و شاداب ہوتی ہے۔

ان قانونی پابندیوں کے ساتھ اسلام بحیثیت مجموعی جس ذہنیت کی تعمیر کرتا ہے، اس کی بنیاد سنگدلی، کنجوسی، بے رحمی اور خودغرضی کے بجائے ہمدردی، فراخ حوصلگی، سخاوت اور سب سے بڑھ کر خوفِ خدا اور فکرِ آخرت پر استوار ہوتی ہے۔ اس کے لئے یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ وہ اپنے ذمے عائد ہونے والے قانونی فرائض کی ادائیگی پر بس کر لے اور اس کے بعد دوسروں کے دکھ درد سے آنکھیں بند کر کے بیٹھ جائے، اس کو زندگی کے ہر مرحلہ پر تعلیم ہی یہ دی گئی ہے کہ یہ دنیا چند دنوں کی بہار ہے، عیش و مسرت روپے اور پیسے کے اس ڈھیر کا نام نہیں ہے جو یہاں جمع کر لیا جائے، بلکہ روح کے اس سکون اور ضمیر کے اس اطمینان کا نام ہے جو اپنے کسی بھائی کے چہرے پر خوش حالی کی مسکراہٹ دیکھ کر پیدا ہوتا ہے، اور جس سے آخرت کی آنے والی زندگی میں مسرتوں کے سدا بہار پھول کھلتے ہیں۔

چنانچہ قرآن و حدیث کو دیکھئے، ان کی تعلیمات ''انفاق فی سبیل اللہ'' کی ہدایت سے بھری پڑی ہیں، اور ان میں یہاں تک کہا گیا ہے کہ

"یسئلونك ماذا ینفقون قل العفو" (بقرہ)

''لوگ آپ سے پوچھتے ہیں کہ وہ کیا خرچ کریں، آپ فرما دیجئے جو ضرورت سے زائد ہو۔''

غرض ایک طرف سرمایہ دار کی آمدنی کی ناجائز مدات کو ختم کر کے اور دوسری طرف اس کے اخراجات میں اضافہ کر کے اسلام نے دولت کے بہاؤ کا رخ عام معاشرے کی طرف پھیر دیا ہے، افسوس ہے کہ آج کی دنیا میں یہ ساری باتیں نرا ''نظریہ'' ہو کر رہ گئی ہیں، اور عملی طور سے معیشت کا یہ

بے داغ اور صاف ستھرا نظام دنیا میں کہیں نافذ نہیں ہے، لیکن اگر اس نظام کے عملی نتائج دیکھنے ہوں تو تاریخِ اسلام کے ابتدائی دور کا مطالعہ کیجئے، جب صدقہ دینے والا ہاتھ میں روپیہ لے کر نکلا کرتا تھا تو کوئی اسے قبول کرنے پر تیار نہیں ہوتا تھا۔

ہماری زبوں حالی

اب ہماری شومئ اعمال ہے کہ اتنا پرامن وسکون نظام رکھنے کے باوجود شروع میں تو ہم نے اپنی معیشت کا نظام سرمایہ داری کے اصولوں پر بنایا۔ اب جب کہ اس کے نقصانات سامنے آرہے ہیں تو ہم میں سے بعض لوگوں نے ''اشتراکیت'' اور ''سوشلزم'' کی آوازیں بلند کرنی شروع کر دی ہیں۔ پہلے سرمایہ داری کی بدترین لعنتوں اور سود اور قمار وغیرہ کو اسلام کے مطابق ثابت کرنے کی کوشش میں قرآن وسنت کی تحریف کی جاتی تھی اب سوشلزم کو ''اسلامی'' بنانے کے لئے آیات واحادیث کی الٹی سیدھی تاویلیں کی جارہی ہیں، اور ذہن اگر نہیں چلتا تو اس طرف کہ مغربی افکار کی غلامی کو ایک مرتبہ دل سے نکال کر سیدھے سچے طریقے سے اسلامی اصولوں پر غور کر لیا جائے کہ وہ موجود معاشی مشکلات کا واقعی طور سے کیا حل پیش کرتے ہیں۔

جو حضرات غلط فہمی سے سرمایہ داری یا اشتراکیت کو اپنے لئے راہِ نجات سمجھ بیٹھے ہیں، ہم نہایت دردمندی کے ساتھ ان سے یہ گزارش کرتے ہیں کہ وہ کسی غیر اسلامی نظام میں اسلام کا پیوند لگانے کے بجائے ٹھنڈے دل ودماغ سے معقولیت کے ساتھ اسلامی احکام کو سمجھنے کی کوشش کریں، ایک آزاد اسلامی مملکت میں مسلمان کا حقیقی منصب یہ ہے کہ وہ پرائے شگون پر اپنی ناک کٹوانے کے بجائے نہ صرف خود اسلام کا نمونہ بنے بلکہ دنیا بھر کو دعوت دے کہ تم افراط وتفریط کی کس بھول بھلیوں میں پھنس گئے ہو، انسانیت کی فلاح کی منزل اس راستے پر چلے بغیر ہاتھ نہیں آسکتی جو چودہ سو سال پہلے انسانیت کے محسن اعظم محمد مصطفیٰ ﷺ نے دکھا دیا تھا۔

بمصطفیٰؐ برساں خویش راہ کہ دیں ہمہ اوست
اگر باو نہ رسیدی، تمام بولہبی است

❁❁❁

اسلامی نظام کے تحت معاشی اصلاحات

یہ مقالہ والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مدظلہم کا ہے جو سب سے پہلے البلاغ کے اداریہ پھر کتابی شکل میں شائع ہوا، پھر اسی مقالے کی تجاویز ۱۸ علماء کی طرف سے حکومت کو پیش ہوئیں۔

اسلامی نظام کے تحت معاشی اصلاحات

آج کل یہ سوال عام ہے کہ سرمایہ داری اور سوشلزم کے مقابلے میں معاشی نظام جس کو پوری انسانیت کیلئے امن و اطمینان کا ضامن بتلایا جاتا ہے، وہ نظام کیا ہے؟ اور اس کے ذریعہ ملکی معیشت کے مسلئے کس طرح حل ہو سکتے ہیں؟

اس سوال کے جواب میں اصل بات تو یہ ہے کہ اسلام کا معاشی نظام کوئی خالص نظری فلسفہ نہیں ہے جسے کبھی دنیا نے عملی زندگی میں دیکھا اور برتا نہ ہو، بلکہ یہ نظام سینکڑوں سال تک دنیا میں عملی طور پر نافذ رہا، اور اس کی یہ برکتیں ہر دور اور ہر ملک میں ہر شخص نے مشاہدہ کی ہیں کہ جب کسی جگہ یہ نظام رائج ہوا وہاں ان معاشی ناانصافیوں کا نام ونشان نہیں تھا، وہاں مزدور اور سرمایہ دار کی کوئی تفریق نہیں تھی، سب ایک ہی برادری کے افراد تھے اور ایک دوسرے کے ساتھ ہمدردانہ تعاون کرتے تھے، وہاں مزدور اور کسان حقیر و ذلیل نہیں تھا، اس کی ایسی ہی عزت کی جاتی جیسی برادری کے دوسرے افراد کی، وہاں صنعت اور تجارت پر اجارہ داریاں نہیں تھیں جن کی وجہ سے ملک کی دولت بڑے سرمایہ داروں کے لیے مخصوص ہو کر رہ جائے وہاں ان تمام دروازوں کو بند کر دیا گیا تھا جن کی وجہ سے ''بڑے لوگ'' اشیاء صرف کی قیمتوں پر حاکم بن کر بیٹھ جائیں گرانی غریبوں کی کمر توڑتی رہے اور غریب عوام مصنوعی قحط کا شکار ہو کر جائیں۔

پھر یہ نظام ایسا بھی نہیں ہے کہ سینہ بہ سینہ ہی چلا آیا ہو۔ اس کی تفصیلات پر ہزاروں کتابیں موجود ہیں، علم فقہ کی کتابوں کا ایک بڑا حصہ اسلام کے معاشی قوانین ہی پر مشتمل ہے، اور بہت سے لوگوں نے ان احکام کو قانونی دفعات کی شکل میں بھی مدوّن کر دیا ہے، مگر اس کا علاج کس کے پاس ہے کہ ہم مسلمان خود اپنے دین کو پڑھنے اور سمجھنے کے لئے اپنے وقت اور توانائی کا ہزارواں حصہ بھی خرچ نہ کریں، کبھی قرآن، حدیث اور فقہ کو سنجیدگی کے ساتھ نہ پڑھیں، اور جب کوئی شخص ''اسلام کے معاشی نظام'' کا نام لے تو اس کے بارے میں یہ سمجھنا شروع کر دیں کہ یہ کوئی نئی اصطلاح ہے جس کا نہ کوئی مفہوم ہے، اور نہ ماضی میں اس کا کوئی عملی وجود قائم ہوا ہے۔ یہی صورتِ حال ہے جس نے اس وقت یہ سوال کھڑا کیا ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام اور سوشلزم دونوں کے مقابلے میں جس اسلامی نظام کو علماء دین سب سے بہتر کہتے ہیں وہ آخر ہے کیا؟

اس کا مکمل جواب تو یہی ہے کہ اسلامی فقہ کی کتابیں پڑھئے، ہر ہر جز کی تفصیلات سامنے آجائیں گی، لیکن یہ معلوم ہے کہ فی الوقت یہ کوئی خالص علمی حیثیت کا سوال نہیں جس کو فرصت کے اوقات میں حل کیا جاسکے، بلکہ یہ ملک کے ہنگامی حالات کا پیدا کیا ہوا سوال ہے جس کا مختصر جواب جلد سامنے آجانا چاہئے۔ چنانچہ ہم ذیل میں نمونہ کے طور پر اسلام کے معاشی نظام کی چند بنیادی خصوصیات پیش کررہے ہیں جن سے یہ اندازہ ہوسکے گا کہ اگر ہمارے ملک میں صحیح اسلامی نظام رائج ہوتو اپنی معیشت کے موجودہ ڈھانچے میں ہمیں کون سی بنیادی تبدیلیاں کرنی ہوں گی؟ تقسیم دولت کے موجودہ نظام پر اس کے کیا اثرات مرتب ہوں گے؟ اوران کے ذریعہ عام خوشحالی کی فضا کیوں کر پیدا ہوسکے گی؟

اس وقت ہمارا سب سے بڑا معاشی مسئلہ دولت کی غیر منصفانہ تقسیم ہے، عوام کی سب سے اہم اور معقول شکایت یہ ہے کہ ملک کی معاشی ترقی سے چند خاندان نہال ہورہے ہیں، اور عام آدمی فقر وافلاس کا شکار ہے، سرمایہ دارانہ نظام کی ستائی ہوئی دنیا کو اس مصیبت سے نجات دلانے کے لئے آج کل ''سوشلزم'' کا نسخہ پیش کیا جارہا ہے، لیکن ہم دعوے کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ اس صورتِ حال کا علاج سوشلزم کے پاس نہیں ہے، اور یہ علاج صرف اور صرف اسلام کے پاس ہے۔

غور کیا جائے تو ہمارے معاشرے میں عام آدمی کی معاشی پریشانی کے بنیادی طور پر دو سبب ہیں، آمدنی کی کمی اور گرانی کی وجہ سے اخراجات کی زیادتی۔ اوران دونوں اسباب کی ذمہ داری ہماری معیشت کے اس سرمایہ دارانہ نظام پر عائد ہوتی ہے جس نے پوری قوم کی دولت کو چند ہاتھوں میں سمیٹ کر رکھ دیا ہے۔ اسلامی کا نظامِ معیشت نافذ ہوتو مندرجہ ذیل اقدامات کے ذریعہ یہ دونوں چیزیں ساتھ ساتھ ختم ہوتی چلی جائیں گی۔

۱۔ صنعتی اجارہ داریوں کا خاتمہ

صنعتی اجارہ داریاں جو کارٹیل وغیرہ کی شکل میں رائج ہیں، ان سب کو ممنوع قرار دے کر آزاد مسابقت کی فضا پیدا کی جائے تا کہ ناجائز منافع خوری کا انسداد ہوسکے۔ اس وقت ان صنعتی اجارہ داریوں کی وجہ سے پورا بازار چند بڑے بڑے سرمایہ داروں کے ہاتھ میں ہے، اور وہی قیمتوں کے نظام کو اپنی طبعی رفتار سے ہٹا کر گرانی پیدا کرنے کے ذمہ دار ہیں۔ اگر یہ اجارہ داریاں ٹوٹ جائیں تو منافع کی جو زائد مقدار سرمایہ داروں کے پاس جارہی ہے اس سے عوام مستفید ہوسکیں گے۔

۲۔ کلیدی صنعتوں میں غریبوں کے حصص

کلیدی صنعتیں مثلاً ریلوے، جہاز رانی، جہاز سازی، فولاد سازی، تیل وغیرہ کی صنعتیں حکومت خود اپنی نگرانی میں قائم کرے اور ان میں صرف ان لوگوں کے حصص قبول کیے جائیں جن کی آمدنی ایک ہزار روپے ماہانہ سے کم ہو، یا جن کا بینک بیلنس پانچ ہزار روپے سے کم ہو، اور اب تک اس قسم کی صنعتوں میں اس سے زائد آمدنی یا بینک بیلنس والے جن افراد کے حصص ہیں، ان کے ساتھ سال کے ختم پر شراکت کا معاہدہ فسخ کر دیا جائے۔

یہ طریقہ صنعتوں کو قومی ملکیت میں لینے سے کہیں زیادہ مفید ہوگا۔ اس لئے کہ صنعتوں کے قومی ملکیت میں چلے جانے سے صنعتیں غریبوں کی ملکیت میں نہیں آتیں، بلکہ ان پر سرکاری افسروں کا تسلط قائم ہو جاتا ہے، اس کے بجائے اس صورت میں غریب عوام براہِ راست صنعتوں کے مالک ہوں گے اور ان پر نہ سرمایہ داروں کا تسلط ہوگا نہ حکومت کا۔

۳۔ سودی نظام کا خاتمہ

سود ارتکازِ دولت کا سب سے بڑا سبب ہے، قوم کے لاکھوں افراد کے مجتمع سرمایہ سے جو نفع حاصل ہوتا ہے اس سودی نظام کی وجہ سے سارا کا سارا ان چند سرمایہ داروں کی جیب میں چلا جاتا ہے جو بینک سے لاکھوں روپیہ قرض لے کر بڑی بڑی تجارتیں کرتے ہیں اور عوام کو نہایت معمولی سی رقم سود کی شکل میں ملتی ہے۔ اور چونکہ سرمایہ دار نفع کی اتنی بھاری مقدار حاصل کر کے بازار کے حکمران بن جاتے ہیں، اور جب چاہتے ہیں مصنوعی قحط اور گرانی پیدا کر دیتے ہیں، اس لئے یہ معمولی سی رقم بھی بالآخر مزید کچھ سود لے کر ان ہی سرمایہ داروں کے پاس پہنچ جاتی ہے۔ مثلاً کراچی میں روئی کی لاکھوں گانٹھیں آتی ہیں، اور یہ ساری گانٹھیں صرف چند تاجر خریدتے ہیں جن کو بینک کی پشت پناہی حاصل ہوتی ہے۔ اپنے روپے سے گانٹھوں کا کاروبار کرنے والا ایک بھی نہیں ہے۔

اسلامی نظام قائم ہو تو یہ ظالمانہ نظام ختم ہو کر بینکاری کا نظام سود کے بجائے شرکت اور مضاربت کے اصولوں پر چلایا جائے گا جس کے نتیجے میں بینک میں روپیہ جمع کرنے والے عوام بینک کے جمع شدہ سرمائے کے نفع میں شریک ہوں گے اور اس سے دوطرفہ فائدے ہوں گے۔ ایک طرف بازار پر چند افراد کا تسلط ختم ہوگا اور اس سے ارزانی پیدا ہوگی، دوسری طرف منافع کے حصے دار بہت زیادہ ہوں گے اور بڑی بڑی تجارتوں کا متناسب منافع بینکوں کے واسطے سے عوام تک پہنچے گا۔ اور

دولت زیادہ سے زیادہ وسیع دائروں میں گردش کرے گی۔

بینکاری کے نظام کو سود کے بجائے شرکت اور مضاربت کے اصولوں پر چلانے کی عملی شکل کیا ہوگی؟ اس کی تفصیلات متعدد علمی حلقوں کی طرف سے بار بار شائع ہو چکی ہیں اور بینکاری کے ماہرین نے انہیں قطعی طور پر قابل عمل اور زیادہ مفید قرار دیا ہے۔

۴۔ سٹہ بازی کی ممانعت

اشیاء کی گرانی اور سرمایہ کے ارتکاز کا دوسرا بڑا سبب ہمارے معاشرے میں ''سٹہ'' کی اندھی تجارت ہے، سٹہ کی مفصل خرابیاں بیان کرنے کے لئے تو ایک مستقل مقالہ چاہئے، ایک مختصر مثال یہ ہے کہ اس کاروبار کی وجہ سے مال کے ذخیرے ابھی بازار کے قریب بھی نہیں آنے پاتے کہ اس پر سینکڑوں سودے ہو جاتے ہیں، ایک تاجر مال کا آرڈر دے کر مال کی روانگی سے پہلے ہی اسے دوسرے کے ہاتھ بیچ دیتا ہے۔ دوسرا تیسرے کے ہاتھ اور تیسرا چوتھے کے ہاتھ۔ یہاں تک کہ جس وقت مال بازار میں پہنچتا ہے تو وہ بعض اوقات خرید و فروخت کے سینکڑوں معاملات سے گزر چکا ہوتا ہے۔ اور اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ بازار تک پہنچتے پہنچتے اس کے دام کہیں سے کہیں پہنچ جاتے ہیں، بیس روپیہ کی چیز پچاس ساٹھ روپے میں بکتی ہے۔ یہ سارا نفع سٹہ باز لے اڑتے ہیں اور عوام کی جیب خالی ہوتی چلی جاتی ہے۔ اسلامی نظام میں اس اندھے کاروبار کی گنجائش نہیں، اسلام میں مال کے قبضے سے پہلے اسے بیچنا ناجائز ہے، لہٰذا اسلامی نظام قائم ہوا تو سٹہ کا یہ سارا کاروبار ممنوع ہو جائے گا جس سے اشیائے صرف لازمی طور پر سستی ہوں گی اور منافع کی زائد مقدار جو اس اندھے کاروبار کی وجہ سے چند سرمایہ داروں کے ہاتھ میں کھیلتی ہے اس سے غریب عوام مستفید ہو سکیں گے۔

۵۔ قمار (انشورنس وغیرہ) کی مروجہ صورتوں کا سدباب

ہمارے موجودہ نظام معیشت میں ارتکازِ دولت کا تیسرا سبب ''قمار'' ہے، انشورنس کا پورا نظام اسی پر قائم ہے، اس کے علاوہ گھوڑوں کی ریس، معمہ بازیاں، انواع و اقسام کی لاٹریاں، کھیل تماشوں کے سیزن ٹکٹ، یہ سب قمار کی وہ ہلاکت آفرین اقسام ہیں جن کی زد سب سے زیادہ غریب عوام پر پڑتی ہے، اور ان کے ذریعہ غریب عوام کی کمائی کا ایک ایک روپیہ جمع ہو کر کسی ایک فرد پر ہن برسا دیتا ہے اور باقی سب لوگ دیکھتے رہ جاتے ہیں، اسلامی حکومت میں قمار کی یہ تمام صورتیں ممنوع ہوں گی، اور عوام کو بے وقوف بنانے کے یہ دروازے بند ہو جائیں گے۔

انشورنس کے موجود نظام میں انشورنس کمپنیوں کے جمع شدہ سرمائے سے سب سے زیادہ فائدہ بڑے بڑے سرمایہ داروں کو پہنچتا ہے جو آئے دن مختلف حادثات کے بہانے رقمیں وصول کرتے رہتے ہیں، غریبوں کو اس سے فائدہ اٹھانے کی نوبت بہت کم آتی ہے۔ گویا اس طریقے سے بڑے بڑے سرمایہ دار اپنے جانی و مالی نقصان کی ذمہ داری بھی ان غریب عوام پر ڈال دیتے ہیں جن کا نہ کبھی کوئی جہاز ڈوبتا ہے، نہ ان کے کسی تجارتی مرکز کو آگ لگتی ہے اس طریقے کو بدل کر اسلامی حکومت ''امداد باہمی'' کی ایسی انجمنیں قائم کرے گی جو سود اور قمار سے خالی ہوں اور جن سے غریب عوام زیادہ بہتر طریقے سے مستفید ہو سکیں گے۔ (اس کی عملی اسکیمیں بھی علماء کی طرف سے شائع کی جا چکی ہیں)

٦۔ ذخیرہ اندازی کی سزا

ذخیرہ اندوزی اور چور بازاری پر بدنی تعزیرات مقرر کی جائیں گی اور ذخیرہ اندوزوں کو اپنے ذخائر بازار میں لانے پر مجبور کیا جائے گا۔

٧۔ لائسنس اور پرمٹ کے مروّجہ طریقہ کی اصلاح

لائسنس اور پرمٹ کا مروجہ طریقہ بھی تجارتی اجارہ داریوں کے قیام میں بہت بڑا معاون ہوتا ہے، آج کل یہ ہو رہا ہے کہ صرف بڑے سرمایہ داروں کو سیاسی رشوت کے اور خویش پروری کے طور پر بڑے بڑے لائسنس دیے جاتے ہیں جس کے نتیجے میں صنعت و تجارت پر ان کی خود غرضانہ اجارہ داری قائم ہو جاتی ہے۔ ایک طرف تو گرانی بڑھتی ہے، دوسری طرف تھوڑے سرمایہ والوں کے لئے بازار میں آنے کا راستہ بند ہو جاتا ہے۔ اگر تجارت کو اس ظالمانہ طریق سے آزاد کر دیا جائے تو اشیائے صرف خود بخود سستی ہو جائیں گی اور ایک عام آدمی بھی معمولی سرمایہ کے ذریعہ تجارت و صنعت میں داخل ہو سکے گا۔ اور آج کا مزدور کل کارخانہ دار بن سکے گا۔

٨۔ تنخواہوں کے نظام کی درستی

موجود نظام میں تنخواہوں کا معیار نہایت غیر منصفانہ اور مختلف درجات کا باہمی تفاوت بہت زیادہ ہے، اس تفاوت کو کم کر کے مناسب سطح پر لایا جائے گا۔

۹۔ اجرتوں کا نامناسب تعین

ہمارے یہاں مزدوروں کی اجرت کی سطح بہت پست ہے، ایک اندازے کے مطابق مغربی پاکستان میں پانچ افراد پر مشتمل ایک اوسط درجے کے خاندان کا کم از کم خرچ دوسوبیس روپے ہے اور مشرقی پاکستان میں دوسو ساٹھ روپے لیکن اجرتوں کا معیار اس کے مقابلے میں کہیں زیادہ پست ہے، پاکستان کے مختلف علاقوں اور مختلف صنعتوں میں کم از کم تنخواہ بہتر روپیہ سے لے کر ایک سوستر روپیہ تک رہی ہے، اور نئی لیبر پالیسی میں زائد سے زائد مقدار ایک سو چالیس روپیہ مقرر کی گئی ہے، لیکن بڑھتی ہوئی گرانی کے اس دور میں یہ تنخواہ بھی نا قابل اطمینان ہے، اور اس میں حقیقت پسندانہ اضافے کی ضرورت ہے۔ اسلامی حکومت کو اختیار ہے کہ وہ اجرتوں کی ایسی کم از کم شرح متعین کر دے جو مزدور کی مناسب محنت کا صلہ بھی ہو اور صنعتی نظام کے لئے قابل عمل بھی، اس کی تعیین کے لئے مزدوروں آجروں اور حکومت کے مساوی نمائندگان پر مشتمل اجرت بورڈ ہونا چاہئے جو بدلتے ہوئے حالات میں اجرتیں تبدیل کرنے کا مجاز ہو، کم از کم شرح متعین کرنے کے بعد اجرتوں کی مزید مقدار مزدوروں کی قوت معاملہ (BARAGNING POWER) پر چھوڑ دی جائے۔

۱۰۔ مزدوروں کا مالکانہ حقوق

آجروں کے ساتھ مزدوروں کے معاملے میں یہ شرط بھی حکومت کی طرف سے عائد کی جاسکتی ہے کہ وہ نقد اجرت کے علاوہ مزدوروں کو کسی خاص کارکردگی پر یا خاص مدت میں یا اوور ٹائم کی مخصوص مقدار کے معاوضے کے طور پر ان کو نقد بونس دینے کے بجائے کسی مخصوص کارخانے کے شیئرز مالکانہ حیثیت میں دے دیں۔ اس طرح مزدور کارخانوں میں حصہ دار بن سکیں گے۔ یہاں یہ بات واضح رہنی چاہئے کہ مزدوروں کی اجرت میں یہ اضافہ اسی صورت میں نتیجہ خیز ثابت ہوسکتا ہے جب کہ ان کے لئے صنعتی اجارہ داریوں کو توڑنے کے ساتھ ساتھ وہ اقدامات بھی کیے جائیں جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے ورنہ اجرتوں کی زیادتی سے قیمتیں بڑھ جائیں گی اور سرمایہ دار جو رقم ایک جانب سے مزدور کو دے گا وہ دوسری طرف سے وصول کر لے گا۔ اور مزدور کی مشکلات حل نہ ہوسکیں گی۔

۱۱۔ کسانوں کا مناسب معاوضہ

مزدوروں کی اجرت کی طرح اسلامی حکومت کو یہ بھی اختیار ہے کہ وہ کسانوں کے لئے بٹائی

کی ایسی کم از کم شرح متعین کر دے۔ جو کسانوں کی محنت کا مناسب صلہ بھی ہو اور ان کی ضروریاتِ زندگی کی معقول کفالت بھی کر سکے اس غرض کے لئے بھی ایک بورڈ قائم ہونا چاہئے۔

۱۲۔مزارعت کی ناجائز شرطیں

مزارعت (بٹائی) کے معاملات میں ظلم وستم زمینداروں کی طرف سے کسانوں پر ہوتے ہیں، ان کی اصل وجہ مزارعت (بٹائی) کا جواز نہیں، بلکہ وہ فاسد شرطیں ہیں جو زمیندار کسانوں کی بے چارگی سے فائدہ اٹھا کر ان پر قولی یا عملی طور سے عائد کر دیتے ہیں، اور جو اسلام کی رو سے قطعاً ناجائز اور حرام ہیں اور ان میں سے بہت سی بیگار کے حکم میں آتی ہیں۔ ایسی تمام شرائط کو، خواہ وہ زبانی طے کی جاتی ہوں یا رسم ورواج کے ذریعہ ان پر عمل چلا آتا ہو، قانوناً ممنوع قرار دے دیا جائے تو مزارعت کا معاملہ کسانوں کے حق میں بالکل بے ضرر ہو جائے گا۔

۱۳۔ظالمانہ رواج کا متبادل

مزارعت کے معاملے میں جس ظالمانہ رسم ورواج نے جکڑ لیا ہے اور جس کی وجہ سے کسانوں پر ناجائز شرطیں عائد کی جاتی ہیں، اگر اس پر فوری طور سے قابو پانا ممکن نہ ہو تو اسلامی حکومت کو یہ اختیار بھی حاصل ہے کہ وہ ایک عبوری دور کے لئے یہ اعلان کر دے کہ اب زمینیں بٹائی کے بجائے ٹھیکہ پر دی جائیں، یا یہ طریقہ تجویز کر دے کہ کاشتکار بٹائی کے بجائے مقررہ اجرت پر زمیندار کے لئے بحیثیت مزدور کام کریں گے۔ اس اجرت کی تعیین بھی حکومت کر سکتی ہے اور بڑے بڑے جاگیرداروں پر یہ شرط بھی عائد کر سکتی ہے کہ وہ ایک عبوری دور تک زمین کا کچھ حصہ سالانہ اجرت کے طور پر مزدور کاشتکاروں کو دیں گے۔

۱۴۔بنجر زمین کو آباد کرنے پر مالکانہ حقوق

احیاء اموات کے شرعی قوانین نافذ کیے جائیں، یعنی جو کاشت کار غیر مملوکہ غیر آباد زمینوں کو خود آباد کریں گے ان کو ان زمینوں پر مالکانہ حقوق دیئے جائیں، جو زمینیں جاگیرداروں کو آباد کرنے کے لئے دی گئیں، اور انہوں نے ان کو خود آباد کرنے کے بجائے کاشتکاروں کو بٹائی پر دے دیا تو وہ کاشتکاروں کی ملکیت ہو گئیں، کاشت کاروں کو ان پر مالکانہ حقوق دیئے جائیں اور پیداوار کا جو حصہ جاگیرداروں نے وصول کیا وہ واپس لیا جائے۔

۱۵۔ زمین رہن رکھنے کے سودی طریقوں کا خاتمہ

زمینوں کے رہن کے جتنے سودی طریقے رائج ہیں، ان سب کو یکسر ممنوع قرار دیا جائے گا۔ اور جو زمینیں اس وقت نا جائز طریقوں سے زیر بار ہیں ان سب کو چھڑا کر ان کے غریب اور مستحق مالکوں کو لوٹایا جائے۔ اس عرصے میں قرض خواہوں نے رہن زمین سے جو نفع اٹھایا ہے اس کا کرایہ ان کے ذمہ واجب ہے، اس کرائے کو قرض میں محسوب کیا جائے اور اگر کرایہ کی رقم قرض سے زیادہ ہو تو وصول کر کے قرض دار کو دلوائی جائے۔

۱۶۔ وراثت کی شرعی تقسیم

ہمارے یہاں بڑی بڑی جاگیروں کے ارتکاز کی بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ بہت سی زمینوں میں سالہا سال سے وراثت جاری نہیں ہوئی۔ اسلامی حکومت ایسی زمینوں کی تحقیق کیلئے بھی ایک بورڈ قائم کرے جو ایسی زمینوں کو ان کے شرعی مستحقین میں تقسیم کرے۔ اگر اسلام کا قانون وراثت صحیح طریقے سے جاری ہو تو ایک ہاتھ میں بڑی بڑی جاگیریں جمع ہونے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔

۱۷۔ انتقالِ جائیداد کو آسان بنانا

انتقالِ جائیداد کے طریقوں کو سہل بنایا جائے اور زمینوں کی آزادانہ خرید وفروخت کی حوصلہ افزائی کی جائے۔

۱۸۔ کاشکاروں کیلئے غیر سودی قرضوں کا انتظام

کاشکاروں کے لئے حکومت کی طرف سے غیر سودی قرضوں کا انتظام کیا جائے۔

۱۹۔ کاشتکاروں کو زرعی آلات مہیا کرنا اور تعلیم دینا

کاشت کاروں کے لئے آسان قسطوں پر زرعی آلات مہیا کیے جائیں اور زراعت کی بہتر تعلیم وتربیت کا انتظام کیا جائے۔

۲۰۔آلات اور اسباب کی فراہمی

زرعی امدادِ باہمی کی تحریک میں ایسی باہمی کاشت کے طریقے کو فروغ دیا جائے جس میں کھاد، بیج، اور آلات کی فراہمی انجمن کے ماتحت ہو۔

۲۱۔زرعی پیداوار کی فروخت کیلئے آزاد منڈی کا قیام

ہمارے معاشرے میں زرعی پیداوار کی فروخت اتنے واسطوں سے ہو کر گذرتی ہے کہ ہر درمیانی مرحلے پر قیمت کا حصہ تقسیم ہوتا چلا جاتا ہے، آڑھتیوں، دلالوں اور اس طرح کے دوسرے درمیانی اشخاص (MIDDLE MEN) کی بہتات سے دوطرفہ نقصان ہوتے ہیں، ایک طرف کاشتکاروں کو پیداوار کا مناسب معاوضہ نہیں مل پاتا اور دوسری طرف بازار میں گرانی پیدا ہوتی ہے۔ اسی لئے احادیث کی رو سے اسلام میں دیہی کاشتکار اور شہری خوردہ فروش کے درمیانی واسطوں کو پسند نہیں کیا گیا۔ اسلامی نظام میں موجودہ طریقے کو بدل کر یا تو ایسے منظم بازار (Organised Masleites) کافی تعداد میں قائم کیے جائیں جن میں دیہی کاشت کار خود بلاواسطہ پیداوار کو فروخت کر سکیں، یا پھر فروخت پیداوار کا کام لینے کے لئے آڑھتیوں اور دلالوں سے کام لینے کے بجائے امداد باہمی کی ایسی انجمنیں قائم کی جائیں جو خود کاشت کاروں پر مشتمل ہوں اور یہ انجمنیں پیداوار فروخت کریں، تاکہ قیمت کا جو بڑا حصہ درمیانی اشخاص کے پاس چلا جاتا ہے اس سے کاشت کار اور عام صارفین فائدہ اٹھا سکیں۔

۲۲۔اسلام کے قانونِ کفالت کا نفاذ

نفقات کے بارے میں اسلامی قانون کو تمام وکمال نافذ کیا جائے اور بیوی بچوں کے علاوہ جن خاص خاص رشتہ داروں کی معاشی کفالت اسلام نے خاندان کے کشادہ دست افراد پر ڈالی ہے اس کو قانونی شکل دے کر یتیموں، بیواؤں، بیماروں اور اپاہجوں کے معاش کا بندوبست کیا جائے۔

۲۳۔زکوۃ وعشر کی وصولی کا انتظام

زکوۃ کی نگرانی کے لئے مستقل محکمہ قائم کیا جائے جو مندرجہ ذیل کام کرے:۔

الف) قیام پاکستان سے لے کر اب تک جن سرمایہ داروں نے زکوۃ ادا نہیں کی ہے، ان سے زکوۃ

وصول کر کے غریبوں میں تقسیم کرنے کا انتظام کرے۔

(ب) ہر سال مویشیوں کی زکوۃ وصول کر کے اسے غریبوں میں تقسیم کرے۔

(ج) سونے چاندی کی سالانہ زکوۃ اور زرعی پیداوار کا عشر مالکان خود ادا کریں گے، لیکن یہ محکمہ اس بات کی نگرانی کرے کہ انہوں نے زکوۃ اور عشر ادا کیا ہے یا نہیں؟

۲۴۔ روزگار کی فراہمی

ملک کے ہر باشندے کے لئے روزگار فراہم کرنا بھی حکومت کی ذمہ داری ہے اور کوشش کے باوجود جو افراد بے روزگار رہ جائیں ان کے لئے روزگار کی فراہمی تک ''بیروزگاری الاؤنس'' جاری کیے جائیں۔

۲۵۔ فلاحی فنڈ کا قیام

حکومت کی طرف سے ایک ''فلاحی فنڈ'' قائم کیا جائے اور اس فنڈ کے لئے سالانہ بجٹ میں مستقل رقم رکھی جائے اور عام چندوں کے ذریعہ بھی اس رقم میں اضافہ کیا جائے۔ اس فنڈ کے ذریعہ بھاری صنعتیں بھی قائم کی جاسکتی ہیں تا کہ اس رقم کے ذریعہ ملکی صنعت کو فروغ بھی ہو اور ان کے منافع سے ''فنڈ'' میں اضافہ بھی ہوتا رہے۔ اس فنڈ کے ذریعہ عام غریبوں، مزدوروں اور کسانوں کی رہائش کا معیار بلند کرنے کے لئے آسان قسطوں پر متوسط درجے کے مکانات تعمیر کیے جائیں، کثیر تعداد میں مفت شفاخانے قائم کیے جائیں، بتدریج میٹرک تک کی تعلیم مفت کی جائے۔ اور عوام کی معاشی حالت بہتر بنانے کے لئے دوسرے اقدامات کیے جائیں۔

۲۶۔ اسراف سے بچنے کیلئے اخراجات کی مناسب حد بندی

کسی قوم کی معاشی حالت محض پیسوں کی کثرت سے نہیں سدھر سکتی جب تک وہ بیہودہ یا مخرب اخلاق چیزوں میں پیسہ خرچ کرنے سے اور ضرورت کے کاموں میں اسراف بیجا سے پرہیز نہ کرے۔ یوں تو فضول خرچی انفرادی ملکیتوں میں بھی حرام اور ناجائز ہے، لیکن جو رقم کسی شخص کی انفرادی ملکیت نہ ہو اس میں فضول خرچی کی حرمت اور زیادہ شدید ہو جاتی ہے، لیکن ہمارے معاشرے میں سب سے زیادہ فضول خرچی قومی خزانے میں ہوتی ہے۔

ہر سال خزانے کا بلا مبالغہ کروڑوں روپیہ شاہانہ تقریبات، سرکاری دوروں، سرکاری عمارتوں

کے سامانِ تعیش اور زینت و آرائش کے بہانے قطعی بے فائدہ اور فضول خرچ ہوتا ہے، ان خراجات کو قطعی طور پر بند کرنا تو ممکن نہیں، لیکن ان مقاصد کے لئے جس بے دردی کے ساتھ قومی روپیہ بہایا جاتا ہے، اس کا کوئی شرعی، عقلی اور معاشی جواز نہیں ہے، بسا اوقات ایک ایک دعوت پر ایک ایک لاکھ روپیہ خرچ کیا گیا ہے۔ اور اگر حساب لگایا جائے تو قیام پاکستان کے بعد سے اب تک یقیناً اربوں روپیہ ان فضول خرچیوں میں صرف ہوا ہے۔ اسلامی نظام میں قومی دولت کے اس ضیاع کی کوئی گنجائش نہیں۔ لہٰذا تقریبات اور سرکاری دوروں کے لئے اخراجات کی مناسب حد مقرر کر کے اس کی سختی کے ساتھ پابندی کرائی جائے، اور اس طرح جو خطیر رقمیں بچیں انہیں "فلاحی فنڈ" میں داخل کیا جائے۔

۲۷۔ حرام اشیاء کی درآمد پر پابندی

قومی دولت کی ایک بہت بڑی مقدار آج کل ان مقاصد پر صرف ہو رہی ہے جو شرعی طور پر حرام اور ناجائز ہیں، مثلاً شراب، فلموں اور دوسری حرام اشیاء کی درآمد پر کروڑوں روپیہ سالانہ خرچ ہوتا ہے زرمبادلہ کے اس زبردست نقصان کو بالکلیہ بند کیا جائے اور اس خطیر رقم کو عوامی فلاح کے کاموں میں صرف کیا جائے۔ غیر مسلموں کو شراب استعمال کرنے کی اجازت ہوگی لیکن درآمد کرنے کی نہیں۔

۲۸۔ خاندانی منصوبہ بندی کے لئے رقم کا ضیاع

خاندانی منصوبہ بندی کی خالص احمقانہ تحریک نے بھی ہماری معیشت کو نقصان پہنچایا ہے، تیسرے پنج سالہ منصوبے میں اس تحریک کے فروغ کے لئے ۲۸۴ ملین روپیہ کی رقم مخصوص کی گئی ہے جب کہ یہ بات پوری طرح ثابت ہو چکی ہے کہ خاندانی منصوبہ بندی شرعی، عقلی، سماجی، معاشی غرض ہر اعتبار سے پاکستانی عوام کے لئے ناقابل قبول ہے۔ اس صورت میں قومی دولت کا اتنا بڑا حصہ اس پر صرف کرنے کے بجائے زراعت کی ترقی اور کاشت کاروں کی پیداوار بڑھانے پر صرف کیا جائے۔

انتظامیہ کی اصلاح

قانون اور رواج میں مذکورہ بالا اصلاحات کے علاوہ ہمیں اپنے انتظامی ڈھانچے میں بڑے پیمانے پر تبدیلیاں لانے کی ضرورت ہے، ہمارے معاشرے میں استحصال کا ایک بڑا سبب انتظامی خرابیاں بھی ہیں۔ بہت سے معاملات ایسے ہیں جن میں ہمارا قانون بالکل درست ہے اور اگر اس پر ٹھیک ٹھیک عمل ہو تو ان خاص معاملات میں انصاف حاصل ہو سکتا ہے۔ لیکن ہماری انتظامی مشینری اس

قدر ناقص، از کار رفتہ، سست اور ڈھیلی ڈھالی ہے کہ قانون صرف کتابوں کی زینت ہو کر رہ گیا ہے اور عملی زندگی میں اس کا کوئی وجود نظر نہیں آتا، ظاہر ہے کہ اگر انتظامیہ کی صورت حال یہ ہو تو ملک کا قانون کتنا ہی بے داغ کیوں نہ ہو، اس کے اچھے نتائج سامنے نہیں آسکتے۔ لہٰذا معاشرے کی اصلاح کے لئے انتظامیہ کو ایمان دار، مضبوط، فعال اور قابو یافتہ بنانا قانون کے مؤثر ہونے کے لئے بے انتہا ضروری ہے۔

ہمارے موجودہ انتظامی ڈھانچے میں کیا کیا خرابیاں ہیں؟ اور انہیں کس طرح دور کیا جا سکتا ہے؟ یہ باتیں مکمل طور سے تو انتظامیہ (ADMINISTRATION) کے ماہرین ہی بتا سکتے ہیں، اور قوم کی تعمیر نو کے وقت ان ہی کی خدمات سے انتظامیہ کی اصلاح کی جا سکے گی، لیکن ہم یہاں چند سامنے کی مثالیں پیش کرتے ہیں جن سے یہ معلوم ہو سکے گا کہ نظم وضبط کی ابتری کس بری طرح ہمارے عوام کے لئے معاشی انصاف کے حصول میں رکاوٹ بنی ہوئی ہے۔

ا۔ رشوت ستانی کا سدباب

''رشوت'' ایک ایسا جرم ہے جو شاید کسی بھی نظام حیات میں جائز نہ ہو، ہمارا قانون بھی اسے ناجائز قرار دیتا ہے لیکن ملک کی جیتی جاگتی زندگی میں آکر دیکھئے تو وہی رشوت جسے قانون میں بدترین جرم کہا گیا ہے، نہایت آزادی کے ساتھ لی اور دی جارہی ہے۔ ایک معمولی کانسٹیبل سے لے کر اونچے درجے کے افسران تک اسے شیر مادر سمجھے ہوئے ہیں، اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ جس کی جیب گرم ہو وہ سینکڑوں جرائم میں ملوث ہونے کے باوجود بڑی ڈھٹائی کے ساتھ دندناتا پھرتا ہے۔ اور جس کی جیب خالی ہو وہ سو فیصد معصوم اور برحق ہونے کے باوجود انصاف کو ترس کر جان دے دیتا ہے، اس صورتِ حال کو مضبوط اور ایمان دار انتظامیہ ہی ختم کر سکتی ہے، اگر اونچے درجے کے رشوت خور افسروں کو چند بار علی الاعلان عبرتناک جسمانی سزائیں دی جائیں اور آئندہ رشوت کے لئے کچھ اور سخت سزائیں مقرر کر دی جائیں تو رفتہ رفتہ یہ لعنت مٹ سکتی ہے۔

۲۔ عدالتی نظام کی اصلاح

ہمارا عدالتی نظام اس قدر فرسودہ، پیچیدہ، دشوار گزار اور تکلیف دہ ہے کہ ایک غریب آدمی کے لئے ظلم پر صبر کر لینا دادرسی کے بہ نسبت زیادہ آسان ہے، اس کے لئے یوں تو پورے عدالتی اور اس کے دیوانی وفوجداری ضابطوں کی تشکیل نو ضروری ہے لیکن خاص طور سے مندرجہ ذیل اقدامات فوری

طور پر ضروری ہوں گے۔

(الف) صنعتی تنازعات کے تصفیے کے لئے عدالتیں قائم کی جائیں جن تک پہنچنا مزدوروں کی براہ راست دسترس میں ہو اور جن کا طریق کار آسان ہو۔

(ب) زمینداروں اور کاشت کاروں کے تعلقات کی نگرانی اور کاشت کاروں کو ناجائز شرائط کے ظلم سے نجات دلانے کے لئے بھی سرسری عدالتیں قائم کی جائیں۔

(ج) عورتوں پر ہونے والے مظالم کی دادرسی کے لئے گشتی عدالتیں قائم کی جائیں جو سرسری طور پر مقدمات فیصل کریں۔

۳۔ لیبر قوانین پر عمل درآمد

مزدوروں کی صحت، حادثات سے تحفظ، اور غیر معمولی محنت سے بچاؤ اور تنخواہوں کے معیار وغیرہ سے متعلق فیکٹریز ایکٹ اور دوسرے لیبر قوانین میں احکام موجود ہیں، لیکن کارخانوں کی عملی تحقیق کیجئے تو ان قوانین کا کوئی اثر وہاں مشکل ہی سے نظر آتا ہے، فیکٹریز ایکٹ کے تحت کارخانوں میں ہوا، روشنی، صفائی، موسمی اثرات سے حفاظت اور دوسرے حفاظتی انتظامات ضروری قرار دیئے گئے ہیں، اور ان کی نگرانی کے لئے فیکٹری انسپکٹر بھی مقرر کیا گیا ہے، لیکن عملاً ہو یہ رہا ہے کہ متعلقہ فیکٹری انسپکٹر کا ماہانہ "وظیفہ" کارخانوں کی طرف سے مقرر ہو جاتا ہے، چنانچہ انسپکٹر سال بھر میں چند برائے نام چالان کرکے اپنی کارکردگی دکھا دیتا ہے اور چند سو روپے جرمانے کے طور پر سرکاری خزانے کو پہنچ جاتے ہیں، رہا بیچارہ مزدور سو اس کو فیکٹریز ایکٹ کی کسی دفعہ سے کوئی نہیں فائدہ پہنچتا، جن مقامات پر وہ کام کرتا ہے، وہ جاڑوں میں سخت ٹھنڈے اور گرمیوں میں نہایت گرم ہوتے ہیں، طعام خانے میں انتہائی مضر صحت اشیاء فروخت ہوتی ہیں، بیت الخلاء اس قدر گندے اور ناکافی ہوتے ہیں کہ فیکٹریز ایکٹ دیکھتا رہ جائے۔ ظاہر ہے کہ اگر انتظامیہ ایسی ہی "چست" اور "دیانت دار" ہو تو کوئی بہتر سے بہتر قانون بھی کارگر نہیں ہوسکتا۔

۴۔ سرکاری محکموں میں حصولِ انصاف

"سرخ فیتے" کی مصیبت ہمارے ملک میں کسی تعارف کی محتاج نہیں، اور اس سے ہر وہ شخص آگاہ ہے جسے اپنی کسی ضرورت کے تحت دفتری کاموں سے سابقہ پڑا ہو۔ اس کا ایک نتیجہ تو یہ ہے کہ جو شخص وسائل و اسباب اور تعلقات نہ رکھتا ہو وہ اپنے جائز حقوق آسانی سے حاصل نہیں کرسکتا اور دوسرا نقص یہ ہے کہ ایک ہی نوعیت کے کاموں کے لئے محکموں اور اداروں کا طویل سلسلہ قائم ہے اور ان

میں سے ہر ایک محکمے پر قومی دولت کا مستقل حصہ صرف ہو رہا ہے، لیکن ہر محکمے میں فائلوں کے انبار لگے پڑے ہیں اور کام نبٹنے میں نہیں آتا۔

انتظامیہ کی ابتری کی چند مثالیں صرف یہ واضح کرنے کے لئے دی گئی ہیں کہ نظم وضبط کے فقدان کا براہ راست اثر عوام کی معیشت پر پڑ رہا ہے، اور قانون کی اصلاح کے ساتھ ساتھ جب تک انتظامیہ کو مستحکم اور فعال نہیں بنایا جائے گا، عوام کی مشکلات دور نہیں ہو سکتیں۔

سادہ معاشرت کا رواج

معاش کے سلسلے میں عوام کی پریشانیوں کا تیسرا اہم سبب وہ مغربی معاشرت ہے جو ہم نے خواہ مخواہ اپنے اوپر مسلط کر رکھی ہے، اسلام ہمیں سادہ طرزِ زندگی اختیار کرنے کی تلقین کرتا ہے اور اگر ہمارے ملک پر آسمان سے ہن برسنے لگے تب بھی ہمیں تکلف اور تعیش کی زندگی سے مکمل پرہیز کرنا چاہئے، اگر اسلامی نظام قائم ہو تو ہمیں اپنی معاشرت میں مندرجہ ذیل اصلاحات کرنی ہوں گی۔

ا۔ رہن سہن کے پر تکلف طریقوں کو چھوڑنا

رہن سہن کے پر تکلف، عیش پرستانہ اور مہنگے طریقے یکسر چھوڑ دینے ہوں گے جو ہم نے مغرب سے درآمد کیے ہیں، اور جن کی وجہ سے عوام اقتصادی بدحالی کا شکار ہیں، اس وقت ہماری کیفیت یہ ہے کہ ہم اپنے لباس، اپنی وضع قطع، اپنے طرز رہائش، اپنی تقریبات، غرض معاشرت کے ہر شعبے میں مغرب کی اندھی تقلید کر رہے ہیں۔ اور اس احمقانہ تقلید کو تہذیب کی علامت سمجھے ہوئے ہیں، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ موجودہ معاشرے میں ایک شخص اس وقت تک مہذب نہیں کہلا سکتا جب تک وہ ڈھائی سو روپے کا اپٹوڈیٹ سوٹ [1] نہ پہنے ہوئے ہو، اس کے پاس جدید ترین آسائشوں والا بنگلہ نہ ہو، اس کے ڈرائنگ روم میں قیمتی فرنیچر نہ ہو اور اس کے گھر میں ریفریجریٹر اور ٹیلی ویژن نہ لگا ہوا ہو۔ ظاہر ہے کہ جب یہ چیزیں تہذیب کی شرط لازم قرار پائی گئی ہیں تو لوگوں کا شب وروز ان کے حصول میں کوشاں رہنا قدرتی امر ہے۔ چنانچہ اس معاملہ میں ہر شخص دوسرے سے آگے نکل جانے کی فکر میں ہے، اور اس غرض کے لئے جب محدود آمدنی کافی نہیں ہوتی تو رشوت، چور بازاری، اسمگلنگ اور دوسرے ناجائز طریقوں سے کام لیتا ہے۔

اس صورت حال کو بدلنے کے لئے ضروری ہے کہ ہمارے حکام، وزراء، سیاسی رہنما اور سماجی

(۱) جس وقت یہ تحریر لکھی گئی اس وقت کے اعتبار سے۔ ۱۲

کارکن سادہ طرزِ معیشت اختیار کرنے کی ملک گیر تحریک چلائیں، اور اس کی ابتداء اپنے آپ سے کریں اس لئے کہ جب تک ہمارے اعلیٰ حکام، دولتمند افراد اور سیاسی رہنما اپنے لباس، اپنی نشست و برخاست، اپنی تقریبات، اپنے طرز رہائش اور عام زندگی میں سادگی کو نہیں اپنائیں گے، عوام تکلفات کی اس مصنوعی زندگی سے نجات نہیں پاسکیں گے جو ان کی معاشی بدحالی کا بڑا سبب ہے اور جس کا نتیجہ پاکستان جیسے غریب ملک کے لئے معاشی تباہی کے سوا کچھ نہیں۔

۲۔سامان تعیش کی درآمد پر پابندی

سامان تعیش کی درآمد بالکل بند کردی جائے اور تمام اشیائے صرف میں ملک کی اپنی پیداوار کو فروغ دیا جائے۔

۳۔ملکی اشیائے صرف کا رواج

جو اشیائے صرف ایسی ہیں کہ پاکستان میں متوسط یا اعلیٰ معیار کی پیدا ہونے لگی ہیں (مثلاً کپڑا) ان کی درآمد پر بھی پابندی عائد کردی جائے تو عوام میں سادگی کو فروغ دینے میں بھی مدد ملے گی اور زرمبادلہ میں بھی کفایت ہوگی۔

۴۔تقریبات میں اخراجات کی حد بندی

شادی بیاہ اور تقریبات وغیرہ پر اخراجات کی مناسب حد مقرر کردی جائے جس سے زائد خرچ کرنا قانوناً جرم ہو۔

۵۔مخرب اخلاق صنعتوں پر پابندی

بعض صنعتیں اور کاروبار ایسے ہیں کہ وہ ہمارے معاشرے پر بری طرح چھائے ہوئے ہیں اور آج ان کو بند کرنے کا تصور بڑا نامانوس معلوم ہوتا ہے۔ اس لئے لوگ ان کی برائی کو جاننے بوجھنے کے باوجود انہیں بند کرنے کا مشورہ دیتے ہوئے جھجکنے لگے ہیں، لیکن اگر اپنے مسائل کو حقیقت پسندی کے ساتھ حل کرنا ہے تو ہمیں اس جھجک کو ختم کر کے کچھ جرأت مندانہ اقدامات کرنے ہوں گے، خواہ وہ کتنے نامانوس اور اجنبی کیوں نہ ہوں۔ مثلاً فلم انڈسٹری اور ٹیلی ویژن ایسے ادارے ہیں جنہوں نے قوم کو اخلاقی تباہی کی آخری حدود تک پہنچا دیا ہے، جو شخص بھی حقیقت پسندی کے ساتھ حالات کا جائزہ

لے گا وہ اس نتیجے پر پہنچے بغیر نہیں رہ سکے گا کہ اس صنعت نے قوم کو نقصان پہنچایا ہے۔ جس قوم کی نوے فیصد آبادی فقر و افلاس کا شکار، تعلیم و تربیت سے محروم اور فن و ٹیکنیک میں پسماندہ ہو، اس کے لئے آخر کیسے جائز ہے کہ وہ اپنا کروڑوں روپیہ سالانہ ان کھیل تماشوں پر صرف کر دے جو صحت، اخلاق اور ذہنی پاکیزگی کے لئے سم قاتل ثابت ہو رہے ہیں، جو مالی اور انسانی وسائل اس وقت اس قسم کی چیزوں پر لگے ہوئے ہیں انہیں موجودہ حالت پر برقرار رکھنا ''گھر پھونک تماشا دیکھنے'' کے مترادف ہے۔ اگر انہیں کسی ایسی صنعت پر لگایا جائے جو قوم کے لئے بنیادی اہمیت رکھتی ہو تو ہمیں معاشی ترقی میں بڑی مدد مل سکتی ہے، اسلام صحت مند تفریح کو بہ نظر استحسان دیکھتا ہے، لیکن یہ کیا ضروری ہے کہ تفریح کے لئے وہی راستہ اختیار کیا جائے جس کا حاصل صحت، اخلاق اور پیسہ کی بربادی کے سوا کچھ نہ ہو۔ ایسی مفید اور صحت مند تفریح کو فروغ کیوں نہ دیا جائے جو ہمارے لئے مفید ہوں، یا کم از کم مضر نہ ہوں؟

۶۔ پیشے کی بنیاد پر طبقاتی تقسیم

ہمارے معاشرے میں پیشے کی بنیاد پر سماجی طبقات پائے جاتے ہیں، اور جس طرح انہیں عزت و ذلت کا معیار سمجھ لیا گیا ہے وہ بھی سراسر غیر اسلامی تصور ہے جو ہم نے غیر مسلموں سے لیا ہے۔ یہ چیز اسلام کی معاشرتی مساوات کے تو قطعی خلاف ہے ہی، اس کا معاشی نقصان بھی یہ ہے کہ سماجی تقسیم محنت کی آزاد نقل پذیری (MOBILITY) میں زبردست رکاوٹ بن جاتی ہے اور ظاہر ہے کہ محنت کی آزاد نقل پذیری کے بغیر متوازن معیشت کا قیام مشکل ہے۔ اس صورت حال کی اصلاح نظام تعلیم و تربیت، نشر و اشاعت کے ذرائع اور سماجی تحریکات کے ذریعہ کی جا سکتی ہے۔

۷۔ مزدور کا سماجی مرتبہ اور تحفظ

ملازموں، مزدوروں اور کسانوں کا سماجی رتبہ (SOCIAL STATUS) بلند کرنے کی شدید ضرورت ہے، اسلامی تعلیمات کی رو سے مزدور اور آجر ایک ہی برادری کے دو فرد ہیں جو اپنے سماجی مرتبے کے لحاظ سے بالکل برابر ہیں۔ لہٰذا اس کی کوئی وجہ نہیں ہے کہ آجر اپنے عام رویہ میں مزدور کو کمتر سمجھے اور اس کے ساتھ غیر مساویانہ سلوک کرے۔ معاہدے کی خلاف ورزی پر دونوں کو ایک دوسرے کا قانونی محاسبہ کرنے کا حق حاصل ہے لیکن اس کے کوئی معنی نہیں ہیں کہ مزدور تو آجر کے ساتھ تعظیم کا معاملہ کرنے پر مجبور ہو اور آجر اس کے ساتھ تحقیر و توہین کا معاملہ کرے۔ اس صورتحال کی

اصلاح کے لئے بھی نظام تعلیم اور نشر واشاعت کے تمام ذرائع سے کام لے کر لوگوں کے ذہنوں کی ازسر نوتعمیر کی ضرورت ہے، اس کے علاوہ ایسے قانونی احکام بھی نافذ کئے جائیں جن کی رو سے ملازمین کے ساتھ اہانت آمیز رویہ اختیار کرنا قابل تعزیر جرم ہو۔ اس سے جہاں معاشرے کی ذہنی اور اخلاقی بیماریوں کی اصلاح ہوگی وہاں سادہ طرز معیشت کے قیام میں مدد ملے گی۔

آخر میں ہمیں ایک بنیادی نکتے کی طرف توجہ دلانی ہے، یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے کہ ظلم واستحصال درحقیقت اس بیمار ذہن کی پیداوار ہوتا ہے جو خدا کے خوف، آخرت کی فکر اور انسانی اخلاق سے بے نیاز ہو لہٰذا ہماری معیشت میں جو بدعنوانیاں پائی جاتی ہیں ان کا اصل سبب خود غرضی، سنگدلی، کنجوسی اور مفاد پرستی کی وہ انسانیت سوز صفات ہیں جو ہمیں مغرب کی مادہ پرست ذہنیت سے ورثے میں ملی ہیں اور ہماری زندگی کے ہر شعبے پر چھا چکی ہیں، اگر اسلام کا نظام حیات قائم ہو تو چونکہ اس کی بنیاد ہی خدا کے خوف اور آخرت کی فکر پر ہے لہٰذا یہ ضروری ہے کہ قانون کے ساتھ ساتھ قلب اور ذہن کی اصلاح کی طرف پوری توجہ کی جائے، تعلیم وتربیت اور نشر واشاعت کے تمام وسائل کو کام میں لاکر ان اسلامی تعلیمات کو ایک تحریک کی شکل میں پھیلایا جائے جو دل میں خدا کا خوف اور آخرت کی فکر پیدا کریں، جن کے ذریعہ باہمی اخوت اور ایثار و ہمدردی کے جذبات پروان چڑھیں اور جن سے ایسے ذہن تیار ہوسکیں جو اللہ کی خوشنودی اور آخرت کی فلاح کو دنیا کی ہر منفعت پر فوقیت دیتے ہوں۔

دنیا کا تجربہ اس بات کا گواہ ہے کہ نرا قانون کا ڈنڈا کبھی کسی قوم کی اصلاح نہیں کرسکا، اور جب تک قانون کی پشت پر ایک مضبوط عقیدہ نہ ہو، ظلم واستحصال کو روکا نہیں جاسکتا۔ اسلامی تاریخ کے ابتدائی دور میں ایثار ومروت، انفاق فی سبیل اللہ اور سخاوت و استغناء کے جو فقید المثال واقعات ملتے ہیں ان کا بنیادی سبب یہی خدا کا خوف اور آخرت کی فکر تھی جو قوم کے ہر ہر فرد کے رگ و پے میں سما گئی تھی، اگر آج پھر اس جذبے اور عقیدے کو نئی زندگی دی جائے تو حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کا دور آج بھی لوٹ سکتا ہے۔

قلب و روح اور ذہن و دماغ کا یہ انقلاب بعض لوگوں کو مشکل نظر آتا ہے لیکن اگر حکومت اس انقلاب کو اپنا واقعی نصب العین بنا کر صحیح خطوط پر کام کرے تو ہم دعوے کے ساتھ یہ بات کہہ سکتے ہیں کہ چند ہی سال میں ہمارے معاشرے کی کایا پلٹ جائے گی۔ ہم موجودہ حالات میں خواہ کتنے برے سہی لیکن یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ الحمد للہ ہمارے دلوں میں ابھی ایمان کی ایک دبی ہوئی چنگاری موجود ہے۔ اور اگر کوئی اس چنگاری کو ہوا دینے والا مل جائے تو آن کی آن میں بھڑک کر شعلہ بن سکتی ہے۔

اس کی واضح دلیل یہ ہے کہ پاکستان کی بائیس سالہ تاریخ میں اسی قوم نے دو مرتبہ بڑا حسین اور قابل فخر کردار پیش کیا ہے، ایک قیام پاکستان کے وقت ۱۹۴۷ء کے موقع پر اور دوسرے ستمبر ۱۹۶۵ء کے جہاد کے وقت۔ ان دونوں مواقع پر اسی گئی گذری قوم کا ایک حسین رخ نکھر کر سامنے آیا ہے کہ دنیا حیران رہ گئی، جس قوم نے ۴۷ء اور ۶۵ء میں شجاعت و جوانمردی، نظم و ضبط، فرض شناسی، ایثار و ہمدردی اور سخاوت و فیاضی کا یہ حیرت انگیز مظاہرہ پیش کیا تھا، کیا یہ وہی قوم نہیں تھی جس کی کام چوری، خود غرضی، بدنظمی اور بخل و مفاد پرستی کا آج رونا رویا جا رہا ہے؟ ____ جب یہ وہی قوم ہے تو سوچنے کی بات ہے کہ اس وقت اس میں اتنا بڑا انقلاب کیوں کر رونما ہو گیا تھا؟

اس سوال پر جتنا بھی غور کیجئے، اس کا صرف ایک جواب ہے کہ درحقیقت ان مواقع پر قوم کے رہنماؤں نے سچے دل سے ایمان کی دبی ہوئی چنگاری کو ہوا دی تھی اور قوم کو یہ اطمینان ہو گیا تھا کہ اسے اسلام کے صرف نام پر نہیں بلکہ اس کے حقیقی کام پر دعوت دی جا رہی ہے۔ اس اطمینان نے قوم میں اپنا سب کچھ لٹا کر اسلام کی عظمت کا جذبہ پیدا کیا اور یہ دکھا دیا کہ

ایسی چنگاری بھی یا رب میرے خاکستر میں تھی

مگر افسوس کہ اس چنگاری کو ہوا دینے والوں نے آئندہ اس سے کام لینے کی ضرورت نہ سمجھی اور عوام کا یہ ابھار ایک وقتی ابال ثابت ہوا۔ لیکن اگر مستقل طور سے اس چنگاری کو بھڑکایا جاتا رہے تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ یہ قومی شعور دیرپا ثابت نہ ہو لہٰذا یہ بات پورے وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ اگر صحیح معنی میں اسلامی نظام قائم ہو اور اس کے لئے قوم سے قربانیاں طلب کی جائیں تو یہی قوم چند سالوں میں ایسی عظیم الشان قوت بن کر ابھرے گی جس کا کوئی مد مقابل نہ ہوگا۔ جو قوم جنگ کے زمانہ میں یرموک و قادسیہ کی یاد تازہ کر سکتی ہو، وہ امن کے زمانے میں عمر بن عبدالعزیزؒ کے دور کو کیوں زندہ نہیں کر سکتی؟!

بعض ضروری ترجیحات

بس ضرورت اس بات کی ہے کہ:

(۱) ملک کے نظام تعلیم کو اسلامی بنایا جائے، (۱) اور طلباء کی تربیت خالص اسلامی خطوط پر کی جائے۔

(۲) ملک کے حکمران مغربی طرز زندگی کو چھوڑ کر سادہ زندگی اختیار کریں اور قومی مفاد کی خاطر ذاتی

(۱) نظام تعلیم سے متعلق یہ مفصل تجاویز حصہ تعلیم میں ملاحظہ فرمائیے۔

مفاد کو قربان کرنے کی واضح اور روشن مثالیں عوام کے سامنے لائیں۔

(۳) نشر و اشاعت کے تمام ذرائع کو خواہ وہ ریڈیو ہو یا اخبارات، اسلامی رنگ میں رنگا جائے، فحاشی، عریانی اور عیش پرستی پر ابھارنے والے پروگراموں کو بالکل بند کر کے ان کی جگہ ایسے پروگرام وضع کیے جائیں، جو قومی شعور، اجتماعی فکر، ایثار، خدا ترسی اور فکر آخرت کے جذبات پیدا کریں۔

(۴) انتظامیہ کے عہدوں پر فائز کرنے کے لئے امیدوار کے مطلوبہ دینی اور اخلاقی معیار کو شرط لازم قرار دیا جائے۔ اور نری کاغذ کی ڈگریوں کو دیکھنے کے بجائے امیدوار کے دینی و اخلاقی کردار پر کڑی نظر کی جائے۔

(۵) ''امر بالمعروف'' اور ''نہی عن المنکر'' کا مستقل ادارہ قائم کیا جائے جو دیندار خدا ترس اور ملت کا درد رکھنے والے مسلمانوں پر مشتمل ہو اور اپنی تمام توانائیاں لوگوں میں اسلامی اسپرٹ پیدا کرنے پر خرچ کرے۔

(۶) مساجد اسلامی معاشرے کے لئے مرکزی مقام کی حیثیت رکھتی ہیں، ان کو آباد کرنے پر پوری توجہ دی جائے۔ اعلیٰ حکام ''اقامت صلوۃ'' کی تحریک چلائیں اور اس کی ابتداء اپنے آپ سے کریں۔

اگر اس قسم کے چند اقدامات حکومت کی طرف سے کر لیے گئے تو یہ بات دعوے کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ نہایت مختصر عرصے میں اس ملک کی بالکل کایا پلٹ جائے گی، اور یہاں ایک ایسی قوم تیار ہوگی جو اپنے اخلاق و کردار، اپنی سعی و عمل اور اپنے جذبات کے لحاظ سے دنیا کے لئے صدر شک ہوگی، افراد سازی کے اس کارنامے کے بعد ظلم و استحصال کا بالکل خاتمہ ہو جائے گا اور دنیا خود کھلی آنکھوں دیکھ لے گی کہ جس معاشی بے چینی نے پورے کرۂ زمین کو تہ و بالا کیا ہوا ہے وہ اسلامی نظام کے تحت خوبصورتی کے ساتھ سکون و اطمینان اور عمومی خوشحالی کے ساتھ بدل گئی ہے۔

پاکستان میں اسلامی انقلاب

مشکلات دنیا کے ہر کام میں ہوتی ہیں، خاص طور سے وہ کام جو انقلابی نوعیت رکھتا ہو، چنانچہ اسلامی انقلاب لانے میں بھی بلاشبہ مشکلات ہوں گی لیکن یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ اس ملک میں کوئی انقلاب اتنی آسانی سے نہیں لایا جاسکتا جتنی آسانی سے یہاں اسلامی انقلاب آسکتا ہے۔ اول تو اس لئے کہ اسلام کی بنیاد پر جو اصلاحات تجویز کی گئی ہیں وہ فی نفسہ بہت زیادہ مشکل نہیں ہیں۔ دوسرے اس لئے کہ پاکستان کی سرزمین اسلام کے لئے دنیا کے ہر خطے سے زیادہ سازگار ہے کسی قوم کی زندگی میں انقلاب لانے میں سب سے زیادہ موثر قوت اس قوم کے جذبات اور اس کا انقلابی شعور ہوتا ہے،

اور یہ ایک نا قابل انکار حقیقت ہے کہ اسلام کی محبت وعظمت اور روبہ عمل دیکھنے کی آرزو یہاں کے عوام کی رگ و پے میں سمائی ہوئی ہے، اور اگر انہیں یہ احساس ہو کہ یہاں سچے دل سے اسلامی انقلاب کی کوشش ہو رہی ہے تو وہ ہر کڑی سے کڑی مشکل کو جھیل جائیں گے۔

اس کے برخلاف اگر یہاں سوشلزم نافذ کرنے کی کوشش کی گئی تو قطع نظر اس سے کہ وہ اچھا ہے یا برا، اس کے نافذ کرنے میں اس قدر مشکلات ہوں گی کہ سالہا سال تک ملک کا امن اور چین رخصت ہو جائے گا، سوشلزم کی تاریخ شاہد ہے کہ اس کے لائے ہوئے انقلاب میں کشت وخون، جبر و تشدد اور بدامنی و ہنگامہ خیزی جز ولازم کی حیثیت رکھتی ہیں۔ پھر اس حقیقت سے کوئی شخص ہزار جھوٹ بول کر بھی شاید انکار نہ کر سکے کہ سوشلزم یہاں کے عوام کی آرزو نہیں ہے، اسے لانا نہیں، تھوپنا پڑے گا، اور یہاں کے عوام ہزار طرح کے پروپیگنڈے اور جبر و تشدد کے باوجود اپنے قلبی جذبات کے ساتھ سوشلزم قائم کرنے کے لئے کام نہیں کر سکیں گے۔ اور صدیوں تک حکومت اور عوام کی رسہ کشی بند ہونے میں نہیں آئے گی۔

اس کے علاوہ سوشلزم کے قیام سے تقسیم دولت کی موجودہ ناہمواری کبھی ختم نہیں ہو سکتی۔ زمینوں یا کارخانوں کو قومی ملکیت میں لے لینے سے ایک غریب انسان کی معاشی مشکلات دور نہیں ہوں گی، کچھ اور بڑھ جائیں گی، واقعہ یہ ہے کہ سوشلزم کے وکلاء ہمیشہ ''قومی ملکیت'' کا ایک مبہم نعرہ لگاتے رہے ہیں، لیکن ان کے پاس کوئی مربوط، منظم اور سوچا سمجھا معاشی پروگرام نہیں ہے۔

❁❁❁

علمائے کرام کا متفقہ معاشی خاکہ

علمائے کرام کا متفقہ معاشی خاکہ

پچھلے دنوں ملک کے ۱۱۸ مقتدر علمائے کرام کی طرف سے ۲۲ نکات پر مشتمل اسلامی معاشی اصلاحات کا ایک متفقہ خاکہ اخبارات میں شائع ہوا ہے، جس پر تمام مکاتب فکر کے بلند پایہ علماء کے دستخط ہیں۔ یہ متفقہ اعلان بلاشبہ علماء کا ایک عظیم الشان مثبت کارنامہ ہے، اور امید ہے کہ ۵۲ء کے ۲۲ دستوری نکات کی طرح انشاء اللہ یہ ۲۲ معاشی نکات بھی اسلامی جدوجہد کی تاریخ میں ایک سنگ میل ثابت ہوں گے۔

ہمارے ملک میں یہ سوال بڑے شدومد کے ساتھ اٹھایا گیا تھا کہ جس اسلامی نظام کو سرمایہ داری اور سوشلزم دونوں کے مقابلے میں انسانیت کی صلاح وفلاح بتایا جارہا ہے، وہ ہے کیا؟ اور کس طرح نافذ ہو سکے گا؟ علماء کے اس متفقہ خاکہ نے اس سوال کے جواب میں اسلامی معیشت کے بنیادی خدوخال خوب اچھی طرح واضح کر دیے ہیں، اور جو شخص بھی انصاف اور حقیقت پسندی کے ساتھ ان نکات کا بغور مطالعہ کرے گا، وہ اس نتیجہ پر پہنچے بغیر نہیں رہ سکے گا کہ مسلمانوں کو سرمایہ داری کے ظلم و استحصال کا علاج تلاش کرنے کے لئے ماسکو اور پیکنگ کا رخ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

اسلامی معاشی اصلاحات کی توضیح کے علاوہ اس اعلان کا نہایت روشن پہلو یہ ہے کہ یہ معاشی خاکہ تمام مسلمانوں کے مکاتب فکر کے اتحاد واتفاق سے منظر عام پر آیا ہے۔ اور اس میں دیوبندی، بریلوی، اہل حدیث اور شیعہ حضرات کے دستخط پہلو بہ پہلو موجود ہیں۔ ہمارے ملک میں سوچی سمجھی سکیم کے تحت علماء کے اختلافات کا شدت کے ساتھ پروپیگنڈہ کر کے ذہنوں پر یہ تاثر بٹھانے کی منظم کوشش کی گئی ہے کہ علماء کے درمیان کسی بھی معاملے میں کوئی نقطۂ اتفاق موجود نہیں ہے۔ اس پروپیگنڈے کا مقصد یہ تھا کہ ملک میں صحیح اسلامی نظام کے قیام سے عام مایوسی پیدا کی جائے، اور جب اس ملک کی گاڑی کو اسلامی خطوط پر چلانے کا سوال آئے تو یہ کہہ کر بات ختم کر دی جائے کہ علماء کے اختلافات کی موجودگی میں پورے ملک کے لئے کوئی متفقہ نظام قائم نہیں کیا جا سکتا۔

حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ مختلف مکاتب فکر کے علماء کے درمیان جو اختلافات ہیں وہ زیادہ تر عبادات اور فروعی عقائد سے متعلق ہیں، اور ملک وملت کے اجتماعی مسائل میں ان کے درمیان کوئی ایسا اختلاف نہیں ہے جو کسی بھی مرحلے پر اسلامی نظام کے قیام کے راستے میں رکاوٹ بن سکے۔ جہاں

تک ملک کے دستور کا تعلق ہے، اس میں فرقوں کے درمیان کوئی ایک اختلاف بھی نہیں ہے، ۱۹۵۱ء میں ہر مکتب فکر کے علماء کا کنونشن منعقد ہوا، اور اس نے ۲۲ دستوری نکات متفقہ طور پر طے کیے، ان ۲۲ نکات میں کسی ایک عالم کا آج تک کوئی اختلاف سامنے نہیں آیا، اور اب بھی ہر دینی جماعت اور مکتب فکر کے دینی رہنماء ملک کے ہر گوشے سے یہ مطالبہ کر رہے ہیں کہ پاکستان کا آئین ان بائیس نکات کی بنیاد پر بنایا جائے۔ اسی طرح ملکی قانون کے معاملے میں بھی ان فرقوں کے درمیان کوئی قابل ذکر اختلاف نہیں، صرف شخصی قوانین کی حد تک ایک دو فرقوں کا اختلاف ہوگا، لیکن اس کا حل خود انہی ۲۲ نکات میں یہ طے کر دیا گیا ہے کہ ان فرقوں کے شخصی قوانین بنا دیئے جائیں۔

ان حقائق کی روشنی میں ہر شخص خود سوچ سکتا ہے کہ علماء کے اختلاف کا جو راگ صبح وشام الاپا جاتا ہے اس کی کیا حقیقت ہے؟ اور کس طرح ایک رائی کے دانے کو پہاڑ بنا کر پیش کیا گیا ہے؟ لیکن جب ہمارے ملک میں اسلام اور سوشلزم کی بحث چلی اور سوشلزم کے حامی حضرات سے یہ کہا گیا کہ پاکستان تو اسلام کے لئے بنا تھا تو جواب میں دوسرے بہانوں کے علاوہ ایک اس بہانے کا بھی شدت کے ساتھ تذکرہ کیا جاتا رہا کہ علماء کے درمیان جو اختلافات ہیں ان کی موجودگی میں کوئی متفقہ نظام قائم ہو ہی نہیں سکتا۔

علماء کے اس متفقہ خاکے نے اس پروپیگنڈے کی قلعی بھی خوب اچھی طرح کھول دی ہے، اور اب یہ کہنے کی گنجائش باقی نہیں رہی کہ اسلام کے جس معاشی نظام کو علماء فلاح و بہبود کا ضامن بتاتے ہیں وہ ہے کیا؟ اور تمام فرقوں کے اتفاق سے کیوں کر نافذ ہو سکتا ہے؟

توقع کے مطابق علماء کی اس قابل قدر خدمت کو ملک کے ہر طبقے کی طرف سے خوب سراہا گیا ہے، علماء، سیاسی رہنماؤں اور صحافیوں کے علاوہ ملک کے ممتاز ماہرین معاشیات نے بھی اس کا گرم جوشی کے ساتھ خیر مقدم کیا ہے، اور ماہرین معاشیات نے یہ یقین بھی ظاہر کیا ہے کہ اگر معاشی خاکہ کو عملاً نافذ کیا جائے تو ملک میں عام خوشحالی کی فضا پیدا ہو جائے گی۔ آج کی صحبت میں ہم ان ۲۲ معاشی نکات کی چند نمایاں خصوصیات پر گفتگو کرنا چاہتے ہیں۔ تاکہ ان مختصر نکات کے اثرات و نتائج نسبتاً وضاحت کے ساتھ سامنے آسکیں۔

ایک مسلمان معاشرے کے لیے معاشی نظام کی جو بنیادیں طے کی جائیں، ان پر دو حیثیتوں سے غور ہونا چاہئے، ایک اس حیثیت سے کہ یہ بنیادیں اسلام کے کس حد تک مطابق ہیں، اور دوسرے اس حیثیت سے کہ وہ موجودہ دور میں کس حد تک قابل عمل ہیں؟ جہاں تک پہلی حیثیت کا تعلق ہے، اس معاشی خاکے کی صحت کے لئے یہ ضمانت بالکل کافی ہے کہ اس پر تمام مکاتب فکر کے ایسے مقتدر اور مستند

علماء کے دستخط ہیں جن پر پوری امت دینی رہنمائی کے سلسلے میں پورا اعتماد کرتی ہے۔ ان تجاویز کی اہم خصوصیت یہ بھی ہے کہ ان میں اسلامی احکام کو بالکل صحیح شکل وصورت میں پیش کیا گیا ہے۔ اور وقت کے کسی چلے ہوئے نظام یا نعرے سے مرعوب ہو کر اسلام میں کسی قسم کی کتر بیونت کی کوشش نہیں کی گئی۔

اسلام چونکہ قیامت تک کے ہر زمانے کے لئے مکمل نظام زندگی لے کر آیا ہے اس لئے اسے کسی زمانے کی ضرورت کے مطابق بدلنے، بگاڑنے، یا اس میں تحریف وترمیم کی ضرورت نہیں، اس میں بذات خود اتنی لچک موجود ہے کہ ہر زمانے کی واقعی ضروریات کا ساتھ دے سکے، اس نے قطعی نصوص کے ذریعے جو احکام دیئے ہیں، اور جن پر پوری امت کا اجماع منعقد ہو گیا ہے، وہ صرف ایسے مسائل سے متعلق ہیں جن پر زمانے کی تبدیلی کا کوئی اثر نہیں پڑتا، لہٰذا ہر دور میں قابل عمل اور سدا بہار رہتے ہیں، ہاں جن مسائل پر زمانے کی تبدیلی اثر انداز ہو سکتی ہے، ان میں اسلام نے قطعی اور متعین احکام دینے کے بجائے اصول بتا دیے ہیں، جن کی روشنی میں ہر زمانے کے لئے الگ راہ عمل متعین کی جاسکتی ہے، اسلام میں مباحات کا ایک وسیع دائرہ اسی مقصد کے لئے ہے کہ اسلامی معاشرہ زمانہ کی بدلتی ہوئی ضروریات کے مطابق اپنے طریق کار میں حسب ضرورت تبدیلیاں کر سکے۔ اس کے علاوہ بعض احکام میں ہنگامی حالات کے لئے الگ ہدایات دی گئی ہیں، جن سے ضرورت کے وقت فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔

لیکن یہ کام بے انتہا نازک ہے، اور یہی مقام ہے جہاں تحقیق اور تحریف کی سرحدیں ایک دوسرے سے ملتی ہیں، اس لئے یہ کام صرف وہی لوگ کر سکتے ہیں، جنہوں نے قرآن وسنت کو سمجھنے میں عمریں کھپائی ہوں، اسلامی شریعت کے مآخذ کو کھنگالا ہو، اور دین کے صحیح مزاج کو سمجھنے کی کوشش کی ہو، خدا کا شکر ہے کہ اس معاشی خاکہ کے مرتب کرنے والوں میں بھاری تعداد ایسے ہی حضرات کی ہے اور انہوں نے کام کی تمام نزاکتوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے یہ خاکہ مرتب کیا ہے۔ چنانچہ اس میں بعض احکام عبوری نوعیت کے بھی ہیں، مثلاً حکومت کی طرف سے قیمتوں کا تعین، اسلام کا اصل منشاء یہ ہے کہ بازار سے اجارہ داریاں بالکل ختم ہوں، اور ان کی جگہ آزاد مسابقت کی فضا پیدا ہو جس میں تمام اشیاء و خدمات (GOODS AND SERVICES) فطری عوامل کے تحت اپنی قیمت آپ متعین کریں، اور معاشیات میں بصیرت رکھنے والے تمام ماہرین اس پر متفق ہیں کہ بازار میں عام ارزانی پیدا کرنے کی اس کے سوا کوئی اور صورت نہیں، ریٹ کنٹرول کے مصنوعی طریقوں سے قیمتیں مقرر کرنا کبھی مستقل طور پر کارگر ثابت نہیں ہو سکتا، بلکہ یہ معیشت کے جسم میں اندرونی بیماریاں پیدا کرنے کا سبب بنتا ہے، ظاہر ہے کہ بازار سے اجارہ داریوں کا خاتمہ ایسا کام نہیں ہے جو آناً فاناً انجام پا جائے،

اس لئے ریٹ کنٹرول کے طریقے کی اجازت اسلام نے عبوری دور کے لئے دی ہے۔ چنانچہ علماء نے بھی اپنے معاشی خاکہ میں تجویز عبوری دور کے لئے ہی پیش کی ہے۔

اسی طرح کسی جائز ملکیت کو زبردستی چھین لینا تو اسلام کی قطعی نصوص کے بالکل خلاف ہے اور اسے کوئی اجتہاد حلال نہیں کر سکتا، اس لئے خاکہ میں اس قسم کی کوئی تجویز نہیں ہے۔ البتہ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ سالہا سال کے غلط نظام معیشت کی بناء پر ہمارے ملک میں ارتکازِ دولت کا عظیم فتنہ پیدا ہو گیا ہے اس لئے علماء نے کئی متبادل تجاویز پیش کی ہیں جو اسلام کے مطابق بھی ہیں اور سرمایہ دارانہ ارتکاز کو ختم کر کے تقسیم دولت کو متوازن بنانے کے لئے بے حد مفید بھی۔ مثلاً:

(۱) خاکہ کے نکتہ نمبر ۶ میں یہ تجویز پیش کی گئی ہے کہ سرکاری صنعتوں میں ان لوگوں کو حصہ دار بنایا جائے جن کی آمدنی ایک ہزار روپیہ ماہانہ سے کم ہے، اور اب تک ایسی صنعتوں میں زائد آمدنی والے جن افراد کے حصص ہیں، ان کے ساتھ سال ختم ہونے پر شرعی قواعد کے تحت معاہدہ فسخ کر دیا جائے!

کلیدی صنعتوں کو قومی ملکیت میں لینے کے مقابلے میں یہ تجویز غریب اور متوسط طبقے کے عوام کے لئے کہیں زیادہ مفید ہوگی، کیونکہ صنعتوں کی قومی ملکیت سے عوام براہ راست صنعتوں کے مالک نہیں بنتے، اس کے بجائے مذکورہ صورت میں وہ براہ راست صنعتوں کے مالک ہو کر ان کے منافع میں شریک ہوں گے۔

(۲) نکتہ نمبر ۱۹ میں تجویز پیش کی گئی ہے کہ قیام پاکستان سے لے کر اب تک جن سرمایہ داروں نے زکوۃ ادا نہیں کی ہے، ان سے زکوۃ وصول کر کے غریبوں میں تقسیم کی جائے۔

(۳) نکتہ نمبر ۱۰ میں کہا گیا ہے کہ اسلامی حکومت کی طرف سے صنعتکاروں پر یہ شرط بھی عائد کی جاسکتی ہے کہ وہ نقد اجرت کے علاوہ مزدوروں کو کسی کارکردگی پر، یا خاص مدت میں، یا اوور ٹائم کی مخصوص مقدار کے معاوضہ میں کسی خاص کارخانے میں مالکانہ حصص دیا کریں۔

(۴) زمینوں کے ارتکاز کو دور کرنے کے لئے نکتہ نمبر ۱۴ میں اسلام کے نظامِ وراثت کو نافذ کرنے کی سفارش کی گئی ہے، بڑی بڑی جاگیروں میں اگر اسلامی قواعد کے مطابق وراثت جاری کی جائے تو چند ہی سال میں ساری بڑی بڑی زمینیں مناسب اکائیوں میں تبدیل ہو جائیں گی۔

(۵) نکتہ نمبر ۱۱ میں کہا گیا ہے کہ بٹائی کے معاملہ میں جس ظالمانہ رسم و رواج نے جڑ پکڑ لی ہے اور جس کی وجہ سے کسانوں پر ناجائز شرطیں عائد کی جاتی ہیں، اگر اس پر فوری طور پر قابو پانا ممکن نہ ہو تو اسلامی حکومت کو یہ بھی اختیار ہے کہ وہ ایک خاص مدت کے لئے یہ اعلان کر دے کہ اب زمینیں بٹائی کے بجائے ٹھیکہ پر دے دی جائیں، یا یہ طریقہ تجویز کر دے کہ کاشت کار بٹائی کے بجائے مقررہ اجرت

پر زمیندار کے لئے بحیثیت مزدور کام کریں گے، اس اجرت کا تعین بھی حکومت کر سکتی ہے اور بڑے بڑے جاگیرداروں پر یہ شرط بھی عائد کر سکتی ہے کہ وہ ایک عبوری دور تک زمینوں کا کچھ حصہ سالانہ اجرت کے طور پر مزدوروں کاشت کاروں کو دیں گے۔

(۶) نکتہ نمبر ۱۳ میں سفارش کی گئی ہے کہ اس وقت تک جتنی زمینیں رہن رکھی ہوئی ہیں، وہ چونکہ سود کے معاملہ پر گروی دی گئی تھیں، اس لئے ان سب کو چھڑا کر قرضدار کو واپس دیا جائے اور قرض خواہوں نے ان سے جتنی آمدنی حاصل کی ہے وہ قرض میں محسوب کی جائے۔

بلاشبہ یہ تجاویز ایسی ہیں کہ اگر ان پر خاطر خواہ طریقے سے عمل کر لیا جائے تو ہمارا معاشرہ دولت کی جس شدید ناہمواری میں مبتلا ہے، وہ ختم ہو جائے گی اور اس طرح آئندہ اسلامی نظام معیشت کے حقیقی فوائد وثمرات حاصل کرنے کے لئے زمین ہموار ہو سکے گی۔

اسلامی معیشت کی پائیدار بنیادوں پر استواری

سرمایہ دارانہ نظام نے ارتکازِ دولت کے جو مفاسد پیدا کیے ہیں، یہ تو ان کے فوری علاج کی تدابیر تھیں، آئندہ اپنی معیشت کے ڈھانچے کو اسلامی بنیادوں پر استوار کرنے کے لئے جو سفارشات پیش کی گئی ہیں۔ وہ بلاشبہ بڑی انقلابی ہیں اور چونکہ معیشت کی پائیدار فلاح و بہبود انہی پر موقوف ہے، اس لئے یہ تجاویز سب سے زیادہ اہمیت کی حامل ہیں۔

ان تجاویز میں سب سے پہلی تجویز سود کا خاتمہ ہے، اس بات کو تسلیم نہ کرنے کی اب ہٹ دھرمی کے سوا کوئی وجہ نہیں رہی کہ سود نے ہمارے نظام تقسیم دولت کو سب سے زیادہ نقصان پہنچایا ہے، یہ سرمایہ دارانہ نظام کی وہ سب سے بڑی لعنت ہے جس نے ہمیشہ ملک کے سارے عوام کو قلاش بنا کر چند بڑے بڑے سرمایہ داروں کو پالا ہے، موجود بینکاری کے نظام میں سود کی حیثیت بلاشبہ ایک سرنج کی ہے، جس سے عوام کا خون نچوڑنے کا کام لیا جا رہا ہے، اس لئے علماء نے تجویز پیش کی ہے کہ بینکوں اور انشورنس کمپنیوں کو سود اور قمار کی لعنت سے پاک کر کے شرکت اور مضاربت کے اصولوں پر چلایا جائے تاکہ عوام کی جمع شدہ رقموں کا منافع صرف چند سرمایہ دار نہ اٹھائیں، بلکہ وہ پوری قوم میں متناسب طریقے سے تقسیم ہو۔

بینکوں اور بیمہ کمپنیوں کو شرکت و مضاربت کے اصولوں پر چلانے کا طریق کار کیا ہوگا؟ اس کی تفصیل مختلف دینی اور علمی حلقوں کی طرف سے بار بار شائع ہو چکی ہے، ہمارے ملک کے اونچے درجہ کے ماہرین معاشیات اور بینکاری کا وسیع تجربہ رکھنے والے حضرات بھی بار بار کہہ چکے ہیں کہ یہ طریق

کار نہ صرف قابل عمل ہے بلکہ اس سے عام قومی خوشحالی پر نہایت خوش گوار اثرات مرتب ہوں گے۔ اس میں شک نہیں کہ یہ کام انقلابی نوعیت کا ہے، اسے خاطر خواہ طریقے سے انجام دینے میں کچھ وقت بھی لگے گا اور محنت بھی صرف ہوگی، لیکن خود اپنے پیدا کیے ہوئے بگاڑ کی اصلاح کے لئے یہ محنت بہرصورت ناگزیر ہے۔ اور اس کے بغیر اپنی معیشت کی کشتی کو، جو تباہی کے کنارے پر پہنچ چکی ہے، ساحلِ مراد کی طرف نہیں موڑا جاسکتا۔

سودی نظام کا حتی المقدور خاتمہ

ہمارے ملک کے وہ مغرب زدہ حضرات جو اپنی بصیرت کو مغرب کی غلامی کی بھینٹ چڑھا چکے ہیں، عام طور سے عوام کے ذہنوں میں یہ الجھن پیدا کیا کرتے ہیں کہ اگر سود ختم کر دیا گیا تو غیر ممالک کے ساتھ معاملات کی شکل کیا ہوگی؟ یہ درست ہے کہ ہم ابھی اس بات پر قدرت نہیں رکھتے کہ دنیا بھر سے سود کی لعنت کو ختم کر دیں لیکن اگر ہم ایک بیماری کو ساری دنیا سے ختم نہیں کر سکتے تو یہ اس بات کی دلیل کیسے بن سکتی ہے کہ ہم اپنے ملک میں بھی اس بیماری کا علاج نہ کریں؟ اگر ہمیں بیرونی معاملات میں سود کو ختم کرنے پر فی الحال قدرت محسوس نہیں ہوتی تو اپنے اندرونی معاملات میں تو ہم اس پر پوری طرح قادر ہیں، ایک عالمگیر برائی کو ایک دم سے راتوں رات ختم نہیں کیا جاسکتا، بلکہ اس کے لئے کئی مدراج سے گزرنا پڑتا ہے، اور یہ طرز فکر عجیب وغریب ہے کہ اگر ایک چھلانگ میں چھت تک پہنچنا ممکن نہ ہو تو چھت تک جانے والی پہلی سیڑھی پر بھی مت چڑھو۔

ایک اسلامی حکومت کا طریق کار یہ ہونا چاہئے کہ پہلے اپنے ملک کے اندرونی معاملات کو اسلام کے مطابق بنانے کے لئے سود کو ختم کرے، پورے عالم اسلام کے لئے ایک بہترین نمونہ قائم کر کے تمام اسلامی ممالک کو اس کی تقلید کی دعوت دے، اور اپنے بیشتر تجارتی تعلقات اسلامی ممالک سے قائم کرنے کی کوشش کرے جن کا غیر سودی بنیادوں پر قائم ہونا نسبتاً آسان ہوگا۔ پھر جہاں غیر مسلم ممالک کے ساتھ تجارتی معاملات ناگزیر ہوں وہاں اس بات کی کوشش کی جائے کہ یہ معاملات تبادلہ اشیاء (BARTER) کی بنیاد پر ہوں (اشتراکی ممالک سرمایہ دار ممالک سے اسی طرح کے معاملات بکثرت کرتے رہے ہیں) اور اگر کہیں سود کے سلسلے میں غیر مسلموں کی شرط تسلیم کیے بغیر چارہ نہ ہو تو بہر حال سخت مجبوری کے حالات میں اسلام نے ہر طرح کی گنجائشیں دی ہیں، جب تک مجبوری باقی ہو، ان گنجائشوں سے فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے۔

ساتھ ہی ہمیں اس بات کا پورا یقین ہے کہ اگر مسلمان ممالک پوری خود اعتمادی کے ساتھ اپنی

معیشت کو سود سے نجات دلانے کا تہیہ کرلیں تو وہ تھوڑے ہی عرصہ میں پوری دنیا سے اپنی شرائط منوانے کی پوزیشن میں آسکتے ہیں، ان کا نظامِ معیشت دوسرے کیلئے مشعل راہ بھی بن سکتا ہے اور کم از کم انہیں اس بات پر ضرور مجبور کیا جا سکتا ہے کہ وہ مسلمانوں کے ساتھ تجارتی معاملات میں سود کا عمل دخل بالکل ختم کردیں لیکن یہ سب باتیں عزم اور جذبۂ عمل پر موقوف ہیں، محض کسی کام کی مشکلات کا ہوّا ذہن پر مسلط کر کے بیٹھ جانا زندہ قوموں کا کام نہیں ہوتا، کامیابی انہی لوگوں کا مقدر ہوتی ہے جو صحیح راستہ پر سخت سے سخت حالات میں قدم بڑھانے کا حوصلہ رکھتے ہوں۔

سٹہ بازی کے برے نتائج

علماء نے اسلامی نظامِ معیشت کے قیام کے لئے دوسری انقلابی تجویز یہ پیش کی ہے کہ سٹہ کا کاروبار بالکل ممنوع کر دیا جائے، اس وقت بازار کی ہوشربا گرانی کا ایک بہت بڑا سبب جس نے ہماری معیشت کو تہ و بالا کیا ہوا ہے، یہی سٹہ کی اندھی تجارت ہے۔ ہمارے موجودہ نظامِ معیشت میں چند بڑے بڑے سٹہ باز اپنی حرص و ہوس کا پیٹ بھرنے کے لئے کروڑوں عوام کی قسمت سے کھیل رہے ہیں، اس ظالمانہ کھیل کی وجہ سے ابھی مال بازار میں پہنچ بھی نہیں پاتا کہ اس پر بیسیوں سودے ہو جاتے ہیں، اور جب مال عوام کی دسترس میں آتا ہے تو اس کی قیمت کہیں سے کہیں پہنچ چکی ہوتی ہے، آنحضرت ﷺ نے کسی چیز پر قبضہ کرنے سے پہلے اسے آگے بیچنے کو ممنوع قرار دیا ہے، اگر اس قانون پر سختی سے عمل ہو تو سارا درمیانی نفع جو سٹہ باز لے اڑتے ہیں، اس سے عوام مستفید ہو سکیں گے۔ اسٹاک ایکسچینج کے کاروبار میں بھی سٹہ ہی وہ چیز ہے جس سے پورے ملک کی معیشت بار بار بحران کا شکار ہوتی ہے، اور بعض اوقات کسی ایک سٹہ باز کا پیدا کیا ہوا رجحان پوری قوم کی تباہی کا سبب بن جاتا ہے، اور یہی نہیں، سٹہ بازی کی لعنت تجارت میں مکر و فریب کو باقاعدہ فن بنا کر تاجروں کو سینکڑوں اخلاقی جرائم میں مبتلا کرتی ہے، اور اس طرح اسٹاک ایکسچینج کے احاطے میں بڑے بڑے اسکینڈل پرورش پاتے ہیں، لہٰذا اگر علماء کی تجویز کے مطابق سٹہ کو ممنوع کر دیا جائے تو معیشت کی بہت سی خرابیاں خود بخود رفع ہو سکتی ہیں۔

تجارتی لائسنس پرمٹ کے مفاسد

تیسری انقلابی تجویز یہ ہے کہ غیر ملکی تجارت کو لائسنس پرمٹ کے مروّجہ طریقہ سے آزاد کر دیا جائے، اس وقت تجارتی اجارہ داریوں کا بڑا سبب یہ تجارتی پابندیاں ہیں۔ ملک کا زرمبادلہ پوری قوم کا

مساوی حق ہے، لیکن موجودہ نظام میں عوام کو کاغذ کے نوٹوں کے سوا کچھ نہیں ملتا، نتیجہ یہ کہ سارے زرمبادلہ سے وہ بڑے بڑے سرمایہ دار فائدہ اٹھاتے ہیں جو اپنے جائز وسائل سے غیر ملکی تجارت کا لائسنس حاصل کرلیں، اوپر سے عوام پر یہ بھی پابندی ہے کہ وہ اپنے نجی وسائل کام میں لاکر حکومت سے زرمبادلہ لیے بغیر بھی باہر سے مال نہیں منگوا سکتے، چنانچہ وہ پابند ہیں کہ صرف ان بڑے سرمایہ داروں کا مال خریدیں جو عوام کی اس مجبوری سے فائدہ اٹھا کر گھٹیا چیز مہنگے داموں فروخت کرنے کے عادی ہیں۔ یہ سرمایہ دار پورے بازار کے تنہا اجارہ دار بن کر پوری معیشت پر حکمرانی کرتے ہیں اور عوام کا روپیہ سمٹ سمٹ کر ان کی جھولی میں جاتا رہتا ہے۔

اگر علماء کی تجویز کے مطابق تجارت کو آزاد کردیا جائے تو یہ صورت حال ختم ہوجائے گی، بازار سے اجارہ داریاں ٹوٹیں گی، چھوٹے تاجر میدان میں آئیں گے، ان میں آزاد مقابلہ ہوگا، اور عوام کو اشیائے صرف سستے داموں ہاتھ آسکیں گی۔ عوام کی جیبوں سے روپیہ آج کی نسبت کم نکلے گا اور زیادہ وسیع دائروں میں پھیلے گا، اور دولت کے اس فطری بہاؤ کا خوشگوار اثر پوری معیشت پر پڑنا لازمی ہے۔

کارٹیل طرز کی اجارہ داریوں کی ممانعت

چوتھی انقلابی تجویز یہ ہے کہ کارٹیل کے طرز کی اجارہ داریوں کو ممنوع کردیا جائے جس کے ذریعے بڑے صنعت کار باہم سمجھوتہ کرکے اشیاء کی قیمتیں مقرر کرتے ہیں، اور عوام آزاد مقابلہ کی برکات سے مستفید نہیں ہو پاتے، اسلام میں اس طرح کا اشتراک جو عام گرانی کا سبب بنتا ہو، قطعی طور پر ناجائز ہے اس حکم کو نافذ کرنے سے ان اجارہ داریوں کے قیام کا راستہ بھی بند ہوجائے گا جو باہمی معاہدہ اور سمجھوتہ سے پیدا ہوتی ہیں۔

آڑھت اور دلالی کے درمیان وسائط ختم کرنا

پانچویں انقلابی تجویز علماء نے زرعی پیداوار کی فروخت کے سلسلے میں پیش کی ہے، اور وہ یہ کہ آڑھتیوں اور دلالوں کے درمیانی وسائط ختم کردیئے جائیں، اور کسانوں کی امداد باہمی کی انجمنیں فروخت کا کام انجام دیں، اس تجویز پر عمل کرنے سے ایک طرف کسانوں کو اپنی محنت کا مناسب صلہ مل سکے گا، اور دوسری طرف آڑھتیوں کے بیچ میں سے ہٹ جانے سے بازار میں ارزانی آئے گی۔ ہاں یہ ضروری ہے کہ یہ امداد باہمی کی انجمنیں چھوٹے چھوٹے علاقوں کی بنیاد پر قائم ہوں تاکہ منڈی میں مقابلہ کی فضا باقی رہے، اور گرانی پیدا نہ ہوسکے۔ زراعت کے سلسلے میں بھی جو ظلم وستم کسانوں پر ہوتا

ہے اس کے انسداد کے لئے علماء نے بٹائی کے معاملے کو سدھارنے کی موثر تدبیریں بتائی ہیں، اور ایسی سفارشات بھی پیش کی ہیں جن کے ذریعے کسان اپنی محنت کا پورا پھل پانے کے علاوہ زمینوں کے مالک بھی بن سکیں گے۔

یہاں علماء کی تمام تجاویز کو بالاستیعاب پیش کرنا مقصود نہیں، صرف چند نمایاں تجاویز کے نتائج و اثرات کا ذکر کیا گیا ہے، جن سے اتنی بات واضح ہو سکتی ہے کہ علماء نے یہ تجاویز پوری معاملہ فہمی کے ساتھ حقیقت پسندی کے ماحول میں مرتب کی ہیں، پورے خاکہ کا بغور مطالعہ کرنے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اس میں سیاسی نعرہ بازی کا انداز اختیار کرنے کے بجائے معاملات کا علمی سنجیدگی کے ساتھ جائزہ لیا گیا ہے، مثلاً آج اجرتوں میں اضافہ کے نعروں کا بہت زور ہے لیکن علماء نے اس کو زیادہ اہمیت دینے کے بجائے ملک سے عام گرانی کو ختم کرنے پر زور دیا ہے، اور واقعہ یہ ہے کہ اگر مزدور کی تنخواہ دوگنی کر دی جائے لیکن اشیائے صرف کی گرانی میں تین گنا اضافہ ہو جائے تو اس سے گھاٹا پھر بیچارے مزدور ہی کا ہے، عوام کا اصل مسئلہ آمدنی کی کمی سے زیادہ اخراجات کی زیادتی کا ہے، اور معیشت کی اصلاح کا کوئی اقدام اس وقت تک عوام کے حق میں مفید نہیں ہو سکتا جب تک عام گرانی کو ختم نہ کیا جائے خوشی کی بات ہے کہ علماء نے اس بنیادی نکتے کا ہر قدم پر لحاظ رکھا ہے۔

اسی طرح ہماری معاشی مشکلات بڑی حد تک خود ہماری پیدا کی ہوئی بھی ہیں، ہم نے طرزِ زندگی کو اتنا پر تکلف اور مصنوعی بنالیا ہے کہ ہماری معیشت کی چادر اس کے لئے کافی نہیں ہو رہی، علماء نے بالکل ٹھیک کہا ہے کہ جب تک سادہ طرزِ معیشت کو ایک تحریک کی شکل میں نہیں اپنایا جائے گا اور ملک کے حکام اور دولت مند افراد اس تحریک کی ابتداء اپنے آپ سے نہیں کریں گے، اس وقت تک ہم عام خوش حالی کی برکتوں سے فائدہ نہیں اٹھا سکیں گے۔ فقر و فاقے کا شب و روز رونا رونے کے ساتھ ساتھ ہم نے جن عیاشیوں کو جزوِ زندگی بنالیا ہے وہ ہر حیثیت سے گھر پھونک کر تماشا دیکھنے کے مترادف ہیں، اور انہیں سختی سے چھوڑے بغیر ہم اپنی اصلاح نہیں کر سکتے۔

علماء کی یہ تجاویز اپنے عملی نفاذ کے لئے بیشک کچھ وقت اور محنت چاہتی ہیں، لیکن قوم کی بگڑی ہوئی حالت کو راتوں رات نہیں سنوارا جا سکتا، کھل جا سم سم کا ایسا نسخہ کسی بھی نظامِ معیشت کے پاس نہیں ہے جو وقت اور محنت کے بغیر کوئی معاشی انقلاب لے آئے، ہاں یہ بات پورے یقین، اعتماد اور وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ ہمارے ملک میں کوئی بھی معاشی انقلاب اتنی آسانی سے نہیں آ سکتا جتنی آسانی سے اسلامی انقلاب آ سکتا ہے اس کی بڑی وجہ جہاں اسلامی شریعت کی دی ہوئی آسانیاں ہیں، وہاں ہماری قوم کا وہ ٹھیٹھ دینی مزاج اور اسلامی جوش و خروش بھی ہے جو اسے بڑی سے بڑی قربانی

دینے کے لئے تیار کر دیتا ہے، شرط یہ ہے کہ اسے یہ بھروسہ ہو کہ اسلام کا صرف نام استعمال کرنا پیش نظر نہیں بلکہ اسے سچے دل سے نافذ کرنا مقصود ہے۔

ہماری قوم اپنی ہزار خامیوں کے باوجود بحمد اللہ اب بھی مسلمان رہ کر ہی جینا اور مرنا چاہتی ہے، اور اس کے لئے تن من دھن کی بازی لگانے کو آج بھی تیار ہے، ۱۹۴۷ء اور ۱۹۶۵ء میں دنیا اس کا یہ حسین کردار کھلی آنکھوں دیکھ چکی ہے، اور اگر کبھی اس ملک کی کشتی نے حقیقی اسلام کی طرف رخ موڑا تو دنیا پھر دیکھ لے گی کہ اس کے رگ و پے میں اسلام کو جذب کرنے کی کتنی حیرت انگیز صلاحیت ہے۔

اس کے برخلاف اگر خدانخواستہ یہاں سوشلزم لایا گیا تو قطع نظر اس سے کہ وہ مفید ہے یا مضر، اسے عملاً نافذ کرنے میں ناقابل عبور مشکلات ہوں گی، اس ملک کے عوام کا اسلامی شعور قدم قدم پر آڑے آئے گا، اور یہ قوم کبھی بھی سچے دل کے ساتھ اس نظام کو جذب و قبول نہیں کر سکے گی۔

اب ضرورت اس کی ہے کہ علماء کے اس متفقہ معاشی خاکے کی روشنی میں اسلامی اصلاحات کی طرف عملی قدم اٹھایا جائے، ہماری رائے میں تمام اسلامی نظام چاہنے والی جماعتوں کو چاہئے کہ وہ ان ۲۲ نکات کو اپنے منشور میں شامل کریں، اور انہیں عملاً نافذ کرنے کی جدوجہد شروع کر دیں۔

ہمارے معاشی مسائل

اوران کے اسلامی حل کی مختلف تجاویز

یہ اصل میں جناب ڈاکٹر سید محمد یوسف صاحب کا ایک مضمون ہے جس میں موصوف نے ہمارے نظامِ معیشت کے چند بنیادی مسائل سے بحث فرمائی ہے، اور علماء کی طرف سے جو اقتصادی پروگرام پیش کیے جاتے رہے ہیں، ان پر اظہار رائے کیا ہے، فاضل مضمون نگار کی خواہش کے مطابق آخر میں ہم نے اس سلسلہ میں اپنی رائے بھی قدرے تفصیل کے ساتھ پیش کردی ہے، اور اس طرح ان دونوں مضمونوں نے ایک قلمی مذاکرہ کی صورت اختیار کرلی ہے، امید ہے کہ یہ مذاکرہ اہلِ علم وفکر کے لئے دلچسپی کا باعث ہوگا۔ م۔ت۔ع

ہمارے معاشی مسائل
اور ان کے اسلامی حل کی مختلف تجاویز

سوشلزم کے مقابلے میں علماء کرام جو اقتصادی پروگرام پیش کر رہے ہیں وہ اجتہاد کے درجہ میں ہے، علماء اجتہاد کے اہل ہیں، اس حقیقت کو علماء سے بہتر کون جان سکتا ہے کہ اگر اختلاف پر قدغن لگائی جائے تو اجتہاد کا صواب و خطا بھی معلوم نہیں ہو سکتا اور یہی امت کے لئے رحمت سے محرومی ہے۔ یہ کتنی بڑی محرومی ہے، اس کا اندازہ اس قوم کو بخوبی ہونا چاہئے جو ابھی دہ سالہ دور ایوبی سے نکلی ہے۔ ایک عرض یہ ہے کہ عوام تو فقہی دلائل کے مخاطب نہیں ہوتے لیکن اگر دینی رسائل میں اس اقتصادی پروگرام کے ساتھ اصولی فقہی دلائل بھی شرح و بسط سے بیان کر دیئے جائیں تو طالب علموں کے لئے باعث طمانیت ہوگا۔ چند امور کی بابت استفسار (لیطمئن قلبی) بے جا نہ ہوگا:

۱۔ جن مغربی مفکرین نے مغرب کے نظامِ حیات کا تنقیدی مطالعہ کیا ہے ان میں مشہور مورخ (TOYNBEE) کو ممتاز حیثیت حاصل ہے۔ انہوں نے ایک بات (میرے خیال میں بڑے پتہ کی) لکھی ہے جو ہمارے لئے بھی قابل توجہ ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ موجودہ دنیا کے گوناگوں مصائب کی علت العلل یہ ہے کہ سائنس اور ٹیکنالوجی سے قومیت و وطنیت متصادم ہے۔ سائنس انسان کے افق کو وسعت دیتی ہے، وطنیت اسے تنگ بناتی ہے، سائنس تعمیم خیر کی طرف آگے بڑھتی ہے، وطنیت سائنس کی خیرات کا استحصار اور استغلال کرتی ہے۔ یورپ میں جس وقت صنعتی انقلاب آیا اسی وقت وطنیت کا جذبہ اٹھا۔ یہ سوء اتفاق تمام عالم کے لئے استعمار و استعباد کی وبا لایا۔ آج مشرق کی پسماندہ اقوام (جنہیں مجاملۃً ترقی پذیر کہا جاتا ہے) مغرب سے سائنس اور ٹیکنالوجی، نقل مطابق اصل وطنیت و قومیت کے ساتھ لے رہی ہیں، اس لئے وطنیت کے نام پر عوام زیر بار ہوتے ہیں اور جتنی صنعت ترقی کرتی ہے دولت چند خاندانوں میں سمٹتی آتی ہے۔

جب یہ صورت نا قابل برداشت ہوگئی ہے تو اس کا علاج یہ تجویز کیا جاتا ہے کہ صنعتوں کی ''تامیم'' کی جائے یعنی انہیں قومی ملکیت میں لے لیا جائے۔ ایک مثال لیجئے: ٹیکنالوجی کے فروغ کا

طبعی نتیجہ یہ ہونا چاہئے کہ مجھے اچھے سے اچھا لٹھا کم سے کم قیمت میں دستیاب ہو، اگر طبعی حالات رہیں تو جیسے جیسے ٹیکنالوجی ترقی کرے گی وطنیت کی بودت بڑھتی جائے گی اور قیمت گھٹتی جائے گی۔ اگر ایسا نہ ہو تو مشین کبھی چرخے کی جگہ نہیں لے سکتی۔ وطنیت اور قومیت ان طبعی حالات کو درہم برہم کرتی ہے تو یہ ہوتا ہے کہ وطن میں بنا ہوا گھٹیا لٹھا مہنگے داموں مجھے فراہم ہوتا ہے۔ یہ جانتے ہوئے کہ ایسا سودا انسانی فطرت کے خلاف ہے مجھ پر جبر کیا جاتا ہے، اور وہ یوں کہ اچھے اور سستے لٹھے کی درآمد ہی بند کر دی جاتی ہے۔ الغرض ٹیکنالوجی مجھے اچھا لٹھا ۵۰ پیسے فی گز مہیا کرتی تو وطنیت بالجبر گھٹیا لٹھا ڈھائی تین روپے گز میرے گلے لگاتی ہے۔

ملکی صنعتیں کیسے قائم ہوتی ہیں؟ مختصراً یہ کہ ملکی پیداوار کی برآمد میں ہمارا پیٹ کاٹ کر اضافہ کیا جاتا ہے (باسمتی چاول، اچھی قسم کی چائے کو ہم ترستے ہیں) جوٹ، کپاس، چاول، چائے وغیرہ سے جو زرمبادلہ حاصل ہوتا ہے اس پر حکومت قابض ہو جاتی ہے (اور ہمیں کاغذ کے نوٹ حوالہ کرتی ہے) اس میں زرمبادلہ کا اضافہ کیا جاتا ہے جو ترقی یافتہ ممالک سے سودی قرضوں کی شکل میں لیا جاتا ہے۔ (کوئی قرضہ سیاسی اغراض سے پاک نہیں ہوتا۔ جب ذرا سر اٹھایا قرضہ بند)

پھر حکومت اس زرمبادلہ کو کسی سرمایہ دار صنعت کار کے حوالے کر دیتی ہے، سرمایہ دار صنعت قائم کرتا ہے اور صنعت کو (PROTECTION) حکومت کی رعایت و حمایت حاصل ہو جاتی ہے یعنی یہ کہ ملک میں صرف ملکی مصنوعات فروخت ہوں گی۔ خواہ وہ کیسی ہی ردی اور مہنگی ہوں۔ اب اس کا بار عام مستہلکین (Consumers) پر پڑتا ہے، عام خریدار کی جیب سے جو بھاری قیمت نکلتی ہے اس کا ایک حصہ ٹیکس کی صورت میں حکومت کو جاتا ہے، باقی سے سرمایہ دار موٹا ہوتا جاتا ہے، عام لوگ اقتصادیات کے ماہر نہ ہوں، ان کا اندازہ روزمرہ کے ٹھوس تجربہ پر مبنی ہوتا ہے، اور بالکل صحیح ہوتا ہے۔ مشہور ہے کہ جو چیز ملک میں بننی شروع ہوتی ہے وہ گراں ہو جاتی ہے۔ اس کی رسد غیر یقینی ہوتی ہے اور دھوکہ اور ملاوٹ کا امکان ہر وقت رہتا ہے۔ معاملہ یہیں تک رہے تو بھی غنیمت ہے۔ آگے چل کر یہ ہوتا ہے کہ سرمایہ دار کو جب ایوب کی لیگ میں چندہ دینا ہوتا ہے وہ کپڑے کی مصنوعی قلت پیدا کر دیتا ہے، پھر قیمت بڑھا دیتا ہے۔ مہنگائی مزدور کی کمر توڑتی ہے، سرمایہ دار مزدور کا استحصال کیے جاتا ہے، حکومت (Indirect Taxes) میں اضافہ کرتی ہے اور سرمایہ دار کو خون چوسنے کی اجازت (شہ) دیتی ہے۔ آئے دن اشیاء کی قلت، قیمتوں کا آسمان سے باتیں کرنا، عوام کی غربت میں اضافہ، مزدور کی ناقابل برداشت بدحالی، اور سرمایہ دار کے سرمایہ میں اضافہ، یہ سب نتیجہ اس (Protection) کا ہے جو وطنیت کے نام پر دیا جاتا ہے، جب سرمایہ دار کی لوٹ کھسوٹ منظر عام

آجاتی ہے، جیسا کہ آج پاکستان میں ہے[۱] تو حکماء مغرب کا ہی تجویز کردہ علاج ''تامیم'' ہے۔ تامیم سے غرض یہ ہوتی ہے کہ خریدار کی جیب سے جو رقم نکلتی ہے وہ سرمایہ دار کی تجوری میں جانے کے بجائے حکومت کے خزانے میں جائے اور رفاہ عام کے کاموں میں خرچ ہوتا کہ اس کا فائدہ لوٹ کر عوام کو پہنچے۔

تنقیح طلب باتیں یہ ہیں:

(الف) خالص شرعی نقطہ نظر سے اس کا کیا جواز ہے کہ حکومت درآمد بند کر کے عام مستہلکین کو مجبور کرے کہ وہ کسی ایک یا معدودے چند سرمایہ داروں کی مصنوعات ان کی من مانی غیر معقول قیمت پر خریدیں اور مسلسل عمداً اشیاء کی قلت اور قیمتوں میں اضافہ برداشت کریں؟ کیا ایک ہی ملک میں یہ جائز ہوگا کہ مثلاً سندھ کے چند زمیندار پنجاب سے غلہ کی درآمد پر پابندی لگوادیں اور سندھ کے لوگوں کو اپنی من مانی قیمت پر غلہ فروخت کریں؟ کیا رسالت یا خلافت راشدہ کے عہد میں کوئی مثال ایسی ملتی ہے جس پر اس مسئلہ کو قیاس کیا جائے؟ (Protection) کا تصور کہاں تک اسلامی اصولوں سے میل کھاتا ہے؟[۲]

(ب) تامیم کے خلاف جتنی دلیلیں اس وقت تک نظر سے گزری ہیں وہ سب عقلی ہیں، نوکر شاہی مسلط ہو جائے گی، کارکردگی کا معیار گر جائے گا، مزدور کے حق میں کچھ بہتر نہ ہوگا، وغیرہ، وغیرہ۔ اگر کوئی نص شرعی اس کے خلاف نہیں ہے تو پھر اختلاف رائے برداشت کرنا چاہئے۔ تامیم کے ذکر پر الحاد

(۱) پاکستان ہی پر موقوف نہیں، ہندوستان بھی آج اسی مرحلہ میں ہے۔ مسز اندرا گاندھی جس کشمکش میں مبتلا ہیں، وہ اسی کا رمز ہے۔ ایشیا اور افریقہ کے تمام ترقی پذیر ممالک کا یہی حال ہے۔ سرمایہ دارانہ تصنیع (Industriali-sation) کی راہ کے ممالک کو اس مقام سے گزرنا ہی پڑتا ہے۔

(۲) ملکی صنعتوں کے قیام کا وہ طریقہ کار جس کا ہلکا سا خاکہ اوپر بیان ہوا آج کی دنیا میں ترقی کے دین کا کلمہ شہادت بن چکا ہے۔ اس کی بابت جو ذرا لب کشائی کرے اسے یکسر ترقی کا منکر قرار دیا جائے گا۔ یہ صرف علماء کی شان ہے کہ وہ اللہ کے دین کے معاملہ میں ''لومۃ لائم'' سے نہیں ڈرتے۔ ربوا بھی صنعتی ترقی کے لئے ناگزیر سمجھا جاتا ہے۔ بعض علماء نے اس مسئلہ میں کمزوری دکھائی، جمہور علماء نے ان کی ایک نہ چلنے دی لیکن (Protection) اور تسعیر (جس کا ذکر آگے آتا ہے) کے اصول کو علماء بآسانی قبول کرتے دکھائی دیتے ہیں، ان دونوں کا محل استعمال یا کیفیت استعمال نہیں بلکہ بنیادی تصور تنقیح طلب ہے۔ یہ دونوں اقتصاد کے فطری عوامل کو درہم برہم کرتے ہیں۔ کیا یہ اسلام کے منافی نہیں؟ یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ صنعتی ترقی کی سرپرستی کی خاطر مولانا محمد ادریس میرٹھی دوسرے ملکوں سے قرضے لینا اور ان کو سود ادا کرنا ناگزیر (اور شاید جائز) لکھتے ہیں (بینات دسمبر ۱۹۶۹ء، ص ۲۱) ایک ہی صفحہ بعد (ص ۲۳ پر) اس حدیث کا ذکر ہے: لعن رسول اللّٰہ آکل الربوا وموکلہ......! بظاہر مولانا سے سہو ہوگیا۔ اگر دوسرے ملکوں سے سودی قرضے لینا ناجائز قرار پائے تو صنعتی ترقی کی ایک بیساکھی تو پہلے ہی ٹوٹ کر گر جائے گی۔

کا خیال کیوں آئے؟ علماء خود کہہ رہے ہیں کہ بعض صنعتیں حکومت چلائے اور کپڑے کی صنعت کو ہاتھ نہ لگائے؟ میری مراد شرع کی بنیاد سے ہے، ویسے تامیم کے موافق مخالف ہر قسم کی دلیلوں سے اقتصادیات کی کتابیں بھری پڑی ہیں۔

ایک حدیث سبھی کو معلوم ہے، ان دنوں دینی رسائل میں اسے کہیں کہیں نقل کیا جاتا ہے، لیکن اس پر غور و فکر نہیں کیا جاتا۔ میرے خیال میں اسے بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ چاہتا ہوں کہ میرے خیال کی توثیق یا تردید ہو جائے۔ رسول اللہ ﷺ سے درخواست کی گئی اور آپ نے بننے سے انکار کر دیا۔

روی انس قال: غلا السعر علی عهد النبیﷺ فقالوا یارسول اللّٰه! لو سعرت لنا، فقال ان اللّٰه هو القابض الرازق الباسط المسعر، وانی لارجو ان القی اللّٰه ولا یطالبنی احد بمظلمة ظلمتها ایاه فی دم ولا مال، رواه ابوداؤد، والترمذی و صححه

روی ابوداؤد وغیره حدیث العلاء بن عبدالرحمٰن عن ابیه عن ابی هریره رضی اللّٰه عنه قال: جاء رجل الیٰ رسول اللّٰهﷺ فقال یا رسول ا للّٰه سعرلنا، فقال بل اللّٰه یرفع و یخفض، وانی لارجو ان القی اللّٰهولیست لاحد عندی مظلمة

میرے خیال میں اسلام کے اقتصادی نظام کا حجر الزاویہ یہ اصول ہے کہ حکومت مسعر کا منصب نہ اختیار کرے۔ جہاں تک ممکن ہو حکومت کو تسعیر کی ذمہ داریاں نہیں سنبھالنی چاہئیں، بالفاظ دیگر اقتصاد کو حکومت کی دخل اندازی کے بغیر طبعی عوامل کے تابع رہنا چاہئے۔

ابن قیم الجوزیہ نے "الطرق الحکمیه فی السیاسته الشرعیه" (مصر، ۱۳۱۷ھ، ص۲۲۳ و مابعد) میں تسعیر کی مختلف صورتوں سے بحث کی ہے۔ اس سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے کہ جہاں خود غرض عناصر "التواطاء علی الاغلاء" کے مرتکب ہوں وہاں حکومت مجبوراً دخل انداز ہو کر "التقویم بقیمة المثل" لازم کرے اور اقتصاد کے فطری عوامل کو سنبھالا دے۔ قیمۃ المثل حکومت اپنی طرف سے مقرر نہیں کرتی۔ قیمۃ المثل تو وہ ہوتی ہے جو السوق الحرۃ میں فطری عوامل کے تحت آپ اپنا تعین کرتی ہے۔ حکومت صرف قیمۃ المثل کی تشخیص و اکتشاف کرتی ہے، اور خود غرض عناصر کے تلاعب سے اسے بچاتی ہے۔

آج تسعیر کے معنی یہ لئے جاتے ہیں کہ فطری عوامل کو کالعدم کر کے حکومت یہ اختیار سنبھال لیتی ہے کہ وہ قیمتوں اور اجرتوں کی تجویز و تعیین کرے، اس کی ضرورت یوں پیدا ہوتی ہے کہ حکومت خود

درآمد و برآمد پر پابندی لگاتی ہے، استبدادی طریقوں سے صنعتیں قائم کرتی ہے، صنعتوں کو وطنیت کے نام پر (Protection) دیتی ہے، مخصوص مصنوعات کو بالجبر مستہلکین کے گلے لگاتی ہے۔ من مانی قیمتیں رائج کرتی ہے۔ ہر دوصورتوں میں سرمایہ دار صنعت کاروں کی من مانی اور بصورت دیگر خود حکومت کی من مانی (تب ہی تو آپ دیکھتے ہیں کہ اجرتوں کا نیلام ہو رہا ہے اور تمام سیاسی جماعتیں بڑھ بڑھ کر بولی بول رہی ہیں، کون کہہ سکتا ہے کہ ۱۵ اکتوبر ۷۰ء کے بعد اجناس کی قیمتوں کی سطح کیا ہوگی؟ اور دیگر عوامل کس طرح اثر انداز ہوں گے؟ ان ہی صنعتوں کی خاطر یا تو تجارت کو حکومت اپنے ہاتھ میں لے لیتی ہے یا اپنے نرغے میں رکھتی ہے۔ لائسنس پرمٹ کا سراسر گندا گھناؤنا سلسلہ "زادالطین بلته" کا مصداق ہے۔ الغرض آج حکومت جو کرتی ہے وہ تسعیر نہیں، بلکہ وہ ہے جس کے لئے تسعیر کی ضرورت ہوتی ہے۔ حکومت کی طرف سے بغی و فساد ہے جیسے تسعیر کا نام دیا جاتا ہے۔

ابن قیم الجوزیہ نے اپنے زمانہ (آٹھویں صدی کے وسط) تک ان حالات کا جائزہ لیا ہے جن میں تسعیر کی ضرورت مقصود ہو سکتی ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ اس وقت تک کوئی ایسی چیز نہ تھی جس سے (Protection) کے لئے سند حاصل کی جائے، صرف ایک مثال ایسی ہے جس پر اسے کسی حد تک قیاس کیا جا سکتا ہے، دیکھئے اس سے کیا نتیجہ نکلتا ہے:۔

> ومن اقبح الظلم ایجار الحانوت علی الطریق او فی القریة باجرة معینة علی ان الا یبیع احد غیره فهٰذا ظلم حرام علی الموجر و المستاجر، وهو نوع من اخذ اموال الناس قهرًا واکلها بالباطل، وفاعله قد تحجرواسعًا فیخاف علیه ان یحجراللّٰهعنه رحمته کما حجر علی الناس فضله و رزقه (ص: ۲۲٤)

یہ آج حکومت کو جو اختیارات دیئے جارہے ہیں وہ "نوع من اخذ اموال الناس قهرا" اور "تحجر واسعًا" کے ذیل میں آتے ہیں یا نہیں؟ جب ماہر اقتصادیات یہ بات تسلیم کر لیتا ہے کہ قہر اور جبر کی صورت پائی جاتی ہے تبھی تو وہ تامیم کی طرف جاتا ہے تا کہ اس قہر اور جبر سے اموال الناس سرمایہ دار کی تجوری میں نہ جائیں بلکہ حکومت کے واسطہ سے ان کا فائدہ عوام الناس کو واپس پہنچ جائے (میرا مقصد تامیم کی حمایت نہیں، تسعیر کا ابطال ہے۔)

یہ بھی حقیقت ہے کہ تسعیر کا سلسلہ لامتناہی ہے، ایک مرتبہ شروع ہو تو کبھی ختم ہونے میں نہیں آتا۔ تسعیر کے معنی یہ ہیں کہ اقتصاد کا جسم مزمن مرض میں مبتلا ہے، داخلی قوت مدافعت کھو چکا ہے، ایک ہمہ وقتی معالج دواؤں سے اسے زندہ رکھنے کی کوشش میں لگا ہوا ہے۔ جس طرح دوائیں کثرت

استعمال سے کچھ عرصہ بعد بے اثر ہو جاتی ہیں، اسی طرح ہر تسعیر کچھ عرصہ کے بعد بیکار ہو جاتی ہے۔ جتنی تخطیط، تصمیم اور تسعیر آج مغربی ترقی یافتہ ملکوں میں ہے وہ ہمارے سامنے ہے، لیکن کسی طبقہ کو اطمینان چین نصیب نہیں، آئے دن یہ ہوتا ہے کہ حالات قابو سے باہر ہو جاتے ہیں اور بڑے پیانہ پر اقتصادی بحران اور مالی بدنظمی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ حکومت اجرت کا تعین کرے، حکومت اشیاء کی قیمتوں کا تعین کرے، حکومت بٹائی کی شرح کا تعین کرے، یہ کوئی دیرپا اور اطمینان بخش حل نہیں معلوم ہوتا۔

نظام اراضی کا مسئلہ بھی خاصا غور طلب ہے، یہ بنیادی مسئلہ ہے اس معنی میں کہ آج جو فساد بپا ہے وہ محض سرمایہ داری کا نہیں بلکہ سرمایہ داری اور جاگیرداری کے گٹھ جوڑ کا نتیجہ ہے۔ مقصد یہ ہے کہ سرمایہ داری میں کبھی اتنی بے مروتی (''احساس مروت کو کچل دیتے ہیں آلات'') نہ آتی اگر اس کے پس منظر میں جاگیرداری (Feudalism) نہ ہوتی۔ پہلے جاگیرداری زمینداری ایک انسان کو مجبور بناتی ہے پھر سرمایہ داری کی مجبوری کی بناء پر اس کی محنت کا استغال کرتی ہے۔ یورپ میں یہی ہوا۔ یہی ہمارے یہاں ہو رہا ہے بالخصوص ایک زراعتی ملک میں جیسا کہ ہمارا ملک ہے، کسان تو کسان، صنعتی مزدور کا کوئی مسئلہ حل نہیں ہو سکتا۔ جب تک نظام اراضی عدل کی بنیاد پر استوار نہ ہو۔

نظام اراضی کی بابت دو مذاہب بالکل جدا اور ممتاز ملتے ہیں:

ایک یہ کہ غیر محدود ملکیت اراضی فرد کا شرعی حق ہے، خواہ عن طریق الشراء ہو یا عن طریق الاقطاع۔ اس حق کے بقاء اور استعمال کے لئے ضروری ہے کہ مزارعت بھی جائز ہو اور اکراء الارض بالذہب والفضہ بھی جائز ہو۔ چنانچہ ابن قیم الجوزیہ کہتے ہیں:

> قال شیخ الاسلام وغیرہ من الفقھاء: والمزارعة احل من المؤاجرة و اقرب الی العدل، فانھما یشترکان فی المغرم و المغنم، بخلاف المؤاجرة فان صاحب الارض یسلم له الاجرة و المستاجر قد یحصل له زرع و قد لا یحصل و العلماء مختلفون فی جوازھما سواء کانت الارض اقطاعا او غیرہ قال شیخ الاسلام ابن تیمیة: وماعلمت احدًا من علماء الاسلام من الائمه ولاغیرھم قال اجارة الاقطاع لاتجوز و مازال المسلمون یؤجرون اقطاعاتھم قرنابعد قرن من زمن الصحابة الی زمننا ھذا حتی حدث بعض اھل زماننا فابتدع القول ببطلان اجارةالاقطاع و ولی الا یاذن للمقطع فی الاجارة، فانه انما اقطعھم لینتفعوا بھا اما بالمزارعة و بالاجارة ومن منع الانتفاع بھا بالاجارة و المزارعة فقد افسد علی المسلمین دینھم و

دنیاھم و الزم الجندلو الامراء ان یکونوا اھم الفلاحین، وفی ذالك من الفساد مابقه(حواله سابقه ص ۲۳۱، ۲۳۲)

دوسرا مذہب یہ ہے کہ المزارعۃ (بشروطہا) جائز لیکن اکراء الارض بالذہب والفضہ ناجائز ابن حزم کہتے ہیں:

ان النبی صلعم قدم علیھم و ھم یکرھون مزارعھم کما روی رافع وغیرہ وقد کانت المزارع بلاشك تکری قبل رسول اللّٰہ وبعد مبعثه ھذا امرلا یمکن ان یشك فیه ذوعقل، ثم صح من طریق جابر و ابی ھریرۃ وابی سعید ورافع ظھیر البدری و آخر من البدریین و ابن عمر: نھیٰ رسول اللّٰہ ﷺ عن کراء الارض فبطلت الا باحة بیقین لا شك فیه، فمن ادعیٰ ان المنسوع (اباحة الکراء) قدرجع، وان تعین النسخ قد بطل، فھو کاذب مکذب قائل مالاعلم له به، وھذاحرام بنص القرآن، الا ان یاتی علی ذلك ببرھان، ولا سبیل الی وجوده ابدا الا فی اعطائھا بجزء مسمی مما یخرج منھا (کالثلث و الربع)فانه قد صح ان رسول اللّٰہ ﷺ فعل ذلك بخیبر بعد النھی باعوام وانة بقی علی ذلك الی ان مات علیه السلام (المحلی ۲۲٤/۸)

ابن حزم کے مذہب سے اختلاف سہی لیکن علم، اخلاص اور تقویٰ کے لحاظ سے ان کا درجہ ایسا تو نہیں کہ ان کی بات توجہ سے نہ سنی جائے۔ اگر آج کوئی ابن حزم کی سی بات کہے تو کہا جاسکتا ہے کہ اس کا علم ناقص ہے، یا اسے مغالطہ ہوگیا ہے لیکن یہ تو لازم نہیں آتا کہ وہ ملحد ہو[1]

[2] خیر یہ تو جملہ معترضہ تھا۔ کہ ان دونوں مذاہب میں سے جو بھی راجح اور جو بھی مرجوح قرار پائے، یا یوں کہیئے کہ جو بھی صحیح اور جو بھی باطل ہو دونوں کی ایک منطق ہے اور دونوں کی قوی یا ضعیف جیسی کچھ ہو، سند ہے۔

اب دیکھئے زمینداروں کا ظلم وستم مسلم ہے، حقائق سے انکار ناممکن ہوگیا ہے، پہلا مذہب جس

---

(۱) یہ تجویز ایک سیاسی جماعت کے سیاسی منشور کا جزو ہے، معلوم نہیں علماء نے اس پر صاد کیا یا نہیں۔

(۲) البعث الاسلامی، لکھنؤ میں الحاد کے لئے جگہ پانا غیر متصور ہے۔ عدد یولیو ۱۹۶۹ میں الاستاذ محمود ابوالسعود لکھتے ہیں:۔

الا رجح عندنا ان للفردان یملك الارض الزارعیة، وذلك لا شك استغلال لراس المال،ولکن لیس له قطعا ان یکریھا ولعمری ان اشتراط کراء الارض　(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں)

پر تعامل رہا ہے اس کے نتائج ہمارے سامنے ہیں اور بالا تفاق انسانیت سوز ہیں، ان حالات میں اب پہلے مذہب پر اڑے رہنا ناممکن ہو گیا ہے چنانچہ تحدید ملکیت اراضی کی تجویز پر ''اسلامیات'' کی مہر لگا دی گئی یہ تحدید ملکیت اراضی کی اساس شرعی ہے یا عقلی (یا محض سیاسی)؟ کیا تحدید ملکیت اراضی کا مسئلہ کبھی ائمہ سلف کے سامنے آیا ہے؟ بہر حال یہ جو مغربی پاکستان میں سو اور دو سو ایکڑ کی اور مشرقی پاکستان میں سو بیگھ کی حد تجویز کی جاتی ہے یہ حد تو شرع کی مقرر کردہ نہیں ہے۔

اب جب آپ نے تحدید ملکیت اراضی کے اصول کو عدل کا تقاضا سمجھ کر مان لیا تو اگر کوئی اس کی حد کچھ اور مقرر کرے تو شرعی نقطہ نظر سے اس کو ماننے میں تامل تو نہ ہوگا؟ اس کی حد ایسی بھی ہو سکتی ہے کہ ہرا لگے نہ پھٹکری زمینداری کا خاتمہ ہی ہو جائے۔

یوں نہیں تو یوں لیجئے کہ تعامل غیر محدود ملکیت اراضی پر بھی ہو رہا ہے۔ اور اکراء الارض کے جواز پر بھی۔ جب ملکیت اراضی کی تحدید قابل قبول ہے تو اکراء الارض پر پابندی لگانے میں کیا تامل ہے؟ اکراء الارض کا حق بھی چنداں مقدس نہیں، جاگیرداروں سے یہ حق واپس لینے کی تجویز ہے، اب صرف اتنی بات رہ گئی کہ غیر عامل غیر حاضر زمیندار کو (تعامل کی یادگار کے طور پر) باقی رکھا جائے یا اس کے جبر اور مفت کی کمائی کا کسی نہ کسی صورت دفعیہ کیا جائے۔

اسی ذیل میں یہ بھی قابل غور ہے کہ جس کی آمدنی ایک ہزار روپے ماہوار سے زیادہ ہو (اور مفروض یہ ہے کہ اس کی آمدنی حلال طیب ہے اور اس کا مال مال مزکی ہے) وہ بڑی بڑی صنعتوں کے حصص نہیں خرید سکتا۔ یہ اصول کہ مال کے استغلال اور تمیہ کے ایک جائز طریقے پر پابندی لگائی جا سکتی ہے اس کی سند اور ائمہ سلف کے یہاں اس کی کیا نظیر کیا ہے جس پر اس کو قیاس کیا جا سکے؟ آج ایک طبقہ کے لیے صنعتوں میں شمولیت ممنوع ہوئی، کل یہ سلسلہ آگے بڑھے گا جب تک شریعت یہ حد مقرر نہ کرے کسی کی عقل کو کیسے روکا جا سکتا ہے؟ مال کے استغلال اور تمیہ پر پابندی لگانا خطرناک ہے۔ اس کا نتیجہ وہی ''کنز'' ہو سکتا ہے جس پر ''آیۃ الکنز'' یاد آتی ہے۔ ایک بات یہ بھی ہے کہ اس میں طبقاتی کشمکش کا اعتراف پنہاں ہے۔

سید محمد یوسف

شعبہ عربی۔ جامعہ کراچی، ۱۳ جنوری ۷۰ء

نظیر مبلغ معین من ذهب اوفضة لهوامعن فی الخطاء، واقمن بالحکم بالتحریم لابالتحلیل، وابعدما یکون عن منطق الاسلام السلیم و جدیران لا یکون صادراًعن رسول اللّٰهصلعم،اذ کیف یابی توجر الارض بجز ممایخرج منها، ثم یری ان یدفع المستاجر بصاحبهاحصة معینة من ذهب اوفضة؟ (ص ٤٦)

تجاویز پر تبصرہ

جناب ڈاکٹر سید محمد یوسف (صدر شعبہ عربی جامعہ کراچی) ہمارے ملک کے معروف دانشوروں میں سے ہیں، اور البلاغ اور مدیر کے دیرینہ کرم فرما ہیں، انہوں نے اپنے اس مضمون میں موجود معاشی صورت حال اور اس کی اصلاح سے متعلق چند فکر انگیز مسائل اٹھائے ہیں، اور کہیں کہیں ضمناً ان معاشی پروگراموں پر بھی مختصر تبصرہ فرمایا ہے۔ جو مختلف دینی حلقوں کی طرف سے اب تک پیش کیے گئے ہیں، ساتھ ہی موصوف نے مدیر البلاغ کو اس بات کی اجازت بھی دی ہے کہ وہ ان مسائل سے متعلق اپنا موقف پیش کرے۔ چونکہ یہ مسائل وقت کی ضرورت کے مسائل ہیں، اور ان پر بحث و گفتگو البلاغ کے اولین مقاصد میں شامل ہے، اس لئے ہم اس سلسلے میں اپنی گزارشات بھی اس مضمون کے ساتھ پیش کر رہے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب کے مضمون کے دو حصے ہیں، ایک صنعت و تجارت سے متعلق ہے، اور دوسرا زراعت سے۔ صنعت و تجارت کے بارے میں ان کے ارشادات کا خلاصہ جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں۔ یہ ہے کہ سرمایہ داری کی موجودہ خامیوں کا اصل سبب صنعتوں کی تامین (Protection) ہے، درآمد و برآمد کی پابندیوں کی وجہ سے وہ زرمبادلہ جو پوری قوم کا حق تھا، چند بڑے بڑے صنعت کاروں کے تصرف میں آجاتا ہے، وہ اس سے صنعتیں قائم کرتے ہیں، اور جب حکومت ان صنعتوں کو تحفظ دینے کے لئے درآمد پر پابندیاں لگاتی ہے تو بازار پر ان صنعت کاروں کی اجارہ داری قائم ہو جاتی ہے اور وہ عوام سے من مانی قیمتیں وصول کرتے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب کے ارشاد کے مطابق اس صورت حال کے دو علاج اب تک تجویز کیے گئے ہیں، ایک یہ کہ صنعتوں کی تامیم (Nationalization) کی جائے (یعنی انہیں قومی ملکیت میں لے لیا جائے) تاکہ جو زائد نفع صرف صنعت کار اٹھا رہے ہیں، اس سے حکومت کے واسطے سے تمام عوام مستفید ہوں، اور دوسرے یہ کہ صنعتوں کی موجودہ انفرادی ملکیت برقرار رہے، لیکن حکومت تسعیر (Rate Control) کا ایسا نظام نافذ کر دے جس میں کوئی شخص اجارہ داری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے من مانی قیمتیں مقرر کر کے عوام پر دباؤ نہ ڈال سکے۔

ڈاکٹر صاحب کو اس دوسرے حل (یعنی تسعیر) پر شرعی اور عقلی دونوں اعتبار سے اعتراض ہے، شرعی اعتبار سے انہوں نے ان احادیث سے استدلال کیا ہے جن میں تسعیر کی ممانعت آئی ہے اور عقلی اعتبار سے ان کا کہنا یہ ہے کہ موجودہ حالات میں "تسعیر" بغی و فساد کے علاوہ کچھ نہیں، اس کے ذریعہ وہ

بھی یا تو سرمایہ داروں کے اشارے پر کھیلتی ہے یا ''تسعیر'' کے ذریعہ دوسرے سیاسی مقاصد حاصل کر کے عوام کو گمراہ کرتی ہے۔

دوسرے حل کو رد کر دینے کے بعد ڈاکٹر صاحب اس موضوع پر غور و فکر کی دعوت دیتے ہیں کہ تامیم (قومی ملکیت میں لینے) کا جو حل پیش کیا گیا ہے اس کو رد کرنے کی کوئی شرعی دلیل بھی ہے یا محض چند دلیلوں کی وجہ سے علماء کی طرف سے رد کیا جا رہا ہے؟ ہماری رائے میں ڈاکٹر صاحب کا یہ فرمانا تو بالکل بجا ہے کہ لائسنس پرمٹ کا مروجہ نظام، درآمد و برآمد کی پابندیوں اور صنعتوں کی تامین اجارہ داریوں اور ارتکاز دولت کا بہت بڑا سبب ہے، حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مدظلہم نے بھی البلاغ ماہ رمضان ۸۹ھ کے اداریئے میں لکھا تھا:

> ''لائسنس اور پرمٹ کا مروجہ طریقہ بھی تجارتی اجارہ داریوں کے قیام میں بہت بڑا معاون ہوتا ہے، آج کل ہو یہ رہا ہے کہ صرف بڑے سرمایہ داروں کو سیاسی رشوت اور خویش پروری کے طور پر بڑے بڑے لائسنس دے دیئے جاتے ہیں جس کے نتیجے میں صنعت و تجارت پر ان کی خود غرضانہ اجارہ داری قائم ہو جاتی ہے، اس سے ایک طرف تو گرانی بڑھتی ہے، دوسری طرف تھوڑے سرمایہ والوں کے لئے بازار میں آنے کا راستہ بند ہو جاتا ہے'' (ص ٦)

موجودہ معاشی مسئلہ کا اصل حل

لیکن اس صورت حال کا اصل علاج ہماری رائے میں نہ تامیم (Nationlization) ہے اور نہ تسعیر (Rate Control)، ہماری رائے میں اس صورت حال کا اصلی علاج، جو ایک اسلامی حکومت کا ہدف ہونا چاہئے یہ ہے کہ اجارہ داریوں کو توڑ کر آزاد مقابلہ (Free Competition) کی فضا پیدا کی جائے جس میں قدرتی طور پر تمام اشیاء و خدمات (Goods and Services) کی قیمت ان کی ذاتی قدر (IntrinsicValue) یا افادہ (Utility) کے مطابق متعین ہو سکے، اور ایسی فضا پیدا کرنے کے لئے مندرجہ ذیل اقدامات ضروری ہیں:

(۱) تجارت کو بتدریج آزاد کیا جائے اور درآمد و برآمد کی پابندیاں اٹھالی جائیں۔

(۲) سود، سٹہ اور قمار کو ممنوع قرار دیا جائے۔

(۳) معیشت کو سود کے بجائے شرکت و مضاربت کے اصولوں پر قائم کیا جائے جن کے ذریعہ بینک میں جمع ہونے والی عوامی دولت کا نفع عوام کو ہی پہنچے، صرف چند سرمایہ داروں کو نہیں۔

(۴) کارٹیل جیسے معاہدات کو ختم کیا جائے۔

تسعیر کی فقہی حیثیت

''تامیم'' کے مقابلے میں ''تسعیر'' (Rate Control) کی جو تجاویز علماء کی طرف سے پیش کی جارہی ہیں، وہ اسلامی معیشت کے اصل منشاء کی تعبیر نہیں، بلکہ عبوری دور کے لئے محض ایک وقتی اور ہنگامی تجویز ہے، اسلام کا اصل منشاء بلاشک وشبہ یہی ہے کہ قیمتوں کی تعیین مصنوعی طریقوں کے بجائے آزاد رسد وطلب کے فطری عوامل کے ذریعہ ہو، اور اسی حقیقت کو حضرت انس رضی اللہ عنہ اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی ان احادیث میں بیان کیا گیا ہے جو ڈاکٹر صاحب نے تسعیر کے بارے میں نقل فرمائی ہیں، اور اسی وجہ سے امام ابوحنیفہؒ ''تسعیر'' کو جائز قرار نہیں دیتے، لیکن مشکل یہ ہے کہ اجارہ داریوں کو توڑ کر آزاد پیدا مسابقت کرنا موجودہ حالات میں ایسا کام نہیں ہے جسے جھٹ پٹ انجام دے دیا جائے، درآمد و برآمد کی موجودہ پابندیاں بلاشبہ تقسیم دولت میں ناہمواری کا باعث بن رہی ہیں لیکن اگر فوری طور سے غیر ملکی تجارت کو بالکل آزاد کر دیا جائے تو اتنا زرمبادلہ کہاں سے آئے گا؟ ظاہر ہے کہ تجارت کو آزاد کرنے سے پہلے زرمبادلہ کی مشکلات کا کوئی حل نکالنا ہوگا، اور اس حل تک پہنچنے کے لئے لازماً کچھ وقت لگے گا، اور جب ''روٹی'' کے لئے ''انتخاب'' تک کا انتظار کرنا لوگوں کے لئے ممکن نہیں تو اس عبوری دور کے لئے بھی کچھ نہ کچھ ایسے طریقے تجویز کرنا ہوں گے جن کے ذریعہ عوام کو گرانی سے بچایا جاسکے، ''تسعیر'' ایک ایسا ہی طریقہ ہے جسے صرف اس وقت تک گوارا کیا جائے گا جب تک اجارہ داریاں مکمل طور پر ٹوٹ نہیں جاتیں، اور یہی وہ مرحلہ ہے جس میں ہمارے فقہاء نے ''تسعیر'' کی اجازت دی ہے، امام ابوحنیفہؒ ''تسعیر'' کے مشہور مخالف ہیں، لیکن ایسے حالات میں ان کا کہنا بھی یہ ہے کہ

"فان کان ارباب الطعام یتحکمون و یتعدون عن القیمة تعدیا فاحشا و عجز القاضی عن صیانة حقوق المسلمین الا بالتسعیر فحینئذ لا باس به بمشورة من اهل الرای والبصیرة"

''اگر غلہ کے مالکان اجارہ دار بن کر قیمت مثل سے حد سے زائد تجاوز کرنے لگے ہوں اور قاضی تسعیر (نرخ مقرر کرنے) کے بغیر مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ سے عاجز ہو جائے تو اہل رائے اور اہل بصیرت لوگوں کے مشورے سے ایسا کرنے میں کچھ حرج نہیں۔''

(۱) تکملہ فتح القدیر، ص ۱۲۷ المطبعة الامیریہ ۱۳۱۸ھ

لیکن خود ان الفاظ سے بھی ظاہر ہے کہ تسعیر کی اجازت مجبوری کے حالات میں صرف عبوری طور پر اختیار کی گئی ہے، لیکن جب اجارہ داریاں ختم ہو جائیں اور معیشت کا نظام اپنی طبعی رفتار پر آجائے تو تسعیر کو پسند نہیں کیا گیا۔ لہٰذا اسلامی حکومت کی کوشش یہی ہوگی کہ وہ تجارت کو آزاد کر کے مسابقت کے ذریعہ ایسے حالات پیدا کرے جن میں قیمتیں اور اجرتیں خود بخود طریقے سے منصفانہ متعین ہوں، اور تسعیر کی ضرورت ہی پیش نہ آئے، ہاں جب تک اس کوشش میں کامیابی نہ ہو اس وقت تک تسعیر کو ایک عارضی حل کے طور پر اختیار کیا جائے گا۔

اسلام اور درآمد و برآمد کی پابندیاں

ڈاکٹر صاحب نے سوال کیا ہے کہ ''خالص شرعی نقطہ نظر سے اس کا کیا جواز ہے کہ حکومت درآمد بند کر کے عام مستہلکین (صارفین) کو مجبور کرے کہ وہ ایک یا معدودے چند سرمایہ داروں کی مصنوعات انکی من مانی قیمت پر خریدیں؟ کیا رسالت یا خلافت راشدہ کے عہد میں کوئی مثال ایسی ملتی ہے جس پر اس مسئلہ کو قیاس کیا جائے؟''

جیسا کہ ہم نے اوپر عرض کیا ہے، ہمارے نزدیک یہ طریقہ کسی طرح بھی اسلامی اصولوں سے میل نہیں کھاتا بلکہ بعض احادیث ایسی ہیں جن سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے غیر ملکی تجارت کو پابند بنانے کے بجائے آزاد چھوڑنے کو پسند فرمایا ہے، امام دار قطنیؒ بیہقیؒ ابو یعلیٰؒ اور طبرانیؒ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے اور ابن عساکرؒ نے حضرت عبداللہ بن ابی عیاش بن ربیعہ رضی اللہ عنہ سے یہ مرفوع حدیث روایت کی ہے کہ:

"اطلبوا الرزق فی خبایا الارض"

''رزق کو زمین کے تمام گوشوں میں تلاش کرو''

"من تعذرت علیه التجارة فعلیه بعمان"

''جس کے لئے تجارت مشکل ہو جائے اس کو چاہئے کہ عمان چلا جائے''

اور ایک روایت میں اسی طرح مصر جانے کا عمومی مشورہ مذکور ہے۔

(کنز العمال حدیث نمبر ۴۱۷۴)

یہ تجارتی سفر درآمد و برآمد دونوں کے لئے ہو سکتا ہے، اس وقت کے تجار عموماً بیک وقت

---

(۱) کنز العمال ص ۱۹۷ ج ۲ دائرۃ المعارف دکن ۱۳۱۲ھ حدیث نمبر ۴۱۷۱

(۲) کنز العمال ص ۱۹۷ ج ۲ دائرۃ المعارف دکن ۱۳۱۲ھ حدیث نمبر ۴۱۷۳

دونوں مقاصد کے لئے سفر کیا کرتے تھے۔ غرض عہد رسالتؐ یا عہد صحابہؓ میں تو کوئی ایسی مثال نہیں ملتی جس میں درآمد و برآمد پر باقاعدہ پابندی عائد کی گئی ہو، بلکہ اس کے خلاف صراحتیں ملتی ہیں، اب اگر خالص فقہی نقطہ نظر سے ان پابندیوں پر غور کیا جائے تو یہ عوام پر صریح ظلم ہے کہ جو دولت انہوں نے اپنے گاڑھے پسینے سے کمائی ہے وہ صرف چند بڑے بڑے صنعت کاروں کے حوالے کر کے باقی سب کو کاغذ کے نوٹ پکڑا دیئے جائیں، یہ ایک طرح کا ''حجر'' ہے جس کے جواز کی کوئی صورت ہماری سمجھ میں نہیں آتی۔

یہی وجہ ہے کہ میرے علم و مطالعہ کی حد تک شاید کسی بھی مستند عالم دین نے اس ظالمانہ طریق کار کو جائز قرار نہیں دیا۔ ہاں علماء کے ذہن میں یہ دشواری ہمیشہ رہی ہے کہ موجودہ حالات میں اگر تجارت کو بالکل آزاد کر دیا جائے تو زرمبادلہ کی کمی کا علاج کیا ہوگا؟ دراصل یہ ماہرین مالیات کا کام ہے کہ وہ اس دشواری کا حل نکالیں، اس وقت صرف علماء ہی کی طرف سے نہیں، بلکہ ماہرین معاشیات کی طرف سے بھی تامین (Protection) کے خلاف آوازیں اٹھ رہی ہیں، شاید دنیا کا کوئی پڑھا لکھا خطہ ان آوازوں سے خالی نہیں ہے۔ اکثر معاشی ماہرین اس وقت آزاد تجارت کے حق میں نظر آتے ہیں، اس لئے مالیات کے ماہرین کو اس طرف توجہ دینی چاہئے اور اگر اسلامی حکومت قائم ہو تو وہ ان ہی کی مدد سے زرمبادلہ کی مشکلات پر قابو پائے گی پورے نظام زر (Monetary System) پر نظر ثانی کر کے اسے طلائی معیار (Gold Standard) کے قریب لائے گی، اور اس سے پیدا ہونے والے مسائل حل کرے گی۔

قومی ملکیت کا مسئلہ

موجودہ سرمایہ داری کی پیدا کردہ مشکلات کا حل یہی ہے جو اوپر ذکر ہوا کہ تجارت کو آزاد کر کے آزاد مسابقت کی مکمل فضا پیدا کی جائے، اور سود، قمار، اور سٹہ وغیرہ کو ممنوع کر کے دولت کو زیادہ سے زیادہ وسیع دائرہ میں گردش دی جائے، رہا وہ حل جو تامیم (قومی ملکیت) کی شکل میں حکمائے مغرب ہی نے تجویز کیا ہے، سو وہ صغث علی ابالة کے سوا کچھ نہیں، یہ درست ہے کہ علماء نے اب تک تامیم کے خلاف جو دلیلیں پیش کی ہیں وہ زیادہ تر عقلی ہیں، لیکن اس کی وجہ یہ نہیں کہ اس کے ابطال پر شرعی دلائل کچھ کم ہیں، بلکہ اس لئے کہ شرعی نقطہ نظر سے اس کا بطلان اتنا واضح ہے کہ اس پر بحث کرنا علماء نے ضروری نہیں سمجھا، یہاں یہ واضح رہے کہ گفتگو اس دولت کی تامیم میں ہو رہی ہے جو جائز ذرائع سے حاصل کی گئی ہو۔ ایسی دولت پر حکومت کا بالجبر قبضہ کر لینا واضح طور پر ظلم ہے، اور آیت ذیل

کے تحت آتا ہے:

"لا تاکلوا اموالکم بینکم بالباطل الا ان تکون تجارة عن تراض منکم"

''تم آپس میں ایک دوسرے کا مال باطل طریقے سے مت کھاؤ، الا یہ کہ دونوں کی رضامندی سے کوئی تجارت کا معاملہ ہو''

نیز خطبہ حجۃ الوداع کے یہ الفاظ بھی اس کی صراحۃً تردید کرتے ہیں کہ

"الا ان دمائکم واموالکم واعراضکم حرام علیکم کحرمة یومکم فی هذا فی بلدکم هذا فی شهرکم هذا"

یہ وہی "اخذ اموال الناس قهرًا" ہے جس کے ناجائز ہونے میں ڈاکٹر صاحب کو بھی کوئی شبہ نہیں ہے، لہٰذا تامیم کا ناجائز ہونا تو بالکل واضح ہے، عہد رسالتؐ سے لے کر اب تک کوئی قابل ذکر فقیہ ہماری نظر سے نہیں گزرا جس نے اسے جائز کہا ہو۔ لہٰذا اگر کوئی شخص اسے جائز سمجھتا ہے تو نص شرعی پیش کرنا اس کے ذمہ ہے۔

اصل میں واقعہ یہ ہے کہ ''قومی ملکیت میں لینے'' کی تجویز کارل مارکس کے نظریہ قدر زائد (Surplus Value) پر مبنی ہے جس کی رو سے محنت کی اجرت کے علاوہ ہر ذریعہ آمدنی ناجائز ہے، اور صرف سود ہی نہیں، بلکہ منافع (Profit) اور کرایہ (Rent) بھی ناجائز ذرائع آمدنی میں شامل ہے۔ اگر اس نظریہ کو تسلیم کر لیا جائے تو تامیم (قومی ملکیت میں لینا) بلاشبہ ایک معقول بات ہے، اس لئے کہ صنعت کار جو آمدنی حاصل کرتا ہے، اور جس کے ذریعہ کارخانے لگاتا ہے، اس کا بیشتر حصہ سود، منافع اور کرایہ پر مشتمل ہوتا ہے، اور جب قدر زائد کے نظریہ کی رو سے یہ تمام ذرائع آمدنی ناجائز ٹھہرے تو اس کا پورا کارخانہ ہی ناجائز ہوا، لہٰذا اس کو چھین کر قومی ملکیت میں لے لینا قدر زائد کے نظریہ کو تسلیم کرنے کا منطقی نتیجہ ہے۔

لیکن اگر قدر زائد کے نظریہ کو تسلیم نہ کیا جائے تو صنعت کار کی وہ آمدنی جائز قرار پاتی ہے جو نفع یا کرایہ کے ذریعہ حاصل کی گئی ہے اور کسی کی آمدنی کو جائز قرار دے دینے کے بعد اسے تمام وکمال چھین لینا کسی بھی منطق کی رو سے جائز نہیں کہلا سکتا۔

اس تفصیل سے واضح ہو گیا کہ اصل مسئلہ قومی ملکیت کا نہیں، بلکہ نظریہ قدر زائد کا ہے، ہمیں بنیادی طور پر یہ دیکھنا ہے کہ قدر زائد کا نظریہ اسلام کی رو سے قابل قبول ہے یا نہیں؟ اگر قابل قبول ہے تو (تامیم قومی ملکیت) کو بھی تسلیم کرنا ہوگا، اور اگر یہ نظریہ ہی بنیادی طور پر اسلام کے خلاف ہو تو تامیم (قومی ملکیت) کو جائز قرار دینے کے کوئی معنی نہیں۔

اب نظریہ قدر زائد پر شرعی نظر سے غور کیجئے تو وہ بنیادی طور پر ہی غلط نظر آتا ہے، اس لئے کہ اس کی رو سے ذرائع آمدنی میں سے صرف اجرت جائز ہے نفع اور کرایہ بالکل ناجائز ہے۔ حالانکہ اسلام میں اجرت، نفع اور کرایہ کا جائز ہونا نصوص متواترہ سے ثابت ہے قرآن مجید میں جا بجا تجارتی نفع کو ''فضل اللہ'' سے تعبیر کیا گیا ہے، بیع وشراء کی تمام اقسام، اجارہ، شرکت، مضاربت اور دوسرے بہت سے شرعی عقود اسی نفع اور کرایہ کی حالت پر مبنی ہیں، اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ بات اتنی واضح ہے کہ اس پر دلائل پیش کرنے کی چنداں ضرورت نہیں۔

جب یہ ثابت ہوگیا کہ قدر زائد کا نظریہ اسلام کے خلاف ہے تو صنعت کار کی صرف وہ آمدنی ناجائز قرار پائی جو سود، سٹہ، قمار یا کسی اور حرام طریقے سے حاصل ہوئی ہو، ایسی آمدنی کو ضبط کر لینا بلاشبہ جائز ہے۔ لیکن جو آمدنی نفع اور کرایہ کی شکل میں اسے حاصل ہوئی ہو، وہ بغیر کسی شک وشبہ کے جائز ہے اور اسے جائز تسلیم کر لینے کے بعد اس میں سے صرف واجبات شرعیہ (زکوۃ عشر وغیرہ) حکومت وصول کر سکتی ہے، پوری آمدنی یا پورے کارخانے کو قومی ملکیت میں لے لینا کسی طرح بھی جائز نہیں کہلا سکتا۔

جو حضرات ہمارے زمانے میں قومی ملکیت کی تجویزیں زور شور کے ساتھ پیش کر رہے ہیں، انہیں چاہئے کہ وہ نظریہ قدر زائد کے بارے میں اپنا نقطہ نظر واضح کریں۔ ''تامیم'' کے ذکر پر الحاد کا خیال اسی لئے آتا ہے کہ تامیم کا تصور نظریہ قدر زائد پر مبنی ہے جو نصوص شرعیہ کے قطعی خلاف ہے، اور محل اجتہاد واختلاف نہیں ہے۔

ہمیں معلوم ہے کہ پروپیگنڈے کی طاقتوں نے ''تامیم'' کے ''جواز'' کو بھی خواہ مخواہ ''ترقی پسندی'' کے دین کا کلمہ شہادت بنا دیا ہے، اور ہمارے معاشرے میں ایسے ''اعجوبہ ہائے روزگار'' بھی موجود ہیں جو اس ''ترقی پسندی'' کے شوق میں بیک وقت ''ربوا'' اور ''سوشلزم'' دونوں کو اسلام کے مطابق ثابت کرنے کی کوشش کر رہے ہیں، لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ علماء کے لئے ''رجعت پسندی'' اور ''دقیانوسیت'' کے طعنوں کی بارش کہیں زیادہ بہتر ہے، بہ نسبت اس بات کے وہ قطعی نصوص کے معاملے میں ادنیٰ لچک کھا جائیں۔

مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ کی ایک عبارت کی توضیح

رہی یہ بات کہ علماء خود کہہ رہے ہیں کہ بعض صنعتیں حکومت خود چلائے سو غالباً اس کا اشارہ حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مدظلہم کی تجویز کی طرف ہے جو البلاغ کی رمضان ۸۹ھ کی اشاعت

میں شائع ہوئی تھی:

"کلیدی صنعتیں مثلاً ریلوے، جہاز رانی، جہاز سازی، فولاد سازی، تیل وغیرہ کی صنعتیں حکومت خود اپنی نگرانی میں قائم کرے اور ان میں صرف ان لوگوں کے حصص قبول کیے جائیں جن کی آمدنی ایک ہزار روپے ماہانہ سے کم ہو...... الخ"

غالباً اس تجویز کے بعض الفاظ سے غلط فہمی ہوئی ہے، ڈاکٹر صاحب کے علاوہ بھی بعض حضرات نے اس طرف توجہ دلائی ہے، اس لئے ہم حضرت مفتی صاحب مدظلہم کے صحیح منشاء کی تشریح کیے دیتے ہیں، دراصل اس تجویز میں جو بات کہی گئی وہ صرف یہ ہے کہ اس وقت جو کلیدی صنعتیں نیم سرکاری (Semi Gorverment) نوعیت رکھتی ہیں، وہ حکومت ہی کی قائم کردہ ہیں، لیکن اس وقت ہو یہ رہا ہے کہ ان صنعتوں میں بھی نجی شعبے (Private Sector) کے تقریباً تمام حصص بڑے بڑے سرمایہ داروں نے لے رکھے ہیں، اور اس طرح جو صنعتیں اپنی ابتداء ہی سے قومی ملکیت میں ہیں، ان سے بھی بڑے بڑے سرمایہ دار نفع اٹھا رہے ہیں۔ اگر حکومت اس صورت حال کو بدل کر یہ اعلان کر دے کہ ایسی صنعتوں کے حصص صرف ان لوگوں کو دیئے جائیں گے جن کی آمدنی ایک ہزار روپے سے کم ہے تو ان صنعتوں کے منافع میں عام آدمی شریک ہو سکیں گے، اور اس طرح بجائے اس کے کہ ان قومی صنعتوں کا منافع بھی سرمایہ دار اٹھائیں، یہ دولت عوام تک پہنچے گی۔

اس صورت حال کا شرعی جواز اس لئے ہے کہ یہ صنعتیں ابتداء ہی سے حکومت نے قائم کی ہیں، اور اس حیثیت سے اسے یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ جس سے چاہے شرکت کا معاہدہ کرے اور جس سے چاہے انکار کر دے، آج اگر میں کوئی کاروبار شروع کروں تو جس طرح مجھے اپنے شرکاء منتخب کرنے کا پورا اختیار ہے، اسی طرح یہ اختیار حکومت کو بھی ملے گا۔

یہ تجویز "تامیم" (قومی ملکیت میں لینے) سے بالکل مختلف ہے، کیوں کہ اس میں صنعت ابتداً کوئی غیر سرکاری شخص قائم کرتا ہے، پھر حکومت اس پر زبردستی قبضہ کر لیتی ہے۔

اس تشریح سے ڈاکٹر صاحب کا وہ اشکال بھی رفع ہو جاتا ہے جو انہوں نے اس تجویز پر اپنے مضمون کے آخر میں کیا ہے کہ

"یہ اصول کہ مال کے استغلال اور تمیہ کے ایک جائز طریقہ پر پابندی لگائی جا سکتی ہے، اس کی سند اور ائمہ سلف کے یہاں اس کی نظیر کیا ہے جس پر اس کو قیاس کیا جا سکے؟"

مذکورہ تشریح سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ اس تجویز کا مقصد مال کے استغلال اور تمیہ

(Investment) پر پابندی لگانا نہیں، بلکہ ہر کاروبار شروع کرنے والے کو اختیار ہوتا ہے کہ وہ شرکت کا معاہدہ کرنے کے لئے افراد خود منتخب کرے، اس تجویز میں اسی اختیار کو استعمال کیا گیا ہے، آج بھی حکومت کسی شخص کے حصص قبول کرنے کے لئے بہت سی شرائط عائد کرتی ہے، ظاہر ہے کہ اسے استغلال اور تنمیہ پر پابندی نہیں کہا جا سکتا۔

زمین کا ٹھیکہ

ڈاکٹر صاحب نے مضمون کے دوسرے حصے میں زراعت سے بحث فرمائی ہے اور اس سلسلے میں دو تجویزیں غور کے لئے پیش فرمائی ہیں، ایک یہ کہ مفاسد کے پیش نظر کراء الارض (زمین کا ٹھیکہ) کو ناجائز قرار دے دیا جائے دوسرے یہ کہ ملکیت زمین کی کوئی ایسی حد مقرر کر دی جائے جس سے زمینداری کا خاتمہ ہو جائے۔

جہاں تک کراء الارض بالذہب والفضة (روپیہ کے ذریعہ زمین ٹھیکہ پر دینا) کا تعلق ہے، یہ درست ہے کہ ابن حزمؒ نے اسے ناجائز قرار دیا ہے، لیکن ان کے مسلک کے خلاف صریح احادیث اس کثرت کے ساتھ وارد ہوئی ہیں کہ ان کے حق میں رائے دینا بہت مشکل ہے، یہی وجہ ہے کہ امام ابوحنیفہؒ امام شافعیؒ، امام مالکؒ، اور امام احمدؒ ہی نہیں، بلکہ امت کے تقریباً تمام علماء وفقہاء ان کے خلاف ہیں، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے کوئی ایک صحابی بھی نہیں جنہوں نے اس مسلک کو اختیار کیا ہو، قاضی شوکانیؒ جو اہل ظاہر میں سے ہیں اور بہت سے معاملات میں ابن حزمؒ کی تائید کرتے ہیں، اس مسئلے میں ابن منذرؒ کے حوالے سے لکھتے ہیں:

"ان الصحابة اجمعوا علی جواز كراء الارض بالذهب و الفضة و نقل ابن بطال اتفاق فقهاء الامصار عليه"

"تمام صحابہ کا اس پر اجماع منعقد ہو چکا ہے کہ سونا چاندی کے عوض زمین کو کرایہ پر دینا جائز ہے اور ابن بطالؒ نے تمام علاقوں کے فقہاء کا اس پر اتفاق نقل کیا ہے"۔ یہاں تک کہ جس حدیث کے اطلاق سے ابن حزمؒ نے استدلال کیا ہے اس کے روایت کرنے والے تمام صحابہ رضی اللہ عنہم "کراء الارض" کے قائل ہیں، رہا علامہ ابن حزمؒ کا معاملہ سو ان کے بارے میں پوری علمی دنیا جانتی ہے کہ اور بہت سے معاملات میں ان کے تفرادت کو کبھی قبول نہیں کیا۔

پھر ڈاکٹر صاحب نے ابن حزمؒ کا مسلک اختیار کرنے کی تجویز زمینداروں کے ظلم وستم کی بناء پر پیش کی ہے، لیکن اگر اس تجویز پر بالفرض عمل کیا جائے تو اس کی رو سے مزارعت جائز رہے گی اور

ٹھیکہ ناجائز ہوجائے گا، حالانکہ ہمارے معاشرے میں زمینداروں کے ظلم وستم کا اصل نشانہ مزارعین ہوتے ہیں، ٹھیکہ پر زمین لے کر کاشت کرنے والے اوّل تو ہمارے یہاں کم ہیں، دوسرے ان پر زمیندار اتنے قابو یافتہ نہیں ہوتے کہ انہیں ظلم وستم کا نشانہ بناسکیں، ان کا بس تو ان غریب مزارعین پر چلتا ہے جن کی حیثیت سالہا سال کے غلط رسم ورواج کے سبب زمینداروں کی رعیت کی سی ہوگئی ہے لہٰذا موجودہ معاشرے میں عوامی مصالح کے لحاظ سے بھی اس تجویز کا کوئی موثر فائدہ سمجھ میں نہیں آتا۔ زمینداروں کے موجودہ ظلم وستم کا صحیح علاج تو ہماری نظر میں وہی آتا ہے جو البلاغ کے رمضان ۸۹ھ کے اداریئے میں بیان کیا گیا ہے۔

تحدیدِ ملکیتِ اراضی

آخر میں ڈاکٹر صاحب نے زمین کی تحدید کا سوال اٹھایا ہے، اس سلسلے میں ہماری گزارش یہ ہے کہ تحدید ملکیت کا ایک مفہوم تو یہ ہے کہ گزوں اور ایکڑوں کے حساب سے کوئی حد مقرر کر دی جائے، جس کے پاس اس سے زائد زمین ہو وہ چھین لی جائے، اور آئندہ کسی کو اس سے زیادہ اراضی رکھنے کی اجازت نہ دی جائے۔ تحدید ملکیت کا یہی مفہوم آج کل عموماً سمجھا جارہا ہے، یہاں تک کہ بعض سوشلزم کی مخالف جماعتیں بھی یہی حل پیش کررہی ہیں، لیکن ہماری رائے میں یہ حل نہ تو شریعت کے مطابق ہے اور نہ موجودہ حالات میں اس سے تحدید کا مقصد حاصل ہوگا۔ سابق صدر ایوب صاحب کے زمانے میں بھی اراضی کی حد پانچ سو ایکڑ مقرر کردی گئی تھی، لیکن کیا آج بھی ایک ایک شخص کے تصرف میں ہزاروں ایکڑ زمین نہیں ہے؟ اس تحدید کا نتیجہ صرف یہ ہوا کہ بڑے بڑے زمینداروں نے اپنی زمین کے مختلف حصے اپنے ایسے کاشتکاروں اور ہاریوں کے نام منتقل کررکھے ہیں جنہیں آج تک یہ علم بھی نہیں ہے کہ سرکاری کاغذات میں ان کے نام پر کوئی زمین لکھی ہوئی ہے۔

اس کے برخلاف تحدید ملکیت کے ایسے طریقے بھی ہیں جن میں گزوں اور ایکڑوں کے حساب سے تو ملکیت کی کوئی حد مقرر نہیں کی جائے گی، لیکن ان کو اختیار کرنے کا نتیجہ مآل کار یہی ہوگا کہ ایک طرف بڑے بڑے زمیندارے ٹکڑے ہو ہو کر خود بخود مناسب حدود میں آجائیں گے، اور دوسری طرف ان زمینداروں کی وجہ سے جو نقصانات غریب عوام کو پہنچ رہے ہیں، ان کا انسداد ہوجائے گا۔ دولت خواہ زمین کی شکل میں ہو یا روپیہ کی شکل میں، اسلام نے اسے مناسب اور معقول حدود میں رکھنے کے لئے اسی قسم کے اقدامات پر زور دیا ہے اور کمیت کے اعتبار سے کہیں بھی اس کی کوئی متعین حد مقرر نہیں کی۔ لہٰذا جن جماعتوں نے سو یا دوسو ایکڑ کی حد مقرر کی ہے، ہماری نظر میں ان کی تحدید بھی

شریعت کے خلاف ہے، کتاب و سنت اور امت کے چودہ سو سالہ تعامل میں اس کی کوئی نظیر نہیں ملتی، البتہ موجودہ حالات میں مندرجہ ذیل اقدامات ایسے ہیں جن کے ذریعہ بڑی بڑی زمینیں خود بخود تقسیم ہو سکتی ہیں۔

اراضی کی شرعی تقسیم

(۱) جن زمینوں میں وراثت سالہا سال سے جاری نہیں ہوئی، ان میں اگر اسلامی احکام کے مطابق وراثت ٹھیک ٹھیک جاری کر دی جائے تو بہت سی زمینیں تقسیم ہو کر صحیح مستحقین تک پہنچ جائیں گی۔

(۲) جس زمین کے بارے میں یہ ثابت ہو جائے کہ وہ اس کے قابض نے ناجائز طریقے سے حاصل کی ہے، اسے واپس لے کر عوام میں تقسیم کر دیا جائے۔

(۳) جتنی زمینیں اس وقت ناجائز طور پر رہن رکھی ہوئی ہیں (اور اس وقت رہن کی تقریباً تمام صورتیں ناجائز ہی ہیں) انہیں چھڑا کر واپس قرض دار کو دلوایا جائے۔

(۴) آئندہ اسلام کے قانونِ وراثت کی پوری پابندی کرائی جائے۔

(۵) انتقالِ جائیداد کے طریقوں کو سہل بنایا جائے اور زمینوں کی آزادانہ خرید و فروخت کی حوصلہ افزائی کی جائے۔

اس قسم کے قانونی احکام کے ذریعہ ہی چند سالوں میں بڑی بڑی زمینیں مناسب اکائیوں میں تبدیل ہو سکتی ہیں۔

پھر یہ بات ہر مرحلہ پر یاد رکھنی چاہئے کہ دنیا میں ہر بیماری کا علاج قانون کا ڈنڈا نہیں ہوتا، طبقاتی کشمکش کو ہوا دے کر فریقین میں ضد اور عناد پیدا کرنے کے بعد حالات کی اصلاح بہت مشکل ہے، اس کے بجائے منافرت کی آگ کو ٹھنڈا کر کے قانون کے علاوہ اخلاق سے بھی کام لیا جائے تو بہت سے مسائل محض رضا کارانہ بنیاد پر بھی حل ہو سکتے ہیں، جو قوم ۵۸ھ میں اپنی دولت کے پوشیدہ ذخائر خود بخود ظاہر کر سکتی ہے، اگر اسے پوری طرح اعتماد میں لے کر اس کی ذہنی تربیت کی جائے تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ وہ اپنی زائد از ضرورت زمینیں بھی خوش دلی کے ساتھ پیش نہ کر سکے۔ اس کے علاوہ مالکانِ زمین کو رضامند کر کے ان سے بعض قطعاتِ زمین معاوضہ کے ساتھ بھی حاصل کیے جا سکتے ہیں، حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو بھی اپنے دورِ حکومت میں اس قسم کی ضرورت پیش آئی تھی تو انہوں نے جبراً لوگوں کی زمینیں چھیننے کے بجائے بجیلا کے پورے قبیلہ کو اخوت کی بنیاد پر راضی کیا، اور بعض سے

بلا معاوضہ اور بعض سے معاوضہ کے ساتھ زمینیں حاصل کیں[1] یہ طریقہ آج بھی اختیار کیا جاسکتا ہے۔

ہم نے اپنا نقطہ نظر نہایت اختصار کے ساتھ پیش کر دیا ہے، اگر دوسرے اہل علم حضرات ان موضوعات پر تفصیل کے ساتھ اظہار خیال فرمانا چاہیں تو البلاغ کے صفحات حاضر ہیں۔

اللھم ارنا الحق حقاً وارزقنا اتباعہ وارنا الباطل باطلاً وارزقنا اجتنابہ

(۱) ابوعبیدہ: کتاب الاموال رقم نمبر ۱۵۴

سوشلزم اور غریب عوام

گذشتہ مضامین میں اسلامی نظامِ معیشت کے وہ موٹے موٹے نکات بیان کر دیئے گئے ہیں جن کا منصفانہ مطالعہ انسان کو اس نتیجے تک پہنچانے کے لئے کافی ہے کہ اگر اسلام کا نظامِ زندگی نافذ ہو تو تقسیمِ دولت کی یہ ظالمانہ اونچ نیچ نہ پیدا ہو سکتی ہے، نہ باقی رہ سکتی ہے، ان نکات کی روشنی میں اس سوال کا بہر حال تشفی بخش جواب مل جاتا ہے کہ اسلام ایک غریب انسان کی معاشی ضرورت مہیا کرنے کے لئے کیا نظام تجویز کرتا ہے؟ اور اس سے عام خوشحالی کی فضا کیونکر پیدا ہوتی ہے؟

اب ہم اس بات کا پورا حق رکھتے ہیں کہ جو لوگ اس ملک میں سوشلزم لانا چاہتے ہیں، ان سے یہ سوال کریں کہ سوشلزم ایک غریب انسان کو کیا دیتا ہے؟ اس سے ایک آدمی کو کیا معاشی فائدہ پہنچے گا؟ اس کے قیام سے دولت کس طرح غریبوں کے ہاتھ میں پہنچ سکے گی؟ اور اس کی حکومت میں دولت کے ایک جگہ سمٹ کر رہ جانے کا انسداد کس طرح ہوگا؟ ہم سمجھتے ہیں کہ سوشلزم کے حامیوں کے پاس ان سوالات کا کوئی معقول اور تسلی بخش جواب نہیں ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ سوشلزم کی تحریک خالصتاً ایک منفی تحریک ہے، جس نے آج تک اپنے معاشی نظام کا کوئی سوچا سمجھا مثبت خاکہ پیش نہیں کیا۔ اس نے معاشی مساوات کے نعرے تو بہت لگائے ہیں، غریبوں سے ہمدردی کے دعوے بھی بے شمار کیے ہیں، سرمایہ دارانہ نظام کے ظلم وستم کے خلاف نفرت پھیلانے کا کارنامہ بھی خوب انجام دیا ہے، لیکن مثبت طور پر یہ کہیں نہیں بتایا کہ اس ظلم وستم کا علاج کس طرح ہوگا؟ غریبوں کے سرمایہ دارانہ نظام کی مصیبت سے چھٹکارا پانے کی عملی شکل کیا ہے؟ اور سوشلزم کے تحت معاشی مساوات کیوں کر قائم ہو سکتی ہے؟ ہو سکتا ہے کہ بعض حضرات کو ہمارے اس دعوے پر حیرت ہو، اس لئے کہ سوشلزم نے دنیا بھر میں اپنا تعارف ایک معاشی تحریک کی حیثیت سے کرایا ہے، اور پروپیگنڈے کی ساری طاقتیں استعمال کر کے ذہنوں میں یہ تاثر پیدا کرنے کی کوشش کی ہے کہ سرمایہ داری کے ظلم وجور کا واحد مد مقابل سوشلزم ہے اور اگر اس کو اختیار کر لیا جائے تو سرمایہ داری کی تمام لعنتیں دور ہو سکتی ہیں۔

لیکن جن لوگوں نے سوشلزم کا مطالعہ کیا وہ اس بات سے پوری طرح باخبر ہیں کہ یہ تاثر خالصتاً پروپیگنڈے کی کرامت ہے، ورنہ سوشلزم نے سرمایہ داری کے خلاف زبانی نفرت کے اظہار سے زیادہ کوئی خدمت انجام نہیں دی۔ یقین نہ آئے تو سوشلسٹ لٹریچر کا مطالعہ کر کے دیکھئے، وہ اول سے لے کر آخر تک اس قسم کے جملوں سے بھرا ہوا نظر آئے گا کہ

''سرمایہ داروں نے غریب مزدوروں کا خون چوس رکھا ہے'' ۔ ''پوری قوم کی دولت چند خاندانوں میں جمع ہو کر رہ گئی ہے'' ۔ ''سرمایہ دارانہ لوٹ کھسوٹ کو کسی قیمت پر برداشت نہیں کیا جاسکتا'' ''کارخانہ مزدور کا اور زمین کسان کی ہونی چاہئے'' ''مزدور دولت پیدا کرتا ہے، مگر سرمایہ دار اسے لوٹ لے جاتا ہے'' ۔ ''عوامی حکومت میں کروڑ پتیوں کی کوئی گنجائش نہیں'' ۔ ''ہم مزدوروں کو ان کے حقوق دلوا کر رہیں گے۔'' وغیرہ وغیرہ!

سوشلسٹ حضرات کا سارا لٹریچر اسی قسم کے بے شمار جملوں اور ان کی تشریحات سے لبریز تو نظر آئے گا، لیکن سوشلزم کے پاس اس صورت حال کا واقعی علاج کیا ہے؟ اس میں دولت کی یہ اونچ نیچ کس طرح ختم ہوگی؟ وسائل پیداوار کو قومی ملکیت میں لینے کے بعد مزدور اور کسان اپنی مشکلات سے کیوں کر نجات پائیں گے؟ ان کی حکومت قائم ہونے کی عملی شکل کیا ہوگی؟ دولت کی مساوات کس طرح پیدا ہو سکے گی؟ یہ سب وہ سوالات ہیں جو سیاسی نعروں کی گونج میں گم ہو کر رہ گئے ہیں، اور اگر کوئی شخص معقولیت کے ساتھ ان سوالات کو حل کرنا چاہے تو سوشلسٹ عناصر کے پاس اس کے لئے ''امریکی ایجنٹ'' کے فتوے کے سوا کوئی جواب نہیں ہے۔

سوشل ازم کی بنیاد کارل مارکس کی کتاب

سوشلزم کی بنیاد کارل مارکس کی کتاب ''داس کیپٹال'' پر ہے جسے اشتراکیت کی بائبل سمجھا جاتا ہے، لیکن تین جلدوں کی اس ضخیم کتاب کو شروع سے آخر تک پڑھنا چاہئے۔ وہ تمام تر سرمایہ دارانہ نظام پر فلسفیانہ تنقید سے بھری ہوئی ہے۔ اور چند مبہم اشاروں کے سوا اس میں کوئی مثبت معاشی پروگرام پیش نہیں کیا گیا۔

لے دے کر اگر سوشلسٹ عناصر کے پاس سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف کوئی مثبت تجویز ہے تو وہ یہ ہے کہ تمام وسائلِ پیداوار کو قومی ملکیت میں لے کر منصوبہ بند معیشت (PLANNED ECONOMY) قائم کی جائے جس میں وسائل کا استعمال اور ان کے درمیان دولت کی تقسیم حکومت کی منصوبہ بندی کے ماتحت ہو۔ بس یہ ایک تجویز ہے جسے اس شان کے ساتھ پھیلایا جارہا ہے کہ گویا ''قومی ملکیت'' کوئی طلسماتی چراغ ہے جس کے روشن ہوتے ہی ظلم وستم کی ساری تاریکیاں کافور ہو جائیں گی، اور اس کے بعد مزدور اور کسان کے گھر میں اجالا ہی اجالا نظر آئے گا۔ مزدوروں اور کسانوں کو یہ باور کرایا جارہا ہے کہ زمینوں اور کارخانوں کے قومی ملکیت میں آجانے کا مطلب یہ ہے کہ تم ان کے مالک بن جاؤ گے، اور تم پر کسی سرمایہ دار کی بالادستی قائم نہیں رہے گی۔ اور یہ بلاشبہ

اشترا کی پراپیگنڈے کا کمال ہے کہ اس سفید جھوٹ کو اس نے ایسی شدت کے ساتھ پھیلایا ہے کہ ''قومی ملکیت'' کا یہی مفہوم عام طور سے سمجھا اور سمجھایا جا رہا ہے، یہاں تک کہ بعض سوشلزم کے کٹر مخالفین بھی اس پروپیگنڈے سے متاثر ہو کر کبھی کبھی قومی ملکیت کا نعرہ لگا دیتے ہیں، اور ذہن اس رخ پر سوچنے کے لئے آمادہ ہی نہیں ہوتے کہ ''قومی ملکیت'' سے مزدور بیچارہ کس طرح کارخانے کا مالک ہو جائے گا؟ اور زمینیں غریب کسان کی ملکیت میں کیسے آ جائیں گی؟

فرض کیجئے کہ اگر ملک کی زمینوں اور کارخانوں کو قومی ملکیت میں لے لیا جاتا ہے تو اس کا سیدھا اور صاف مطلب یہ ہے کہ ساری زمینیں اور کارخانے افراد کی نجی ملکیت سے نکل کر حکومت کے قبضہ میں چلے جائیں گے، اور حکومت ہی ان تمام وسائل پیداوار کی مالک ہوگی۔ سوال یہ ہے کہ اس اقدام سے مزدور اور کسان کے حق میں آقاؤں کی تبدیلی کے سوا کیا فرق پڑا؟ پہلے کارخانوں کا مالک سرمایہ دار تھا اور وہ مزدور سے کام لے کر اسے اجرت دیتا تھا، اب کارخانوں کی مالک حکومت ہو جائے گی اور وہ بھی اس سے کام لے کر اجرت دے گی، کارخانے کی پالیسی میں نہ پہلے اس کا دخل تھا نہ اب ہوگا، کارخانے کے منافع میں نہ پہلے اسے مالکانہ حقوق حاصل تھے نہ اب ہوں گے، تنخواہوں کا تعین نہ پہلے اس کی آزاد مرضی پر ہوتا تھا، نہ اب ہو سکے گا۔ پھر آخر میں مساوات اور خوش حالی کی وہ کون سی جنت ہے جو اسے پہلے آقا کی غلامی میں حاصل نہیں تھی، اور اس نئے آقا کی غلامی کر کے حاصل ہو جائے گی؟

کہا جاتا ہے کہ سوشلزم میں چونکہ حکومت بھی مزدوروں کی ہوگی، اس لئے کارخانوں کو اپنے قبضے میں لانے کے بعد وہ یقیناً مزدوروں کے ساتھ انصاف کرے گی، اور موجودہ سرمایہ داروں کی طرح ان کو جائز حقوق سے محروم نہیں کر سکے گی۔ لیکن آیئے ذرا یہ معلوم کرنے کی کوشش کریں کہ سوشلسٹ نظام میں ''مزدوروں کی حکومت'' کا کیا مطلب ہے؟

اشترا کی پروپیگنڈے نے سادہ لوح عوام میں ''مزدوروں کی حکومت'' کا تصور بھی کچھ اس طرح بٹھانے کی کوشش کی ہے کہ جیسے اس نظام کے ماتحت مشین چلانے والے مشین مین اور ہل جوتنے والے کسان یک بیک حکومت کی کرسیوں پر جا بیٹھیں گے اور ملک کے سیاہ سفید کے مالک بن کر ملک بھر کی جھونپڑیوں کو محلوں میں تبدیل کر دیں گے، لیکن واقعات کی دنیا میں آ کر دیکھئے کہ اس ''مزدور کی حکومت'' کا عملی نقشہ کیا بنے گا؟ ہوگا صرف یہ کہ ملک کے دس کروڑ مزدوروں اور کسانوں میں سے صرف چند افراد پر مشتمل ایک پارٹی بنے گی، جس میں ملک کے کروڑوں مزدوروں اور کسانوں میں سے تین یا چار فیصد آدمی شریک ہو سکیں گے، پھر یہ پارٹی اپنے اندر سے انتخاب کر کے بیس پچیس

آدمیوں پر مشتمل ایک وزارت بنائے گی، اور یہ بیس پچیس آدمی ہی عملاً سارے ملک کے سیاہ وسفید کے مالک ہوں گے، ان ہی کے قبضہ میں ملک بھر کے کارخانے ہوں گے، ان ہی کے تسلط میں ملک کی ساری زمینیں ہوں گی، وہی اپنے ماتحت افسروں کے ساتھ مل کر ساری پالیساں بنائیں گے۔ وہی عام مزدوروں اور کسانوں کی اجرتیں اور اشیاء کی قیمتیں متعین کریں گے، اور رہی بیچاری وہ پارٹی جس نے اب بیس پچیس افراد کو منتخب کیا تھا، سو اس کا کام صرف یہ ہوگا کہ وہ زیادہ سے زیادہ سال بھر میں ایک مرتبہ اپنا اجلاس[1] منعقد کر کے حکومت کی پالیسیوں کی تصویب کر دے یا زیادہ سے زیادہ کسی فیصلے پر تنقید کر کے گذر جائے اور بس!

اب رہے وہ کروڑوں مزدور اور کسان جنہوں نے حکومت قائم ہونے کے دھوکے میں اپنا سب کچھ اس پارٹی کے حوالے کر دیا تھا، سو حکومت کی پالیسوں میں ان کے کسی ادنیٰ دخل کا تو سوال ہی کیا ہے، ان بیچاروں کی مجال نہیں ہے کہ وہ حکومت کے کسی فیصلے کے خلاف زبان کو حرکت بھی دے سکیں، لہٰذا اگر وہ بیس پچیس اربابِ اقتدار جو ملک کے سارے کارخانوں، ساری زمینوں، دولت کے خزانوں اور پیداوار کے تمام وسائل کے تنہا ٹھیکہ دار ہیں، پارٹی کے چند ہزار افراد کو خرید لیں تو ملک میں اس سرے سے لے کر اس سرے تک کوئی متنفس نہیں جو ان کے فیصلوں کے خلاف دم بھی مار سکے۔

اس صورت حال کی ایک ادنی سی جھلک ہم سابقہ دور حکومت میں بنیادی جمہوریتوں کے نظام کے تحت دیکھ چکے ہیں کہ کروڑوں عوام اپنی تقدیر چند ہزار بی ڈی ممبروں کے حوالے کرنے کے بعد کس بری طرح بے بس ہو جاتے ہیں اور یہ بی ڈی ممبر اور ان کی منتخب کی ہوئی اسمبلیاں حکومت کی ہاں میں ہاں ملانے کے سوا کوئی کام نہیں کر سکیں، فرق یہ ہے کہ "بنیادی جمہوریت" کے اس نظام میں کروڑوں عوام کے بیشتر اختیارات سلب ہو جانے کے باوجود انہیں دوسری سیاسی جماعتیں بنانے، ان کے تحت جلسے جلوس منعقد کرنے، ہڑتال اور مظاہرے کرنے کا اختیار فی الجملہ حاصل تھا، اور اسی اختیار کی بدولت وہ دس سال بعد حکومت تبدیل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ لیکن سوشلسٹ نظام میں نہ کوئی سیاسی جماعت بنانے کی اجازت ہوگی، نہ ہڑتال اور نہ مظاہرے کرنے کی، اور آزادانہ جلسے جلوس منعقد کرنے کی، لہٰذا ان کی حیثیت بالکل اس پرندے کی سی ہوگی جسے جال میں پھانسنے کے ساتھ ساتھ اس کے پر بھی کاٹ دیئے گئے ہوں، تاکہ وہ مقید ہونے کی حالت میں پھڑ پھڑانے کی آزادی سے بھی محروم ہو جائے۔

(۱) بلکہ اربابِ اقتدار کسی وجہ سے مناسب نہ سمجھیں تو سالہا سال تک پارٹی کا اجلاس منعقد نہیں ہوتا، روس کی مثال ہر شخص کے سامنے ہے۔

یہ ہے وہ حکومت جسے ''مزدوروں کی حکومت'' کا نام دے کر مزدوروں سے کہا جا رہا ہے کہ اسے قائم کرنے کے لئے اپنے جان و مال کی قربانیاں ضرور پیش کرو، جو اس حکومت کے قیام میں آڑے آئے اسے ''سامراج کا ایجنٹ'' اور ''مزدور دشمن'' قرار دو اور اس کی مخالفت کو ختم کرنے کے لئے تن من دھن سب کچھ لٹا دو۔

سوشلسٹ حکومت میں مزدور کشی

''قومی ملکیت'' اور مزدوروں کی حکومت کا مطلب سمجھ لینے کے بعد آپ ایک مزدور کے نقطہ نظر سے سوچئے کہ اس نظام میں مزدور کا حشر کیا ہوگا؟ فرض کیجئے کہ اس نظام کے تحت ایک مزدور کو محسوس ہوتا ہے کہ میری اجرت میری محنت کے مقابلے میں کم ہے، اور اس میں اضافہ ہونا چاہئے، وہ اپنی اجرتیں بڑھوانے کے لئے جدوجہد کرنا چاہتا ہے تو سوشلزم کی اس نام نہاد ''مزدور حکومت'' میں اس کے لئے کیا راستہ ہے؟ ٹریڈ یونین وہ نہیں بنا سکتا، ہڑتال وہ نہیں کر سکتا، مظاہرہ کا کوئی اور طریقہ اختیار کرنے کی اسے اجازت نہیں، اس لئے کہ سوشلسٹ نقطہ نظر سے یہ یونین سازی، ہڑتال اور مظاہرے تو ''سرمایہ داری'' کے دور کی یادگاریں تھیں، جب حکومت خود ان مزدوروں کی قائم ہوگئی تو اب ''مزدور دشمن سرگرمیوں'' کی اجازت کہاں؟

اب اس کے لئے دوسرا راستہ یہ ہے کہ وہ تن تنہا کارخانے کے ڈائریکٹروں کے پاس جائے اور ان کی خدمت میں اجرت بڑھانے کی درخواست پیش کرے، لیکن یہ ڈائریکٹر کوئی سرمایہ دارانہ نظام کا مالک تو ہے نہیں جو اپنے اختیار سے اجرتوں میں کمی بیشی کر سکے، اس کے پاس ٹکا سا جواب یہ ہے کہ اجرتیں بڑھانا میرے اختیار میں نہیں، یہ کام تو ''مزدور حکومت'' کا ہے، اب مزدور کے لئے یہی راستہ ہے کہ وہ ''اپنی حکومت'' کے دروازے پر دستک دے، لیکن اول تو جو حکومت ''مزدوروں کے وسیع تر مفادات'' کے تحفظ اور ''مزدوروں کی عالمی حکومت'' کے قیام جیسے اہم کاموں میں شب و روز مشغول ہے، اسے اپنی طرف متوجہ کرنا کوئی آسان کام نہیں، پھر اگر فرض کیجئے کہ مزدور مر مار کر متعلقہ افسر یا وزیر تک پہنچ ہی جائے تو اس کے پاس یہ عذر ہے کہ دنیا بھر میں ''مزدوروں کی حکومت'' قائم کرنے کے لئے جن وسائل کی ضرورت ہے، وہ اس وقت تک حاصل نہیں ہو سکتے جب تک عام مزدور اپنے ذاتی مفاد کی قربانی پیش نہ کریں، لہٰذا ''مزدور مفاد'' کا تقاضا یہ ہے کہ اجرتیں نہ بڑھائی جائیں، اور مزدوروں کو چاہئے کہ وہ اپنا پیٹ کاٹ کر غیر اشتراکی دنیا کے ان مزدوروں کو ''مزدور حکومت'' کی پناہ میں لانے کی کوشش کریں جو ابھی تک سامراج کی چکی میں پس رہے ہیں۔

لیجئے! اس بے چارے مزدور کی آخری امید بھی ختم ہوگئی، اب وہ اگر یہ سمجھتا ہے کہ ''مزدور حکومت'' اسے بے وقوف بنا رہی ہے تو اس کے لئے نجات کا کوئی راستہ نہیں، ملک بھر میں کوئی سیاسی جماعت موجود نہیں ہے جس سے وہ جا کر فریاد کر سکے، نوکری چھوڑ کر کسی دوسرے کارخانے میں بھی نہیں جا سکتا، اس لئے کہ وہ کارخانہ بھی ''مزدور حکومت'' کا ہے اس پیشے کو بھی خیر باد نہیں کہا جا سکتا، اس لئے کہ ''مزدور حکومت'' نے اسے یہ پیشہ سوچ سمجھ کر دیا ہے، اور جب تک وہ خود اسے اس پیشے سے ہٹنے کی اجازت نہ دے وہ پیشہ نہیں چھوڑ سکتا، لہٰذا اب اس کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے کہ وہ اپنی زندگی کے آخری سانس تک حکومت کی مقرر کی ہوئی اجرت پر کام کرتا رہے، اور آئندہ اجرت بڑھانے کا نام بھی زبان پر نہ لائے ورنہ کوئی وجہ نہیں ہے کہ اسے ''مزدور دشمن سرگرمیوں'' اور ''سامراج کی جاسوسی'' کے الزام میں گرفتار کر کے جیل خانے میں بھیج دیا جائے۔

یہ ہیں ایک مزدور کے حق میں ''قومی ملکیت'' اور ''سوشلسٹ حکومت'' کے نتائج، اگر واقعات کی یہ تصویر کسی کو درست معلوم نہیں ہوتی تو وہ تفصیلی دلائل کے ساتھ یہ بتلائے کہ سوشلسٹ حکومت میں مزدور اپنی اجرت بڑھوانا چاہیں، پیشہ تبدیل کرنا چاہیں یا اپنے دوسرے حقوق حاصل کرنا چاہیں تو ان کے لئے طریق کار کیا ہوتا ہے؟ کارخانوں کے منافع میں ان کے لئے معقول حصہ ملنے کی ضمانت کیا ہے؟ حکومت اگر بددیانتی یا بے وقوفی سے کوئی ظالمانہ پالیسی اختیار کر لے تو اس کو تبدیل کیسے کرایا جا سکتا ہے؟ حکومت کے وسیع اختیارات پر مزدوروں کی طرف سے کون سی روک مقرر کی جاتی ہے؟ اجرتوں کا تعین کون اور کس معیار پر کرتا ہے؟ اور تعین میں عملی طور پر کام کرنے والے مزدوروں کی رائے کس حد تک مؤثر ہوتی ہے؟ جس وقت تک ان سوالات کا معقول اور مدلل و تشفی بخش جواب فراہم نہ کیا جائے، اس وقت تک محض ''مزدوروں کی حکومت'' کے نام سے مزدور کا پیٹ نہیں بھر سکتا۔

اس کے برخلاف اسلامی نظام کے تحت جو معاشی اصلاحات پچھلے شمارے میں تجویز کی گئیں، ان کی رو سے مزدور براہِ راست کارخانوں کی ملکیت میں حصہ دار بنیں گے، اور حصص کے مالک بن کر نفع میں متناسب طور سے شریک ہوں گے، ان کی آمدنی کے دروازے زیادہ اور عمومی ارزانی اور معاشرت کی سادگی کی وجہ سے اخراجات کے راستے کم ہوں گے، پھر اگر واقعتاً سوشلسٹ حضرات کے دل میں مزدوروں اور غریبوں کا ادنیٰ سا درد ہے تو وہ معقولیت کے ساتھ یہ بتلائیں کہ مزدوروں کی فلاح کے راستے کو کیوں اختیار نہیں کرتے جو ان کے حق میں مفید بھی ہے اور اسلام کے مطابق بھی؟ اور اس طریقے کو چھوڑ کر سوشلزم کے جابرانہ نظام ہی کو مسلط کرنے کے پیچھے کیوں لگے ہیں؟ اس سلسلے میں مزید کچھ گزارشات ہم انشاء اللہ آئندہ پیش کریں گے ____ واللّٰہ الموفق والمعین!

اسلام، جمہوریت اور سوشلزم

اسلام، جمہوریت اور سوشلزم

''اسلام ہمارا مذہب ہے
جمہوریت ہماری سیاست ہے
اور سوشلزم ہماری معیشت ہے۔''

یہ وہ نعرہ ہے جسے پچھلے دنوں ہمارے ملک کی بعض سیاسی جماعتوں نے بڑے اہتمام کے ساتھ پھیلایا ہے۔ اس نعرہ کی پہلی ہی سطر میں ''اسلام'' کا لفظ بظاہر یہ تاثر دیتا ہے کہ اس میں ''اسلام'' کو سب سے زیادہ نمایاں جگہ دی گئی ہے۔ لیکن اگر آپ غور فرمائیں تو یہ بات کھل کر سامنے آجائے گی کہ اس نعرے میں ''اسلام'' کی مثال بالکل اس شخص کی سی ہے جس کے ہاتھ پاؤں کاٹ کر اسے تختِ سلطنت پر بٹھا دیا گیا ہو۔

سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ ان تین جملوں کو پڑھ کر ''اسلام'' کا جو تصور ذہن میں آتا ہے، وہ یہ ہے کہ معاذ اللہ اسلام بھی عیسائیت، یہودیت یا ہندومت کی طرح پوجا پاٹ کی چند رسموں یا اخلاق کے چند مجمل اصولوں کا نام ہے اور زندگی کے دوسرے سیاسی، معاشی اور معاشرتی مسائل سے اس کا کوئی تعلق نہیں، اگر کوئی شخص عبادت کے چند خاص طریقوں کو اپنا لے تو اس کے بعد وہ اپنی حکومت اور اپنی معیشت کو جس نظام کے ساتھ بھی وابستہ کرنا چاہے کرسکتا ہے۔ وہ مسجد میں بیٹھ کر اسلام کی تعلیمات کا پابند ہے، لیکن اقتدار کی کرسی پر بیٹھنے کے بعد یا اپنے لئے رزق کی تلاش کے وقت اسلام نے یا تو اسے رہنمائی دی ہی نہیں ہے، یا اگر دی ہے تو وہ (معاذ اللہ) اتنی ناقص اور بیکار ہے کہ اس کے ذریعہ اس کے سیاسی اور معاشی مسائل حل نہیں ہوتے، لہٰذا وہ اس بات کا محتاج ہے کہ اپنی سیاست میں جمہوریت سے، اور اپنی معیشت میں سوشلزم سے ''روشنی'' حاصل کرے۔

سوال یہ ہے کہ اگر اسلام کا مفہوم یہی کچھ ہے تو پھر یہ دعوے آپ فضول کرتے ہیں کہ ''اسلام ایک مکمل نظام حیات ہے، اور اس میں انسان کی تمام موجودہ پریشانیوں کا حل موجود ہے۔''

پھر تو کھل کر آپ کو کہنا چاہئے کہ اسلام نے عبادات وعقائد کے علاوہ زندگی کے کسی مسئلہ میں ہمیں کوئی ہدایت نہیں دی اور (معاذ اللہ) ہم اپنے سینوں میں قرآن رکھتے ہوئے بھی کارل مارکس اور ماؤزے تنگ سے بھیک مانگنے پر مجبور ہیں۔

اگر آپ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ اسلام کی تعلیمات صرف عبادات وعقائد تک محدود نہیں ہیں، بلکہ وہ زندگی کا ایک مکمل نظام ہے، تو پھر مسجد ہو یا بازار، حکومت کا ایوان ہو یا تفریح کا میدان، آپ کو ہر مقام پر صرف اور صرف اسلام ہی کی پیروی کرنی پڑے گی، پھر اس طرزِ عمل کا کوئی مطلب نہیں ہے کہ مسجد میں پہنچ کر تو آپ بیت اللہ کی طرف رخ کریں، اور دفتر و بازار میں پہنچ کر ماسکو اور پیکنگ کو اپنا قبلہ و کعبہ بنالیں، آپ کو ہر زمانے میں اور ہر جگہ پر انسانیت کے صرف اس محسنِ اعظم ﷺ کے چشم و ابرو کو دیکھنا ہوگا جس کی تعلیمات نے صرف مسجدوں میں اجالا نہیں کیا، بلکہ اس کے نورِ ہدایت سے حکومت کے ایوان اور معیشت کے بازار بھی یکساں طور پر جگمگائے ہیں۔

اسلامی سوشل ازم اور اسلامی جمہوریت کی اصطلاحیں

بعض حضرات اس نعرے کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اس میں جس سوشلزم کو اپنایا گیا ہے وہ لادینی سوشلزم نہیں، بلکہ ''اسلامی سوشلزم'' ہے اور جس طرح ''جمہوریت'' اسلامی ہوسکتی ہے اسی طرح ''اسلامی سوشلزم'' کی اصطلاح بھی درست ہے۔

اس کے جواب میں ہماری گزارش یہ ہے کہ جہاں تک اصطلاح کا تعلق ہے، ہمارے نزدیک نہ ''اسلامی جمہوریت'' کی اصطلاح درست ہے اور نہ ''اسلامی سوشلزم'' کی، یہ دونوں نظام مغرب کی لادینی فکر کی پیداوار ہیں اور ان کے ساتھ اسلام کا پیوند لگانا ایک طرف اسلام کی توہین ہے اور دوسری طرف اس سے یہ اشتباہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ دونوں نظام جوں کے توں اسلام کے مطابق ہیں، لہٰذا لفظوں کی حد تک تو یہ دونوں اصطلاحیں ہماری نظر میں غلط اور مغالطہ انگیز ہیں اور مسلمانوں کو دونوں ہی سے پرہیز کرنا چاہئے۔

لیکن معنویت کے لحاظ سے ''اسلامی جمہوریت'' اور ''اسلامی سوشلزم'' میں زمین اور آسمان کا فرق ہے۔ جمہوریت کے فلسفے میں کچھ چیزیں تو ایسی ہیں جو اسلام کے خلاف ہیں، (مثلاً عوام کے اقتدارِ اعلیٰ کا تصور، لیجسلیچر کا خدائی احکام کی پابندی کے بغیر خودمختار واضع قانون ہونا، اور امیدوار حکومت کا از خود اقتدار کی طلب کرنا) لیکن جمہوریت کی وہ بہت سی باتیں اسلام کے مطابق بھی ہیں، جنہیں عرفِ عام میں جمہوریت کی بنیاد سمجھا جاتا ہے یعنی شورائی حکومت، تقسیم اختیارات، آزادی اظہارِ رائے اور عوام کے سامنے حکومت کی جواب دہی وغیرہ۔ اب جو لوگ ''اسلامی جمہوریت'' کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں، ان کے نزدیک اس سے مراد نظامِ جمہوریت کی صرف وہ باتیں ہیں جو اسلام کے خلاف نہیں ہیں، ان کو نکال کر جو باقی بچا وہ ''اسلامی جمہوریت'' ہے، انہوں نے کبھی یہ نہیں

کہا کہ اگر توحید، رسالت اور آخرت پر ایمان لا کر جمہوری نظامِ حکومت کو جوں کا توں قبول کر لیا جائے تو وہی لادینی جمہوریت اسلامی بن جاتی ہے۔ دوسرے الفاظ میں ان کے نزدیک لادینی جمہوریت کی خرابی صرف اس قدر نہیں ہے اس کا نظریہ پیش کرنے والے مادہ پرست اور غیر مسلم تھے جنہوں نے اپنی مادہ پرستی کا جوڑ جمہوریت کے ساتھ ملا دیا تھا اور اگر توحید پر ایمان رکھنے والے لوگ اسے بعینہٖ اختیار کر لیں گے تو اس کی خرابی دور ہو جائے گی، بلکہ ان کے نزدیک کچھ خرابیاں خود جمہوریت میں پائی جاتی ہیں، اور ان خرابیوں کو نکال کر باقی ماندہ حصے کو وہ ''اسلامی جمہوریت'' قرار دیتے ہیں۔

اس کے برعکس ''اسلامی سوشلزم'' کا نعرہ بلند کرنے والوں کا کہنا یہ ہے کہ سوشلزم کے معاشی نظام میں بذاتہٖ کوئی خرابی نہیں، اس کی خرابی صرف یہ ہے کہ اس کے پیش کرنے والے منکرِ خدا تھے اور انہوں نے اس انکارِ خدا کا جوڑ سوشلزم کے ساتھ ملا دیا تھا، اب اگر اسی معاشی نظام کو مسلمان اختیار کر لیں تو اس کی خرابی دور ہو جاتی ہے، گویا سوشلزم کے معاشی نظام کو جوں کا توں لے کر اس میں خدا، رسول اور آخرت کے عقائد کو شامل کر لیجئے تو وہی لادینی سوشلزم اسلامی بن جاتا ہے۔

اور اگر یہ حضرات یہ کہتے بھی ہیں کہ ہم نے سوشلزم سے غیر اسلامی اجزاء کو نکال کر اس کا نام ''اسلامی سوشلزم'' رکھا ہے تو اس سے ان کا مطلب یہی ہوتا ہے، ورنہ ان کا یہ دعویٰ دو وجہ سے غلط ہے، ایک تو اس لئے کہ انہوں نے اپنے تجویز کردہ معاشی نظام میں سوشلزم کے معاشی نظام کی تمام وہ باتیں باقی رکھی ہیں جو صریحی طور پر خلافِ اسلام ہیں، سوشلزم کی بنیاد وسائلِ پیداوار پر بہ جبر قبضہ کر لینے پر ہے، اور یہ بات جوں کی توں ان کے ''اسلامی سوشلزم'' میں بھی موجود ہے جس کی صراحت ان کے رہنما اپنی تحریر و تقریر میں ہمیشہ کرتے رہے، دوسرے اس لئے کہ سوشلزم کا صرف مادی فلسفہ نہیں، بلکہ اس کا معاشی نظام بھی سر سے لے کر پاؤں تک اسلام کے خلاف ہے، لہٰذا اگر اس میں سے غیر اسلامی اشیاء کو نکال دیا جائے تو حاصل تفریق کچھ بچتا ہی نہیں ہے جسے ''اسلامی سوشلزم'' کہا جا سکے۔

اس کی مثال یوں سمجھئے کہ ''اسلامی جمہوریت'' کی اصطلاح بالکل ایسی ہی ہے جیسے ''اسلامی بنکاری'' کی اصطلاح، موجودہ بینکاری کا سارا نظام سود پر چل رہا ہے، اس لئے یہ نظام بلاشبہ غیر اسلامی ہے، لیکن اگر اسی نظام سے سود کی گندگی کو خارج کر کے اسے مضاربت کے اصولوں پر چلایا جائے تو یہی اسلام کے مطابق ہو جائے گا، اب اگر کوئی شخص ایسے نظام کا نام ''اسلامی بنکاری'' رکھ دے تو اس کی اس اصطلاح پر تو اعتراض کیا جا سکتا ہے، لیکن معنویت کے لحاظ سے اس کی بات غلط نہیں ہے۔

اس کے برخلاف ''اسلامی سوشلزم'' کی مثال ایسی ہے جیسے ''اسلامی سود'' اور ''اسلامی قمار'' ___ اگر کوئی شخص یہ کہنے لگے کہ ''سود'' اور ''قمار'' کی خرابی صرف یہ تھی کہ اس کے موجد اسلام

کے بنیادی عقائد کے قائل نہیں تھے، اب ہم ان کے نظریات میں سے تمام غیر اسلامی اشیاء کو نکال دیتے ہیں، اور توحید، رسالت، اور آخرت کو مان کر سود کھاتے اور قمار کھیلتے ہیں، لہٰذا ہمارے سود و قمار کا نام اسلامی سود و قمار ہے، ظاہر ہے کہ یہ بات حد درجہ مضحکہ خیز ہوگی، اس لئے کہ سود و قمار سرتاپا خلافِ اسلام چیزیں ہیں، اور ان میں سے خلافِ اسلام اشیاء کو نکال دیا جائے تو کوئی چیز باقی ہی نہیں رہتی جس کا نام ''اسلامی سود'' یا ''اسلامی قمار'' رکھا جائے۔

لہٰذا اسلامی جمہوریت کی اصطلاح لفظی طور پر غلط سہی، لیکن معنی کے اعتبار سے ''اسلامی سوشلزم'' کو اس پر قیاس نہیں کیا جا سکتا۔ بعض حضرات یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ ہم نے ''اسلامی سوشلزم'' کی اصطلاح اس لیے اختیار کی ہے کہ ماضی میں بہت سے لوگوں نے سرمایہ دارانہ نظام کو اسلام کے مطابق ثابت کرنے کی کوشش کی ہے، اس اصطلاح سے صرف یہ جتانا مقصود ہے کہ اسلام سرمایہ دارانہ نظام کا حامی نہیں۔ لیکن یہ دلیل بھی انتہائی بودی اور کمزور ہے، کیونکہ ایک غلط فہمی کو رفع کر کے دوسری غلط فہمی پیدا کر دینا عقل و خرد کی کون سی منطق کا تقاضا ہو سکتا ہے؟ اگر واقعتاً مقصد یہی واضح کرنا ہے کہ اسلام سرمایہ دارانہ ظلم و ستم کا حامی نہیں تو پھر اس کے لئے ''اسلامی سوشلزم'' کے بجائے ''اسلامی عدل عمرانی'' (ISLAMIC SOCIAL JUSTICE) کی اصطلاح استعمال کی جا سکتی ہے۔

پھر اس نعرے میں اسلام اور جمہوریت کو سوشلزم کے ساتھ معصومیت سے شیر و شکر کر کے پیش کیا گیا ہے، گویا ان دونوں چیزوں کا سوشلزم کے ساتھ کوئی تصادم نہیں ہے۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ اشتراکیت نے جو راستہ اختیار کیا ہے وہ نہ تو کسی مرحلے پر اسلام سے میل کھاتا ہے اور نہ کسی مقام پر جمہوریت اسے چھو کر گزری ہے، اسلام بلاشبہ یہ چاہتا ہے کہ معاشرے میں دولت کی منصفانہ طریقے پر تقسیم ہو اور سرمایہ دارانہ نظام میں جو دولت چند ہاتھوں میں سمٹ کر رہ جاتی ہے وہ زیادہ سے زیادہ وسیع دائروں میں گردش کرے، لیکن اس مقصد کے لئے جو ظالمانہ طریق کار سوشلزم نے تجویز کیا ہے، اسلام اس کا بھی کسی طرح روادار نہیں، اس لئے کہ وسائلِ پیداوار کو لوگوں سے چھین کر حکومت کے چند افراد کے ہاتھوں میں تھما دینے کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا کہ ملک کی ساری دولت ایک بڑی سرمایہ دار جماعت کے حوالے ہو جائے، اور آدمی اپنا پیٹ بھرنے کے لئے پہلے سے زیادہ اس کے رحم و کرم کا محتاج ہو کر رہ جائے، لہٰذا انفرادی ملکیت کی جس نفی پر سوشلزم کی بنیاد ہے، اسلام چند قدم بھی اس کے ساتھ نہیں چل سکتا۔

اسی طرح سوشلزم کی تاریخ گواہ ہے کہ جمہوریت بھی کبھی اس کا ساتھ نہیں دے سکی،

جمہوریت کی روح ''آزادی اظہارِ رائے'' پر قائم ہے اور سوشلزم نظامِ زندگی میں یہ ایک ایسا لفظ ہے جس کا واقعات کی دنیا میں کوئی وجود نہیں ہے۔ سوشلزم جس جگہ قائم ہوا ہے، جبر و تشدد کے ذریعہ قائم ہوا ہے، اس نے ہمیشہ فکر و رائے کا گلا گھونٹ کر اپنا بھرم رکھنے کی کوشش کی ہے، اس کے خود پسند مزاج نے اس آواز کو کبھی گوارا نہیں کیا جو اس پر تنقید کرنے کے لئے اٹھی ہو۔ اور اس کی وجہ ظاہر ہے کہ اشتراکی نظام میں جو ''منصوبہ بند معیشت'' قائم کی جاتی ہے وہ شدید ترین آمریت کے بغیر نہ قائم ہو سکتی ہے نہ باقی رہ سکتی ہے۔ یقین نہ آئے تو ان ملکوں کے حالات پڑھ کر دیکھئے جہاں سوشلزم کے نظام کو نافذ کیا گیا ہے۔ کیا وہاں اشتراکی پارٹی کے سوا کوئی اور سیاسی جماعت پنپ سکتی ہے؟ کیا وہاں مزدور کو حق ہے کہ وہ اپنے حقوق حاصل کرنے کے لئے کوئی چھوٹی سی انجمن ہی بنالے؟ کیا وہاں کا مزدور حکومت کے کسی فیصلے کے خلاف ہڑتال کر سکتا ہے؟ کیا وہاں کے پریس کو آزادی ہے کہ وہ برسر اقتدار جماعت کے خلاف چوں بھی کر سکے؟ اگر ان سوالات کا جواب نفی میں ہے تو پھر آخر وہ کون سی جمہوریت ہے جس کا جوڑ سوشلزم کے ساتھ ملایا گیا ہے؟

خرد کا نام جنوں رکھ دیا جنوں کا خرد
جو چاہے آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے

ہم جانتے ہیں کہ بہت سے وہ حضرات بھی اس نعرے کے ساتھ ہم آواز ہو گئے ہیں جو ذہنی اعتبار سے سچے اور پکے مسلمان ہیں اور اسلام کو چھوڑ کر کوئی جنت ارضی بھی انہیں پیش کرے تو وہ اسے قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہوں گے۔ لیکن وہ سوشلزم کے فریب میں صرف اس لئے آ گئے ہیں کہ اس ''جنتِ شداد'' پر ''اسلام'' کا سائن بورڈ لگا دیا گیا ہے، ایسے حضرات سے ہم خاص طور پر دردمندانہ التجا کرتے ہیں کہ وہ مندرجہ بالا حقائق پر غور فرمائیں اور ''اسلامی سوشلزم'' کی تاریخ کا مطالعہ کر کے یہ دیکھیں کہ اس نے اسلام اور مسلمانوں پر کیسے کیسے ظلم ڈھائے ہیں؟ اور اسلامی اقدار کو کس طرح ایک ایک کر کے پامال کیا ہے؟ سرمایہ دارانہ نظام کی خرابیاں بلاشبہ قابل نفرین ہیں، اور ہر دھڑکتے ہوئے دل میں ان کو مٹانے کا جذبہ ہونا چاہئے۔ لیکن یاد رکھئے کہ غریب مزدور اور کسان کو امن و سکون صرف غریبوں کے اس چارہ ساز (صلی اللہ علیہ وسلم) کے دامن میں مل سکے گا جس نے کبھی پیٹ بھر کر کھانا نہیں کھایا، اشتراکیت کی جھولی میں گرنے کے بعد اس کی مثال اس پرندے سے مختلف نہیں ہوگی جو کھولتی ہوئی دیگ سے اچھل کر دہکتی ہوئی آگ میں جا گرے۔

سوشلزم اور معاشی مساوات

آپ نے ملاحظہ فرمالیا کہ سوشلزم میں مساوات کا لفظ کوئی عملی حقیقت نہیں رکھتا، بلکہ خالص اشتراکی ممالک کی اجرتوں میں ایک سودس اور تیس ہزار کا تفاوت موجود رہا ہے، یعنی چوٹی کے لوگوں کی تنخواہیں عام مزدوروں کے مقابلے میں تین سوگنا زائد ہوتی ہیں، اگر اسی کا نام معاشی مساوات ہے تو خدا جانے طبقاتی تفاوت کیا چیز ہوتی ہے؟ اس مختصر تشریح ہی سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ سوشلزم نے ''معاشی مساوات'' کا صرف نعرہ ہی لگایا ہے، ورنہ ٹھیٹھ اشتراکی ممالک میں بھی طبقات کا بدترین تفاوت موجود ہے۔

اس کے برخلاف اسلام کا معاملہ یہ ہے کہ اس نے کبھی بھی معاشی مساوات قائم کرنے کا جھوٹا دعویٰ نہیں کیا۔ اسلام دین فطرت ہے اور یہ فطرت اور حقیقت اس کی نگاہ سے کبھی اوجھل نہیں ہوئی کہ تمام انسانوں کی آمدنی کا برابر ہو جانا قطعی ناممکن ہے، جس طرح انسانوں کے درمیان ان کی صحت، خوبصورتی، عمر، ذہانت اور قوت کارکردگی میں فرق موجود ہے، اور اس فرق کو دنیا کی کوئی طاقت مٹا نہیں سکتی، آج تک کوئی ایسی مشین ایجاد نہیں ہوسکی جو انسانوں کو جسامت، قوت، وزن میں برابر کر دے۔ جب انسانی افراد میں یہ تفاوت مٹانا ممکن نہیں تو ان کی آمدنی میں تفاوت کا پایا جانا بھی قطعی ناگزیر ہے، جب تک انسانوں کی ذاتی صلاحیتوں میں فرق موجود ہے، اس وقت تک ان کی آمدنی میں بھی تفاوت موجود رہے گا اور دنیا کا کوئی نظام اس تفاوت کو ختم نہیں کرسکتا، اور کرنا بھی نہیں چاہئے کہ وہ صریح ظلم ہوگا۔ انسان کی ظاہری نظر کسی وقت دھوکا کھا سکتی ہے، لیکن قدرت کا یہ اٹل قانون تبدیل نہیں ہوسکتا۔ بعض اوقات انسان یہ محسوس کرتا ہے کہ ایک مٹی ڈھونے والے مزدور نے ایک تجربہ کار انجینئر کے مقابلے میں کہیں زیادہ محنت کی ہے، اس کے باوجود انجینئر نے گھنٹہ بھر معمولی محنت کر کے اتنے پیسے کما لیے جتنے مزدور نے دن بھر چلچلاتی دھوپ میں منوں مٹی ڈھو کر بھی نہیں کمائے، ہوسکتا ہے کہ کسی ظاہر بین کو یہ خیال ہو کہ مزدور کے ساتھ انصاف نہیں ہوا، لیکن جو شخص حقیقت پسند ہوگا وہ اس نتیجے پر پہنچے بغیر نہیں رہ سکے گا کہ انجینئر کی یہ کمائی درحقیقت صرف گھنٹہ بھر کی معمولی محنت کا معاوضہ نہیں بلکہ اس میں سالہاسال کی اس کی طویل ذہنی اور جسمانی محنت کا صلہ بھی شامل ہے جو اس نے انجینئرنگ کی تعلیم اور تجربہ حاصل کرنے میں صرف کی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اسلام نے آمدنی کے اس فطری تفاوت کا انکار کر کے کبھی مکمل معاشی مساوات قائم کرنے کا اعلان نہیں کیا، ہاں اس فطری تفاوت کو معقول، منصفانہ اور فطری حدود میں رکھنے کے لئے ایسے اقدامات کیے ہیں جن کے ذریعہ یہ تفاوت ظالمانہ سرمایہ داری کی شکل اختیار کر کے کسی فریق پر ظلم نہ بننے پائے۔

اس ناگزیر فطری تفاوت کو معقول اور منصفانہ حدود میں رکھنے کے لئے اسلام نے یہ طریقہ اختیار کیا ہے کہ تمام اشیاء (GOODS) اور خدمات (SERVICES) آزادانہ مسابقت کے بازار (FREE COMPETITION MARKET) میں پہنچ کر (رسد و طلب کی فطری قوتوں کے واسطے سے) اپنی قیمت آپ متعین کریں، اور حقیقت یہ ہے کہ آمدنی کے تفاوت کو اعتدال، انصاف اور معقولیت کی حدود میں رکھنے کا اس کے سوا کوئی راستہ نہیں، کسی بھی انسان کے پاس ایسا کوئی پیمانہ نہیں ہے جس کے ذریعہ وہ اشیاء اور خدمات کی سو فی صد مناسب قیمتیں مقرر کر سکے، لہٰذا جس طرح اشیاء و خدمات کی ذاتی قدروں (INTRINSIC VALUES) اور ان کے افادہ (UTILIY) کا تفاوت فطری ہے، اور اسے جانچنے کے لئے کوئی متعین پیمانہ نہیں ہے، اسی طرح ان کی بازاری قیمتوں (MARKET PRICES) کا تفاوت بھی انسان کی تعیین سے بالاتر ہے۔ صرف رسد و طلب کے فطری عوامل ہی کھلے بازار میں اس تفاوت کی شرح متعین کر سکتے ہیں۔

یہ معقول اور منصفانہ معیشت کی طبعی رفتار ہے، اور جہاں کہیں اس طبعی رفتار پر کوئی مصنوعی روک مقرر کی گئی ہے، اسی جگہ انسانوں کی آمدنی کا تفاوت غیر منصفانہ اور حد سے زائد ہو گیا ہے، سرمایہ دارانہ نظام میں سود، سٹہ، اور قمار کا رواج عام بازار کی آزاد مسابقت کو ختم کر کے اس میں چند افراد کی اجارہ داریاں قائم کر دیتا ہے۔ جس میں رسد و طلب کی قوتیں عوام کے حق میں مفلوج ہو کر سرمایہ داروں کا ساتھ دیتی ہیں، اور اس طرح اشیاء اور خدمات کی قیمتیں آزادی کے ساتھ بازار میں متعین نہیں ہوتیں، بلکہ سرمایہ دار کے نہاں خانۂ دماغ میں اس منصوبہ کے تحت مقرر ہوتی ہیں جس کا تانا بانا وہ خالص اپنے ذاتی منافع سے تیار کرتا ہے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ عوام کی آمدنی کا تفاوت اپنی فطری حدود میں رہنے کے بجائے اتنا زیادہ ہو جاتا ہے کہ دولت کا سارا بہاؤ چند سرمایہ داروں کی سمت پھر جاتا ہے اور عوام کی سمت کھلنے والے دولت کے تمام دہانے خشک ہوتے چلے جاتے ہیں۔

اس صورت حال کا اصل علاج یہ تھا کہ سود، سٹہ، قمار اور پرمٹ کے سسٹم کے ذریعہ جو اجارہ داریاں بازار کی آزادی کو ختم کیے ہوئے ہیں، انہیں توڑ کر آزاد مسابقت کی فضا پیدا کی جائے جس میں رسد و طلب کی قوتیں اپنا پورا عمل دکھا کر قیمتوں کے نظام کو معتدل طریقے سے استوار رکھ سکیں۔ لیکن

سوشلزم نے اس حقیقی علاج کے بجائے ایک دوسرا مصنوعی نظام مقرر کر دیا جس میں حکومت نے رسد و طلب کی فطری قوتوں کی جگہ لے کر پوری معیشت کو حکومتی پارٹی کی منصوبہ بندی کے تابع بنا دیا، اور قیمتوں اور اجرتوں کا نظام بھی اسی کے حوالے کر دیا۔

شروع میں یہ طریقہ اس لئے اختیار کیا گیا تھا کہ آمدنی کے تفاوت کو بالکل ختم کر دیا جائے، اس بات کے اعلانات بھی کیے گئے کہ آمدنی میں اب مکمل مساوات قائم کر دی جائے گی، لیکن آمدنی کا جس قدر تفاوت فطرت کا تقاضا تھا، جب اسے ختم کرنے پر قدرت نہ ہوئی تو ''معقول تفاوت'' کو بطور ایک اصول کے تسلیم کر لیا گیا، اور کہا گیا کہ مارکسزم مساوات پرستی کا دشمن ہے، لیکن ظاہر ہے کہ اس اصول کے عملی اطلاق کے لئے انسانوں کے پاس کوئی ایسا پیمانہ نہیں تھا جو معقول اور غیر معقول، ضروری، اور غیر ضروری، منصفانہ اور غیر منصفانہ تفاوت کے درمیان واضح حد بندی کر سکے، رسد و طلب کی آزاد فطری قوتیں جو یہ حد بندی کر سکتی تھیں، انہیں پہلے ہی ختم کر دیا گیا تھا۔ سرکاری منصوبہ بندی کا مصنوعی نظام جو بڑے بڑے افسروں کی ذاتی خواہشات یا ان کے مختلف نظریات کے مطابق لچکتے رہنے کی پوری صلاحیت رکھتا تھا، ان فطری قوتوں کی جگہ نہ لے سکا جو ان کی دسترس سے ماوراء ہیں۔ اس لئے اس تفاوت کی تعیین میں افراط و تفریط ہوتی رہی۔ جب تفاوت کا دروازہ ایک مرتبہ کھلا تو کھلتا چلا گیا، جس دلیل سے پانچ اور دس کا فرق معقول قرار پایا تھا، اس دلیل کو آگے بڑھا کر پانچ اور پندرہ کا تفاوت بھی منصفانہ قرار دے دیا گیا، اور یہ سلسلہ یہاں تک چلا کہ اشتراکی ممالک میں بھی آمدنی کا فرق ٹھیک اس سطح تک پہنچ گیا جو سرمایہ دارانہ نظام میں قائم ہوئی تھی۔

اس سے یہ بات واضح ہو گئی کہ سرمایہ دارانہ نظام اور اشتراکیت دونوں نے فطرت سے بغاوت کر کے معیشت کے پورے ڈھانچے کو مصنوعی طور سے کھڑا کرنے کی کوشش کی ہے، اس لئے اعتدال اور توازن دونوں میں سے کہیں قائم نہیں رہ سکا، اشتراکیت خواہ کتنے صدق دل سے امارت و غربت کی اونچ نیچ ختم کرنے کے لئے چلی ہو، فطرت سے منہ موڑنے کے بعد بالآخر وہ بھی طبقاتی تفاوت کے اس مقام پر پہنچ گئی جہاں سے اس نے بھاگنے کی کوشش کی تھی، اقبال مرحوم نے غالباً اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا۔

دستِ فطرت نے کیا ہے جن گریبانوں کو چاک
مردکی منطق کی سوزن سے نہیں ہوتے رفو

اسلام نے چونکہ قیمتوں اور اجرتوں کے نظام کو مصنوعی قیود سے آزاد رکھ کر اسے رسد و طلب کے فطری بہاؤ پر چھوڑ دیا ہے، اس لئے کبھی اشتراکیت کی طرح معاشی مساوات کا جھوٹا دعویٰ تو نہیں

کیا، لیکن آمدنی کے تفاوت کو کچھ اس طرح انصاف اور اعتدال کی حدود میں رکھا ہے کہ دولت خود بخود معاشرے میں ایک معقول توازن کے ساتھ گردش کرتی ہے، اور امیر و غریب کا وہ حد سے بڑھا ہوا فرق پیدا نہیں ہو پاتا جو سرمایہ دارانہ نظام، اور بالآخر اشتراکیت میں بھی لازماً پیدا ہو کر رہتا ہے۔

اسلامی مساوات کا صحیح مفہوم

ہم نے ابھی عرض کیا ہے کہ اسلام نے کبھی معاشی مساوات قائم کرنے کا دعویٰ نہیں کیا، اس پر شاید ذہنوں میں یہ خیال پیدا ہو کہ ہم ہمیشہ سے اسلام کی ایک لازمی خصوصیت مساوات سنتے آئے ہیں، ''اسلامی مساوات'' کا لفظ مسلمانوں نے ہمیشہ فخر کے ساتھ استعمال کیا ہے، اور ہر کس و ناکس یہ سمجھتا اور جانتا ہے کہ اسلام مساوات کا حامی ہے، اگر اسلام نے معاشی مساوات کا دعویٰ نہیں کیا تو پھر ان تمام باتوں کا کیا مطلب ہے؟

اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ درحقیقت اسلام جس مساوات کا علمبردار ہے وہ ٹھیٹھ معنی میں معاشی مساوات نہیں، بلکہ معاشرتی مساوات ہے۔ ''اسلامی مساوات'' کا مطلب یہ ہے کہ اسلام میں تمام مسلمان اپنے معاشرتی اور تمدنی حقوق میں بالکل برابر ہیں، کسی کو کسی پر اپنی قومیت، اپنی نسل و جاہ یا اپنے عہدہ و منصب کی وجہ سے کوئی فوقیت حاصل نہیں، اسلام میں یہ بات گوارہ نہیں کی جاسکتی کہ حکومت کا کوئی فرد محض اپنے بلند منصب کی وجہ سے قانون کی کسی گرفت سے آزاد ہو جائے، یا ایک مال دار شخص محض انکم ٹیکس ادا کرنے کی بناء پر کچھ ایسے معاشرتی اور تمدنی حقوق حاصل کرلے جو ایک غریب شخص کو محض غریبی کے جرم میں حاصل نہیں ہیں۔

اس معاشرتی مساوات کا لازمی اثر معیشت پر بھی پڑتا ہے، اور اس کی وجہ سے معیشت میں یہ مساوات ضرور پیدا ہو جاتی ہے کہ اسلامی معاشرے میں ہر شخص کو کسبِ معاش کے یکساں مواقع حاصل ہوتے ہیں، کوئی شخص دولت کا اجارہ دار بن کر دوسروں کے لئے عملاً کمائی کے راستے بند کرنے کا مجاز نہیں ہے ہاں ان یکساں مواقع سے جائز طور پر فائدہ اٹھا کر کوئی شخص اپنی ذہانت اور صلاحیت کے سبب دوسروں سے زائد کما لیتا ہے تو اسلام کی نظر میں وہ ہرگز مجرم نہیں ہے، اس کی آمدنی حلال طیب ہے، اور اسلام اس کی پوری طرح حفاظت کرتا ہے۔ اگر اس طریقے سے لوگوں کی آمدنی میں فرق پیدا ہو تو وہ ہرگز اسلام کے خلاف نہیں ہے، یہ فرق فطرت کے عین مطابق ہے، خود سرکار دو عالم ﷺ کے عہد مبارک میں یہ فرق موجود تھا، اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے دور میں موجود رہا اور تاریخ اسلام کے چودہ سو سالوں میں کوئی لمحہ بھی ایسا نہیں آیا جس میں یہ تفاوت موجود نہ رہا ہو البتہ اس تفاوت نے کبھی امیر و

غریب کے معاشرتی اور تمدنی حقوق میں فرق پیدا نہیں کیا، جو حقوق عثمان غنی رضی اللہ عنہ، عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ اور زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ جیسے صحابہ کو حاصل تھے وہی حقوق ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ، سلمان فارسی رضی اللہ عنہ اور بلال حبشی رضی اللہ عنہ کو بھی حاصل تھے، بلکہ بعض غریب حضرات اپنے علم وتقویٰ کی بنیاد پر عزت وشرف کے اعتبار سے مالدار حضرات کے مقابلے میں کہیں زیادہ بلند مقام پر فائز ہوتے رہے ہیں۔

اس تفصیل سے یہ بات بھی واضح ہوگئی کہ جو لوگ سوشلزم کی تائید میں بار بار ''اسلامی مساوات'' کو بیچ میں لاتے ہیں، وہ ایک بڑے بھاری خلط مبحث کا ارتکاب کرتے ہیں، سوشلزم جس معاشی مساوات کو اپنی منزل قرار دیتا ہے (لیکن نہ کبھی منزل تک پہنچا ہے نہ پہنچ سکتا ہے) اسلام نے اسے قائم کرنے کا کبھی دعویٰ ہی نہیں کیا۔ اس کی مساوات معاشرتی مساوات ہے جسے کسی بھی طرح سوشلزم کی تائید میں پیش نہیں کیا جاسکتا۔

سوشلسٹ اعتراضات

سوشلزم کے بارے میں ہم بار بار اپنے موقف کا اظہار کر چکے ہیں، ہمارے نزدیک ہی نہیں، اس ملک کے دس کروڑ مسلمانوں کے نزدیک پاکستان میں اسلام کے سوا کوئی نعرہ، کوئی نظریہ اور کوئی نظام قابل قبول نہیں ہوسکتا۔ پاکستان کی بنیاد ہی صرف اسلام کے نام پر رکھی گئی ہے۔ لہٰذا یہاں امریکہ اور یورپ کے سرمایہ دارانہ نظام کو گوارا کیا جا سکتا ہے، اور نہ روس اور چین کے اشتراکی نظام کو۔ ہم بار بار لکھ چکے ہیں کہ اس ملک کے عوام کی اکثریت یہاں اسی اسلام کو روبہ عمل دیکھنا چاہتی ہے جو سرکار دو عالم محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم لے کر تشریف لائے تھے۔ اس لئے اگر اس ملک میں اسلام کے علی الرغم اشتراکیت، سوشلزم یا کیمونزم کے نعرے لگتے ہیں تو یہاں کے ہر باشندے کا فطری حق ہے کہ وہ ان نعروں کے خلاف آواز اٹھائے، اور ہر اس تحریک کی مذمت کرے جو یہاں کسی غیر اسلامی نظریہ کو پروان چڑھانا چاہتی ہو۔

ہم نے اشتراکیت کے خلاف لکھ کر اپنے اسی فطری حق کو استعمال کیا تھا۔ ظاہر ہے کہ ہماری یہ تحریریں ان حضرات کو پسند نہ آسکیں جو اشتراکیت کے بالواسطہ یا بلاواسطہ حامی ہیں، اور اسی نظام کو یہاں قائم کرنے کے لئے اپنی توانائیاں صرف کررہے ہیں۔

ہماری ان تحریروں پر مختلف قسم کے اعتراضات کیے گئے ہیں، ان اعتراضات میں سے بعض تو وہ مخصوص سکہ بند اعتراضات ہیں جو ساری دنیا کے سوشلسٹ اور کمیونسٹ اپنے مخالفین کے خلاف پروپیگنڈہ کرنے کے لئے استعمال کیا کرتے ہیں، اور بعض وہ ہیں جو علمی نوعیت کے ہیں اور انہیں پیش

کرنے کا منشاء افہام وتفہیم ہے، ضد، عناد اور پروپیگنڈہ نہیں۔ ہم دوسری قسم کے اعتراضات کی بطور خاص قدر کرتے ہیں، اس قسم کے جتنے اعتراضات اور شبہات ہم تک پہنچے ہیں، ان کا حل ان صفحات پر پیش کررہے ہیں۔ اور دوسرے حضرات کو بھی دعوت دیتے ہیں کہ اگر ان کے ذہن میں اس موضوع سے متعلق کچھ اشکالات ہیں تو وہ پوری آزادی کے ساتھ ہمیں ان کی طرف متوجہ کریں۔ انشاء اللہ ہم پورے خلوص کے ساتھ ان کا جواب پیش کریں گے۔

رہے پہلی قسم کے اعتراضات، سو دراصل ان کا منشا سرے سے سمجھنا سمجھانا ہے ہی نہیں، وہ تو چند چلتے ہوئے جملے ہیں جنہیں پروپیگنڈے کی مشینریوں نے خاص اہتمام کے ساتھ گھڑا ہے، اور دنیا کے ایک سرے سے دوسرے تک انہیں نعرہ بازی کے لئے موقع بے موقع استعمال کیا جارہا ہے، لہٰذا ان کا کوئی تحقیقی جواب دینا تو اس لحاظ سے بالکل فضول ہے کہ ان کے گھڑنے والوں نے انہیں تحقیق کے لئے گھڑا ہی نہیں ہے، ان کا مقصد تو صرف اپنے مخالفوں کے خلاف نفرت پیدا کرنا ہے۔ لہٰذا کوئی شخص ہزاراں کا جواب دیتا رہے مگر پروپیگنڈے کا یہ راگ بند نہیں ہوسکتا۔

البتہ جن سادہ لوح عوام کو اس پروپیگنڈے سے مرعوب اور متاثر کیا جارہا ہے۔ انہیں حقیقتِ حال سے آگاہ کرنے کے لئے ان نعروں کی اصلیت بیان کرنا ضروری ہے، اس لئے ہم یہاں پہلے اسی قسم کے اعتراضات پر مختصر گفتگو کرنا چاہتے ہیں۔

سرمایہ داروں کے ایجنٹ

ہم پر سب سے پہلا اعتراض تو اشتراکیت کی ٹکسالی زبان میں یہ کیا گیا ہے کہ ہم ''سرمایہ داروں کے ایجنٹ'' ہیں، اور مزدوروں کی تحریک کے مقابلے میں سرمایہ داری کی حمایت کررہے ہیں۔

جیسا کہ ہم نے عرض کیا، اس اعتراض کا نشانہ صرف ہم کو نہیں، ہر اس شخص کو بننا پڑتا ہے جو اشتراکیت کے خلاف زبان کھولے۔ اسی وجہ سے اشتراکی عناصر سارے علمائے دین کو یہ ہی طعنہ دیتے رہتے ہیں کہ یہ لوگ محنت کشوں کے مقابلے میں سرمایہ داروں کی پشت پناہی کررہے ہیں۔

لیکن جس شخص کے دل میں عدل وانصاف کی ادنیٰ رمق موجود ہو، وہ اس سفید جھوٹ کو سچ سمجھنے کی حماقت نہیں کرسکتا۔ اگر سرمایہ داروں کی حمایت سے ان کی مراد اس سرمایہ دارانہ نظام کی حمایت ہے جو مغربی سامراج نے ہم پر مسلط کیا تھا اور جس نے غریب عوام کے خون کا ایک ایک قطرہ نچوڑ کر صرف چند افراد کی پرورش کی ہے، تو کسی عالم دین کا نام نہیں بتایا جاسکتا جس نے اس جابرانہ نظامِ معیشت کی حمایت کی ہو۔ اس کے برخلاف ہندوستان کی دوسو سالہ تاریخ میں اس سامراجی نظام کے

خلاف سب سے پہلے بغاوت کا علم اٹھانے والا اگر کوئی گروہ تھا تو وہ انہی علمائے حق کا مقدس طائفہ تھا جنہوں نے ہندستان پر مغرب کے سیاسی اور فکری تسلط کو زائل کرنے کے لئے اپنی جان، اپنا مال، اپنی آبرو، اپنے شخصی جذبات، اپنے مفادات اور اپنے اوقات کی بیش بہا قربانیاں پیش کی ہیں اور کون ہے جو اس معاملے میں ان سے زیادہ قربانیاں دینے کا دعویٰ کر سکے؟

ہاں یہ درست ہے کہ علماء حق نے سرمایہ دارانہ نظام کو صرف زبان سے گالیاں دینے اور اس پر چند مبہم اعتراضات کرنے کے بجائے خرابی کی اس جڑ کو پکڑا جس کے زور سے سرمایہ داری کا شجرۂ خبیثہ تناور ہوتا ہے۔ انہوں نے محسوس کیا کہ سرمایہ دارانہ نظام کی ساری خرابیوں کی بنیاد سود، قمار، سٹہ اور اکتناز ہے۔ یہی وہ راستے ہیں جس کے ذریعہ سرمایہ دار کے پاس دولت کے تالاب بہتے رہتے ہیں اور غریب انسان اس سے اپنے ہونٹ بھی تر نہیں کر سکتا، چنانچہ قیام پاکستان کے بعد سے لے کر اب تک تمام علماء متفقہ طور پر اپنی توانائیاں اس پر صرف کرتے رہے ہیں کہ کسی طرح اس ملک سے سرمایہ دارانہ نظام کی یہ لعنتیں ختم ہوں اور انکی جگہ اسلام کا متوازن نظامِ معیشت نافذ ہو جائے۔ ان کوششوں کے صلے میں انہیں ''تنگ نظری'' کے بھی طعنے دیئے گئے ''رجعت پسند'' اور ''دقیانوسی'' بھی کہا گیا، لیکن جس بات کو وہ حق سمجھتے تھے، یہ اوچھے ہتھیار انہیں اس کے اظہار سے نہ روک سکے۔ جو لوگ آج بڑے زور شور کے ساتھ سرمایہ داری سے نفرت اور غریبوں سے ہمدردی کے دعوے کر رہے ہیں، اس وقت غریبوں کی بے کسی نے ان کے دل میں کوئی درد پیدا نہیں کیا، اس وقت یہی لوگ تھے جنہوں نے راہ میں رکاوٹیں کھڑی کر کے اس سرمایہ دارانہ نظام کو سہارا دیا تھا۔ انہوں نے ہی اس ملک میں سود، قمار اور سٹہ کی پشت پناہی کی، اور جو علماء غریبوں کو اس ظلم و ستم سے نجات دلانا چاہتے تھے، انہیں ''تنگ نظر'' اور ''رجعت پسند'' قرار دے کر مطعون کیا۔

لیکن یہ عجیب و غریب منطق ہے کہ جن لوگوں نے سودی نظامِ معیشت کو ملک پر مسلط رکھنے کی کوشش کی، وہ سرمایہ داروں کے ایجنٹ نہ ہوئے، جنہوں نے پاکستان سے قمار، انشورنس اور لائسنس پرمٹ کے مروجہ طریقے ختم کرنے کی مخالفت کی، وہ سرمایہ داری کے حامی ہو گئے، جنہوں نے ساری عمر زمینوں کے سودی رہن اور سودی قرضوں کی وکالت کی وہ جاگیرداری کے محافظ نہ کہلائے، جنہوں نے پورے ملک کی معیشت کو سٹہ بازوں کے رحم و کرم پر چھوڑے رکھا، وہ سرمایہ داری کی پشت پناہی کے مجرم نہ ہوئے، جنہوں نے سرمایہ دارانہ نظام کے سب سے بڑے مخالف ــــ اسلامی نظامِ معیشت ــــ کا ہر طرح راستہ روکا، ان پر سرمایہ داری کی حمایت کا الزام نہ لگا ــــ اور وہ علماء جو روزِ اوّل سے ان تمام لعنتوں کے مقابلے میں سینہ سپر رہے اور جنہوں نے سرمایہ دارانہ نظام کو مٹا کر یہاں

اسلام کا عادلانہ نظام لانے کی کوشش کی وہ سرمایہ داروں کے ایجنٹ قرار پا گئے ـــــ صرف اس لئے کہ وہ سرمایہ داری کے ظلم وستم کے بدلے اشتراکیت کا جبر واستبداد پسند نہیں کرتے تھے!

حقیقت یہ ہے کہ جہاں تک موجودہ سرمایہ دارانہ نظام کے ظلم وستم کا تعلق ہے، علمائے دین سے زیادہ اس کی مخالفت کا دعویٰ کوئی نہیں کر سکتا۔ علماء کی تحریر وتقریر، ان کے بیانات اور ان کی پیہم عملی کوششیں اس بات کی گواہ ہیں کہ انہوں نے ہمیشہ اس قارونی نظام کو ختم کرنے کی کوشش کی ہے، اب بھی وہ اس کے زبردست مخالف ہیں، اور آئندہ بھی مخالف رہیں گے، لیکن ان کے نزدیک سرمایہ دارانہ نظام کو ختم کرنے کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ اسلام کے نظامِ زندگی کو بہ تمام وکمال نافذ کر دیا جائے، کیونکہ سرمایہ دارانہ ظلم وجور کا جتنا منصفانہ حل اسلام کے پاس ہے، دنیا کے کسی نظام کے پاس نہیں ہے۔

خاص طور سے سوشلزم نے سرمایہ داری کی مخالفت کا جو راستہ اختیار کیا ہے، وہ ہمارے نزدیک نہایت مضر، بے حد خطرناک اور انتہائی تباہ کن ہے، سوشلزم بھی اسی مغربی مادیت کی پیداوار ہے جس نے سرمایہ داری کا عذاب دنیا پر مسلط کیا تھا، اور اس کا مطلب بھی سوائے اس کے کچھ نہیں ہے کہ کروڑوں عوام کی تقدیر چند سرکاری افسروں کے ہاتھ میں تھما دی جائے جو عوام کے صرف پیسے پر ہی نہیں، بلکہ ان کے دماغ پر، ان کے ضمیر اور زبان پر اور ان کے جذبات وخواہشات پر پورے جبر و استبداد کے ساتھ حکمرانی کریں، انہیں سر سے لے کر پاؤں تک اپنے مفادات کا غلام بنا کر ان سے مشین کے بے جان کل پرزوں کی طرح کام لیں، اور انہیں اشتراکی آمریت کے اس ہولناک شکنجے میں کس ڈالیں جو انسان سے اس کے قلب وروح کا ہر اختیار سلب کر لینے کے بعد اس سے فریاد کرنے والی زبان بھی چھین لیتا ہے۔

سوشلزم کا یہ سراسر غیر انسانی نظامِ زندگی درحقیقت سرمایہ دارانہ نظام ہی کی ایک بدترین صورت ہے، جس میں ایک بڑا سرمایہ دار چھوٹے چھوٹے سرمایہ داروں کو ہضم کر کے غریب عوام کے لئے زیادہ مہلک ہو جاتا ہے۔ لہٰذا ہم یہ ضروری سمجھتے ہیں کہ موجودہ سرمایہ دارانہ نظام کو ختم کرنے کی کوششوں کے ساتھ ساتھ سوشلزم اور کمیونزم کے اس انسان کش نظام کا بھی پوری قوت کے ساتھ مقابلہ کرنے کی ضرورت ہے۔ ورنہ ہماری کوششوں کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نہیں ہوگا کہ ایک ظلم دفع ہونے کے بعد اس سے بدترین ظلم وجور ہم پر مسلط ہو جائے گا۔

اب اگر کوئی شخص اشتراکیت کی اس مخالفت کا نام سرمایہ داری کی حمایت رکھتا ہے، اور جو لوگ اس اشتراکی عذاب کو اپنے سروں پر مسلط نہیں کرنا چاہتے، انہیں سرمایہ داروں کا ایجنٹ کہتا ہے تو ہزار کہا کرے۔ جس طرح ''تنگ نظری'' اور ''دقیانوسیت'' کے طعنے ہمیں سرمایہ داری کی مخالفت سے نہیں

روک سکتے، اسی طرح ہم ان جھوٹے طعنوں سے ڈر کر آج بھی اظہارِ حق سے باز نہیں رہ سکتے، ہم ہلاکت اور تباہی کا وہ مہیب غار اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں جس کی طرف ہمارے سادہ لوح عوام کو مکروفریب سے دھکیلا جارہا ہے، ہم ان خوش نما جالوں کی حقیقت سے بھی واقف ہیں جو مزدور اور کسانوں کو اشتراکی آمریت کے شکنجے میں کسنے کے لئے ان پر ڈالے جارہے ہیں، ہم ''مساوات'' ''مزدوروں کی فلاح'' اور ''خوش حالی'' کے ان پرفریب نعروں سے بھی بخوبی باخبر ہیں جو اس ملک میں بڑے بڑے زمینداروں کی طرف سے زور شور کے ساتھ لگائے جارہے ہیں، لہٰذا ہم اپنا فرض سمجھتے ہیں کہ عوام کو اشتراکیت کے اس فتنے سے آگاہ کریں اور کوئی طعنہ، کوئی نعرہ اور کوئی الزام ہمیں اس فریضے کی ادائیگی سے نہیں روک سکتا۔ اشتراکیت کے پرستار ہمارے لئے اس طرح کے ہزاروں الزامات اور تراش لیں، جب تک ہماری زبان میں گویائی کی طاقت اور ہمارے قلم میں لکھنے کی صلاحیت موجود ہے، انشاء اللہ ہم اس حقیقت کا برملا اظہار کرتے رہیں گے کہ سرمایہ داری سے نجات کا راستہ اشتراکیت میں نہیں، اسلام میں ہے۔

سوشلزم کی مخالفت کی وجہ سے اشتراکی ممالک سے تعلقات پر برا اثر

ایک اور عجیب وغریب اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ سوشلزم کی مخالفت سے روس، چین اور دوسرے اشتراکی ممالک کے ساتھ پاکستان کے تعلقات پر برا اثر پڑے گا، چین نے ستمبر ۶۵ء کے جہاد میں ہماری جو مدد کی تھی، اس کا تقاضا ہے کہ ہم اشتراکی نظریات کو برا بھلا نہ کہیں۔

لیکن یہ بات وہی شخص کہہ سکتا ہے جو سیاسی دوستی اور ذہنی غلامی کو ہم معنی سمجھتا ہو، اشتراکی ممالک کیساتھ دوستی اور پرامن تعلقات قائم کرنا ہماری نظر میں مستحسن ہے لیکن اس کے یہ معنی کیسے ہو گئے کہ ہم اپنے قلب، اپنے دماغ، اپنی فکر اور اپنے ایمان کی ساری متاع اشتراکیت کے حوالے کر دیں، اور اگر کوئی شخص ہمارے ملک میں سوشلزم کا سراسر غیر اسلامی نظام نافذ کرنے کے لئے ''اسلام مردہ باد'' کے نعرے لگائے تو ہم اس کی زبان کو لگام دینے کی جرأت بھی نہ کرسکیں۔

دنیا کا ہر ملک تعلقات خارجہ کی سطح پر مختلف ملکوں کے ساتھ تجارتی، سیاسی اور فوجی روابط قائم رکھتا ہے اور علمی سطح پر ایک دوسرے کے عقائد ونظریات پر تنقید بھی ساتھ ساتھ جاری رہتی ہے لیکن یہ نرالا قانون ہم نے کہیں نہیں سنا کہ جس ملک کے ساتھ اس قسم کے روابط قائم کیے گئے ہوں، اس کے نظریات کو بھی نہ صرف درست ماننا ضروری ہے بلکہ ان نظریات کو اپنے ملک کا دستور وقانون بھی بنالینا چاہئے اور اگر کوئی شخص ہمارے ملک میں ان نظریات کی تبلیغ کرے یا انہیں نافذ کرنا چاہے تو اس کی

تردید بھی نہیں کی جاسکتی۔

اور اگر کوئی روس یا چین میں اشتراکیت کو ختم کر کے اس کی جگہ اسلامی نظام قائم کرنے کی کوشش کرے تو کیا یہ ممالک پاکستان اور دوسرے اسلامی ممالک سے دوستی کی بناء پر خاموش بیٹھے رہیں گے؟ کیا اب بھی وہاں پر اسلامی عقائد وافکار پر تنقید نہیں کی جاتی؟ کیا وہ اسلامی ممالک سے دوستانہ تعلقات قائم کرنے کے بعد اسلام کو اپنا لینے کے قائل ہو گئے ہیں اگر ان تمام سوالات کا جواب نفی میں ہے تو آخر ہم ہی اتنے بے ضمیر کیوں ہیں کہ اشتراکی ممالک سے سیاسی تعلقات قائم کرنے کے بعد نظریات کا دفاع کرنے کے ہر حق سے دست بردار ہو گئے ہیں؟

اگر کوئی شخص ہمیں یہ مشورہ دیتا ہے کہ اشتراکی ممالک سے دوستی کے بعد ان کو تمہارے نظریات اپنانے پر مجبور نہیں کیا جاسکتا، لیکن تم ان کے نظریات اپنانے پر مجبور ہو تو اس کی وجہ اس کے سوا کیا ہوسکتی ہے کہ اشتراکی ممالک مادی اعتبار سے طاقتور ہیں اور ہم ان کے مقابلے میں کمزور، تو غالبًا اشتراکیت کا فلسفہ یہی کچھ سکھاتا ہے کہ ہر کمزور کو صرف اپنا ظاہری ڈھانچہ ہی نہیں، اپنے عقائد وافکار اور اپنے قلب وضمیر بھی طاقتور کے قدموں پر نچھاور کر دینے چاہئیں۔

❀❀❀

زرعی اصلاحات

آج کل حکومت کے جس کارنامے کو سب سے زیادہ قابل فخر قرار دیا جا رہا ہے وہ ''زرعی اصلاحات'' کا اقدام ہے جس کی رو سے زمین کی ملکیت کی حد ڈیڑھ سو ایکڑ مقرر کر دی گئی ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ کیا اس اقدام کے ذریعہ ہمارے زراعتی نظام سے بے انصافیوں کا خاتمہ ہو جائے گا؟ ہم یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ آخر یہ کیسے فرض کر لیا گیا ہے کہ جس شخص کے پاس ڈیڑھ سو ایکڑ زمین ہوگی وہ یقیناً جائز طریقے سے حاصل کی گئی ہوگی، اور وہ اپنے کاشتکاروں پر کوئی ظلم نہیں کرے گا اور جس شخص کی زمین ڈیڑھ سو ایکڑ سے ایک ایکڑ بھی زائد ہے اس کی ملکیت بھی ناجائز ہے وہ اپنے مزارعین پر ظلم بھی ضرور توڑتا ہوگا، اور یہ ایک ایکڑ زمین وہ واپس کر دے تو سارا ظلم ختم ہو جائے گا؟ ہمارے زرعی نظام کا اصل مسئلہ زمینداروں کا وہ ظلم وستم ہے جو وہ اپنے کاشتکاروں پر توڑتے ہیں اور جس کی وجہ سے مزارعین کی حیثیت ان کے غلاموں کی سی ہوگئی ہے اس ظلم وستم کو روکنے کے لئے اسلامی تعلیمات کی رو سے کرنے کا کام یہ تھا کہ ڈیڑھ سو کی حد بندی کے بجائے تمام وہ زمینیں مستحقین کو دی جاتیں جو ناجائز ذرائع سے حاصل کی گئی ہیں، جن میں سالہا سال سے میراث جاری نہیں ہوئی، یا جو داخلی رہن کے ذریعہ غریب زمین والوں سے چھین کر بڑے زمینداروں نے اپنی ملکیت میں داخل کر لی ہیں، نیز بٹائی کی منصفانہ شرح مقرر کی جاتی اور ان تمام ناجائز شرائط کو قابل تعزیر جرم قرار دیا جاتا جو زمینداروں نے اپنے کاشتکاروں پر قولی یا عملی طور سے عائد کر رکھی ہیں اور جن کی وجہ سے کاشتکار غلاموں سے بھی بدتر زندگی گزارنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ ضروری تھا کہ آڑھتیوں کی لوٹ کھسوٹ کو ختم کر کے کاشتکاروں کو اپنی پیداوار کا مناسب صلہ پانے کے مواقع فراہم کیے جاتے۔

مختصر یہ ہے کہ ہمارے زرعی نظام کی خرابیاں اتنی پیچ در پیچ ہیں کہ اسلامی احکام کو نظر انداز کر کے ڈیڑھ سو ایکڑ کی حد بندی کر دینے سے ان کو دور نہیں کیا جا سکتا۔ درحقیقت تحدید ملکیت ایک ایسا طریقہ ہے جس سے ہمارے زرعی نظام کے اصل مسائل حل ہو ہی نہیں سکتے، اس میں فریب کاروں کے لئے چور دروازے ہمیشہ موجود رہتے ہیں۔ ۵۹ء میں جو تحدید کی گئی اس میں بھی یہی تجربہ ہوا، اور حالیہ تحدید کے نتائج بھی اس سے مختلف نہیں ہو سکتے۔ سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ حالیہ زرعی اصلاحات میں تمام زمینداروں کو پندرہ ہزار یونٹوں کی اور جنہوں نے دسمبر ۱۹۷۱ء سے پہلے ٹیوب ویل یا ٹریکٹر خرید رکھے ہوں ان کو مزید تین ہزار یونٹوں کی (گویا مجموعی طور سے اٹھارہ ہزار یونٹوں کی) جو

چھوٹ دی گئی ہے اس کی موجودگی میں یہ تحدید عملاً بے معنی ہو کر رہ جائے گی، اس کے علاوہ تحدید بھی خاندان کے بجائے افراد کی بنیاد پر رکھی گئی ہے اور حقیقت یہ ہے کہ خاندان کی بنیاد پر تحدید عملاً بے حد دشوار بھی ہے اس لئے یہ بڑے بڑے زمینداروں کے لئے تحدید کی زد سے بچنے کا ایک مخفی دروازہ ہے۔ اس طرح بڑے بڑے زمیندار اب بھی عملی طور پر ہزاروں ایکڑ زمین پر متصرف رہیں گے۔

اور اگر بالفرض کسی شخص کے پاس صرف ڈیڑھ سو ایکڑ زمین ہی رہے تو کیا وہ بٹائی کے معاملہ میں اپنے کاشتکاروں پر ظلم نہیں کر سکے گا؟ یہ عجیب وغریب فلسفہ ہے کہ کوئی شخص ایک سو اکیاون ایکڑ کا مالک ہے تو وہ ظالم وغاصب ہے، اور کسی کے پاس ایک سو پچاس ایکڑ ہیں تو وہ ظلم وغصب کے ہر الزام سے بری ہے۔

اسلام نے اسی وجہ سے گزوں اور ایکڑوں کے حساب سے ملکیت کی کوئی حد مقرر کرنے کے بجائے اپنے احکام کا مدار جائز وناجائز اور حلال وحرام پر رکھا ہے اور عدل وانصاف کو سہل الحصول اور دادرسی کو مفت بنانے کا اہتمام کیا ہے، اور درحقیقت اس قسم کے مظالم کے انسداد کا یہی واحد راستہ ہے۔ کسی کے پاس ایک ایکڑ زمین بھی ناجائز ذرائع سے حاصل کی ہوئی ہے تو وہ اس سے چھین لی جائے گی، اور اگر کسی کے پاس ایک ہزار ایکڑ ہیں اور وہ سب جائز طریقے سے حاصل کیے گئے ہیں تو اس کے حقِ ملکیت کا پورا احترام کیا جائے گا۔ اسی طرح زمیندار اور کاشتکار کے تعلقات میں اصل مسئلہ یہ ہے کہ زمیندار نے کاشتکار پر قولی یا عملی طور سے ایسی ناجائز شرائط تو عائد نہیں کر رکھیں جن کی وجہ سے کاشتکار ایک مساوی حیثیت کا فریقِ معاملہ ہونے کے بجائے زمیندار کا مجبور ومقہور غلام بن گیا ہو۔ اگر کسی زمیندار نے کاشتکار کو اس کے پورے حقوق دے کر اسے اپنے برابر ایک فریق معاملہ کی حیثیت دی ہے اور اس کے ساتھ کوئی ظلم یا غصب کا برتاؤ نہیں کیا تو وہ اسلام کی گرفت سے آزاد ہے، خواہ اس کی جائز ملکیت میں کتنی زمین ہو، اور اگر کسی زمیندار نے اپنے کاشتکاروں کو غلام بنایا ہوا ہے، ان کے انسانی حقوق دبا رکھے ہیں یا وہ ان کو محنت کا مناسب صلہ نہیں دیتا تو وہ اسلام کی نظر میں قابل گرفت ہے خواہ اس کی مملوکہ زمین ڈیڑھ ایکڑ یا اس سے بھی کم ہو۔ لہٰذا کاشتکاروں کے حقوق کی رعایت اس وقت تک ممکن نہیں جب تک مندرجہ ذیل اقدامات پر عمل نہ کیا جائے۔

۱۔ ملکیت کی تحدید کے بغیر جتنی زمینیں ناجائز ذرائع سے حاصل کی گئی ہیں وہ واپس لے کر یا اصل مستحقین کو دلائی جائیں یا اگر ان کے اصل مالک معلوم نہ ہوں تو حکومت انہیں اپنی تحویل میں لے کر بے زمین افراد میں تقسیم کرے۔

۲۔ اسلام کے قانونِ وراثت پر ٹھیک ٹھیک عمل کرایا جائے۔ اور احیاء اموات کے شرعی قوانین

نافذ کیے جائیں۔

۳۔ جو زمینیں داخلی رہن کے ذریعہ زمینداروں نے ہتھیا رکھی ہیں وہ قرض داروں کو واپس کی جائیں۔

۴۔ بٹائی کی ایسی شرح متعین کی جائے جو رفتہ رفتہ ارتکازِ دولت کو ختم کر کے تقسیمِ دولت کے نظام کو متوازن بنا سکے۔

۵۔ بٹائی کے معاملہ سے زمینداروں کی ناجائز شرائط کو قابلِ تعزیر جرم قرار دیا جائے اور ایسے انتظامات کیے جائیں جن سے کاشتکار ایک مساوی حیثیت کے فریقِ معاملہ کی حیثیت سے زندگی گزار سکے۔

۶۔ آڑھتیوں اور دلالوں کے واسطے ختم یا کم کر کے ایسا انتظام کیا جائے کہ کاشتکار اپنی پیداوار کو کسی دباؤ کے بغیر مناسب قیمت پر فروخت کر سکیں۔

۷۔ ایسے غیر سودی بینک قائم کیے جائیں جن سے کاشتکاروں کو بلاسودی قرضے اور آسان اقساط پر زرعی آلات مہیا ہو سکیں۔

۸۔ پھر سب سے اہم بات یہ ہے کہ زرعی عدالتوں کے نظام کو سہل الحصول اور مستحکم بنایا جائے، آج مظلوموں کی شکایت کا سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ انصاف کا حصول اس کی دسترس سے باہر ہے، ان کے لئے ظلم پر صبر کر لینا زیادہ آسان ہے، بہ نسبت اس کے کہ وہ سالہا سال عدالت کے چکر کاٹتے پھریں، اور اس میں اپنا وقت اور روپیہ برباد کریں، خصوصاً جب کہ مقابلے پر کوئی بڑا زمیندار یا سرمایہ دار ہو تو مظلوم عدالت تک پہنچنے کی ہمت بھی نہیں کر سکتا۔ اگر انصاف کے حصول میں یہ ناقابلِ برداشت دشواریاں بدستور برقرار رہیں تو بہتر سے بہتر قانونی نظام بھی مظلوموں کی دادرسی نہیں کر سکتا۔ اس لئے اس طرف سب سے زیادہ توجہ کی ضرورت ہے۔

یہاں ان مجمل اشاروں کی تفصیل کا موقع نہیں ہے، عرض کرنے کا منشاء یہ ہے کہ ہمارے زرعی نظام میں جو خرابیاں پائی جاتی ہیں وہ تحدید ملکیت کے اقدام سے دور نہیں ہو سکتیں، اگر انہیں فی الواقع دور کرنا ہے تو وہ اسلامی تعلیمات کے بغیر ممکن نہیں اور اس کے لئے مختلف سمتوں میں محنت اور منصوبہ بندی کے ساتھ کام کرنا ہوگا، اور اس غرض کے لئے ملک کے اہلِ علم و فکر، ماہرینِ قانون اور زراعت کا عملی تجربہ رکھنے والوں کی مشترک مساعی کی ضرورت ہوگی۔

صدر بھٹو نے زرعی اصلاحات کا اعلان کرتے ہوئے فرمایا ہے:

''ملکیت کی تحدید خاندان کی بنیاد پر کی جائے یا افراد کی بنیاد پر؟ اس مسئلہ کا اچھی طرح جائزہ لیا گیا۔ یہ مسئلہ چونکہ فقہ سے متعلق تھا اس لئے ہم نے معروف مسلمان محققین اور قانون دانوں سے رہنمائی اور مشورہ طلب کیا۔ اس سے جو مسلمہ نتیجہ سامنے آیا وہ یہ تھا کہ اسلام فرد کے حقوق کو تسلیم کرتا ہے، اور خاندانی ملکیت کے نظام کو تسلیم نہیں کرتا۔ مسلمان ہونے کی حیثیت سے ہم کسی ایسی اسکیم کا تصور بھی نہیں کر سکتے جو اسلامی رجحانات کے خلاف ہو، لہٰذا اسلامی احکام کی پیروی کرتے ہوئے یہ تحدید افراد کی بنیاد پر رکھی گئی، نہ کہ خاندان کی بنیاد پر''

(صدر کی نشری تقریر کا متن ماخوذ از روزنامہ ڈان کراچی ۳ مارچ ۱۹۷۶ء)

اس فقرے میں صدر کی یہ بات انتہائی قابل قدر ہے کہ ''ہم کسی ایسی اسکیم کا تصور بھی نہیں کر سکتے جو اسلامی رجحانات کے خلاف ہو'' لیکن ہم یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ وہ کون سے مسلمان محققین تھے جنہوں نے زرعی اصلاحات کے مسئلہ میں اسلام کا مکمل موقف واضح کرنے کے بجائے صرف اس چیز کو اسلام کے سر بھیڑ دیا ہے جو زمینداروں کے لئے تحدید کی زد سے بچ نکلنے کا چور دروازہ بن سکتی ہے؟

❁❁❁

ذکر وفکر

بچت کا ہفتہ اور حکومت کی مالی اسکیمیں

حمد وستائش اس ذات کے لئے جس نے اس کارخانۂ عالم کو وجود بخشا

اور

درود وسلام اس کے آخری پیغمبر پر جنہوں نے دنیا میں حق کا بول بالا کیا

حکومت نے ۱۵ مئی سے ۲۰ مئی تک ملک بھر میں بچت کا ہفتہ منانے کا اعلان کیا ہے، اس موقع پر محترم صدر مملکت نے اپنے پیغام میں کہا ہے کہ ''ہفتۂ بچت'' کا بنیادی مقصد ہمیں اپنی اس اخلاقی اور قومی ذمہ داری کا احساس دلانا ہے کہ ہم اپنی آمدنی کا ایک حصہ قومی بچت کی اسکیموں میں لگانے کے لئے علیحدہ رکھیں۔ انہوں نے کہا کہ کسی ملک کی اقتصادی ترقی کا دارومدار باقاعدہ ترقیاتی منصوبوں میں سرمایہ سرکاری پر ہے، جبکہ ترقیاتی منصوبہ بندی کا انحصار فنڈ کی دستیابی پر ہے۔ چنانچہ ہر انفرادی بچت ملک کی اقتصادی ترقی میں تعمیری کردار ادا کرتی ہے۔ صدر نے کہا کہ یہ ایک بدیہی امر ہے کہ قومی ترقی کی ضروریات پوری کرنے کے لئے ہم جس قدر زیادہ اپنے ملکی وسائل کو استعمال میں لائیں گے اسی قدر غیر ملکی امداد پر ہمارا انحصار کم ہوتا جائے گا۔ اس لئے ہر شخص کو عہد کرنا چاہئے کہ وہ اپنی تمام کی تمام آمدنی خرچ کرنے کے بجائے اس کا ایک حصہ قومی بچت اسکیموں میں لگائے گا۔

محترم وزیر خزانہ جناب غلام اسحاق خان نے بھی اس موقع پر اپنے پیغام میں کہا ہے کہ کوئی بھی ملک سخت محنت اور کفایت شعاری کے بغیر ترقی کے مطلوبہ مقاصد حاصل نہیں کرسکتا۔ انہوں نے کہا بدقسمتی سے ہمارے ملک میں بچت کی شرح دوسرے ترقی پذیر ملکوں کے مقابلے میں کم ہے، جس کے نتیجے میں ہمیں سرمائے اور سرمایہ کاری کی ضروریات پوری کرنے کے لئے غیر ملکی وسائل پر انحصار کرنا پڑتا ہے۔ اس لئے ہر شخص کا یہ اسلامی فرض ہے، اور حب الوطنی کا تقاضا ہے کہ وہ سادہ زندگی بسر کرے، اور تھوڑی بہت جو بھی بچت کرسکتا ہے کرے۔ وفاقی وزیر خزانہ نے اندرون اور بیرون ملک پاکستانیوں سے اپیل کی ہے کہ وہ ''ہفتۂ بچت'' کو کامیاب کرنے کے لئے قومی بچت کی مختلف اسکیموں میں سرمایہ کاری کریں۔ (روزنامہ جنگ کراچی ۱۵ مئی ۱۹۸۲ء)

پاکستان کے عوام کو بچت کی ترغیب اور سادگی اختیار کرنے کی تلقین اس سے پہلے بھی مختلف حکومتوں کی طرف سے ہوتی رہی ہے، لیکن موجودہ حکومت کی طرف سے اپیل اس لحاظ سے بطور خاص قابل غور ہے کہ وہ ملک میں اسلامی شریعت کے نفاذ کی داعی ہے۔ اور اس کے متواتر اعلانات کسی سے مخفی نہیں کہ سیاست، معیشت، قانون، غرض ہر شعبۂ زندگی کو اسلامی سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کر رہی ہے، اس سمت میں اس نے کچھ عملی اقدامات بھی کیے ہیں اور وہ ترجیحات کی فہرست میں اس مقصد کو اولین اہمیت دیتی ہے، چنانچہ محترم وزیر خزانہ نے اپنے پیغام میں صراحۃً بھی اس بات کا حوالہ دیا ہے کہ عوام کا ''اسلامی فرض'' ہے کہ وہ سادہ زندگی اختیار کر کے جتنی بچت کر سکتے ہوں، کریں اور قومی بچت کی مختلف اسکیموں میں سرمایہ لگائیں۔

''بچت'' کے بارے میں اسلامی احکام اور تعلیمات پر ایک مقالے کی ضرورت ہے کیونکہ اس کے بارے میں بہت سی غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں لیکن اس وقت یہ موضوع ہمارے پیش نظر نہیں، اس وقت ہم اپنے ملک کے موجودہ حالات کے پس منظر میں اس موضوع پر چند گزارشات پیش کرنا چاہتے ہیں۔

جہاں تک سادہ زندگی اختیار کرنے، فضول خرچی سے بچنے، اور بچت کو قومی کاموں میں لگانے کا تعلق ہے، ان مقاصد سے شاید کسی کو بھی اختلاف نہیں ہوسکتا۔ لیکن اس مسئلے کے کچھ دینی اور عملی پہلو ایسے ہیں کہ ان کی طرف توجہ دیے بغیر یہ مقاصد حاصل نہیں ہو سکتے، اور ان کے بغیر بچت کی اسکیموں میں سرمایہ کاری کی ترغیب کو اسلام کی طرف منسوب کرنا ''لاتقربوا الصلوٰۃ'' کے لطیفے سے کم نہیں۔ آج کی محفل میں ہم انہی پہلوؤں کی طرف توجہ دلانا چاہتے ہیں:

حکومت کی توجہ کے لئے سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ عوام کو سادہ زندگی اور بچت کی تلقین اس وقت تک محض ایک لفظی وعظ کی طرح بے اثر رہے گی جب تک حکومت اپنی معاشی پالیسیوں اور اپنے طرزِ عمل کے ذریعے اس کے لئے مناسب فضا پیدا نہ کرے۔ آج حال یہ ہے کہ عوام جب اونچے درجے کے سرکاری افسروں اور وزراء کے اندازِ زندگی کا مشاہدہ کرتے ہیں تو دور دور سادگی کی کوئی پرچھائیں نظر نہیں آتی، دوسری طرف سامانِ تعیش کے سلسلے میں حکومت کی فراخ دلانہ پالیسیوں کا نتیجہ یہ ہے کہ معاشرے میں تعیشات کے حصول کی دوڑ میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے، اور ملک کی مجموعی فضا ایسی بن گئی ہے کہ جب تک کسی شخص کے گھر میں ٹیلی ویژن، وی سی آر، ریفریجریٹر، ائیر کنڈیشنر اور اس جیسی اشیاء نہ ہوں اس وقت تک وہ اپنے آپ کو پسماندہ اور محروم سمجھتا ہے، اور یہ احساس محرومی اسے ہر جائز و ناجائز طریقے سے پیسہ حاصل کرنے پر آمادہ کرتا ہے۔ چنانچہ ملک کی اکثریت ان لوگوں پر مشتمل ہے جو اپنی روزمرہ کی ضروریات ہی بمشکل پوری کرتے ہیں، اور اگر کچھ بچت کر بھی سکتے ہیں تو

وہ سامانِ تعیش کی اس دوڑ کی نذر ہو جاتی ہے۔ان حالات میں بچت میں اضافہ ہو تو کس طرح ہو؟

دوسرا مسئلہ جس کی طرف ہمیں اس وقت خاص طور توجہ دلانی ہے، یہ ہے کہ آپ کا یہ ارشاد تو بجا ہے کہ سادہ زندگی اختیار کرنا ہمارا اسلامی فریضہ ہے، یہ بات بھی درست ہے کہ ملک کی اقتصادی ترقی کے لئے کوشش کرنا حب الوطنی کا تقاضا ہے، لیکن کیا یہ حکومت کا ''اسلامی فریضہ'' نہیں ہے کہ وہ مسلمانوں کو قومی سرمایہ کاری کے لئے ایسے راستے فراہم کرے جن کے ذریعے وہ سود کی لعنت میں مبتلا ہوئے بغیر اپنی بچت کو ملکی ترقی کے کاموں میں لگا سکیں؟ سوال یہ ہے کہ اگر کوئی شخص اپنے ''اسلامی فریضہ'' پر عمل کرتے ہوئے سادہ زندگی اختیار کرتا ہے اور اپنی بچت کو قومی سرمایہ کاری اسکیموں میں لگانا چاہتا ہے تو اس کے لئے اس کے سوا کیا راستہ ہے کہ وہ حکومت کی جاری کی ہوئی سودی اسکیموں میں حصہ لے اور سود کی لعنت میں ملوث ہو؟ ان حالات میں بچت کی ترغیب اور اس کو سرمایہ کاری میں لگانے کی تلقین بالواسطہ طور پر سودی کاروبار میں حصہ لینے کی تلقین نہیں تو اور کیا ہے؟ اندازہ فرمائیے کہ کیا اس تلقین کو ''اسلامی فریضہ'' کے ساتھ منسلک کرنا بالکل ایسا ہی استدلال نہیں جیسے کسی شخص نے "وانتم سکاری" کو چھوڑ کر صرف "لا تقربوا الصلوۃ" سے یہ استدلال کیا تھا کہ نماز کے قریب پھٹکنا جائز نہیں۔

موجودہ حکومت اس لحاظ سے قابلِ مبارکباد ہے کہ اس نے سود کی حرمت اور اس کی خرابیوں کا نہ صرف برملا اعتراف کیا ہے، بلکہ اپنے اس ارادے کا بھی اظہار کیا ہے کہ وہ ملکی معیشت کو اس نجاست سے پاک کرنا چاہتی ہے، اور اس غرض کیلئے اس نے ملک میں دو ایک غیر سودی مالیاتی ادارے قائم کرنے کا اعلان بھی کیا ہے، جبکہ اس سے پہلے کی حکومتیں سود کی برائی ہی کو تسلیم کرنے سے ہچکچاتی رہی ہیں، بلکہ بعض مرتبہ اس کو حلال طیب ثابت کرنے کی کوششیں کی گئی ہیں، لیکن ان تمام اعلانات کے باوجود اس سمت میں موجودہ حکومت کی طرف سے عملی پیش رفت میں اب تک جس سست رفتاری اور بے اعتنائی کا مظاہرہ ہوا ہے وہ بڑا مایوس کن ہے۔

سب سے پہلے ۱۹۷۹ء میں موجودہ حکومت نے تین مالیاتی اداروں (این آئی ٹی، آئی سی پی میوچل فنڈ اور ہاؤس فنانس کارپوریشن) کو سود سے پاک کرنے کا اعلان کیا تھا۔ اس وقت تصور یہ تھا کہ یہ محض ایک ابتدا ہے، اور اب رفتہ رفتہ ملک کے تمام مالیاتی اداروں کو سود سے پاک کر دیا جائے گا، لیکن آج اس واقعے کو تین سال گزر چکے ہیں، اور اب تک اس سمت میں نہ صرف یہ کہ کوئی پیش رفت نہیں ہوئی بلکہ جن تین اداروں کو سود سے پاک کرنے کا اعلان کیا گیا تھا ان میں سے بعض کے بارے میں اب بھی اس قسم کی خبریں سننے میں آتی رہتی ہیں کہ ان کے کاروبار کا کچھ حصہ اب تک سود میں ملوث ہے۔

اسلامی نظریاتی کونسل کے زیر اہتمام علماء اور ماہرین معیشت و بینکاری کی ایک ممتاز جماعت نے انتہائی عرق ریزی کے بعد غیر سودی بینکاری کا مفصل طریق کار اپنی ایک جامع رپورٹ میں تجویز کر دیا ہے، یہ رپورٹ شائع بھی ہو چکی ہے، لیکن اس واقعے کو بھی تقریباً دو سال ہونے والے ہیں، اور اب تک اس رپورٹ پر کوئی مزید کارروائی نہیں ہوئی۔ اسی دوران حکومت کی طرف سے بینکوں میں ''نفع نقصان کی شرکت کے کھاتے'' کھول کر یہ اعلان کیا گیا کہ ان کے ذریعے تمام بینکوں میں غیر سودی بینکاری کا آغاز کر دیا گیا ہے، لیکن ہم ''البلاغ'' میں تفصیل کے ساتھ بتا چکے ہیں کہ ان کھاتوں کا طریق کار شریعت کے مطابق نہیں ہے، اور اسلامی نظریاتی کونسل کی رپورٹ کے بھی بالکل خلاف ہے جس کا اظہار خود کونسل کے چیئر مین کی طرف سے بھی ہو چکا ہے۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود وہ کھاتے اب تک جوں کے توں کام کر رہے ہیں، انہیں ''غیر سودی بنکاری'' کا نام بھی دیا جا رہا ہے اور اس کے نتیجہ میں لوگ ایک غیر شرعی کاروبار کو شرعی سمجھ کر اس میں مبتلا ہو رہے ہیں بلکہ اس کا ایک نتیجہ یہ بھی ہوا ہے کہ جو ادارے سرکاری طور پر اپنا روپیہ غیر سودی کاروبار میں لگانے کے پابند ہیں، وہ بھی ان کھاتوں سے پرہیز نہیں کرتے، چنانچہ این آئی ٹی اور آئی سی پی کے بارے میں اطلاعات ملی ہیں کہ ان کی رقموں کا ایک حصہ ان کھاتوں میں بھی جمع ہے۔

یہ بھی سننے میں آیا ہے کہ حکومت کو اسلامی نظریاتی کونسل کی تجاویز پر عملی نقطہ نظر سے کچھ اشکالات ہیں، اس لئے ابھی تک ان پر عمل شروع نہیں کیا جا سکا، لیکن اس قسم کے اشکالات کو رفع کرنے کا طریقہ یہ تھا کہ کونسل، وزارت خزانہ، اور متعلقہ اداروں کے ماہرین یکجا بیٹھ کر ان اشکالات پر غور کرتے، اور مل جل کر ان کا کوئی حل نکالتے۔ لیکن کونسل کی رپورٹ شائع ہونے کے بعد سے آج تک اس قسم کی کوئی کوشش منظر عام پر نہیں آئی۔ جب کہ اس واقعے کو اب دو سال ہونے والے ہیں۔

''سود'' جیسے سنگین معاملے میں اس بے اعتنائی اور سہل انگاری کے باوجود محترم وزیر خزانہ کو یہ بات ہرگز زیب نہیں دیتی کہ وہ ''اسلامی فریضہ'' کا حوالہ دے کر عوام کو قومی سرمایہ کاری میں حصہ لینے پر آمادہ کریں۔

سود کی حرمت کے اعتراف اور اس کی خرابیوں کے برملا اظہار کے باوجود اب تک اس سمت میں موثر پیش قدمی نہ ہونے کی بنیادی یہ وجہ معلوم ہوتی ہے کہ اس مقصد کے حصول کے لئے نہ کوئی واضح منصوبہ حکومت کے ذہن میں ہے، اور نہ اس مقصد کی تکمیل ایسے افراد کے حوالے کی گئی ہے جو مقصدیت کے جذبے سے اس کام کو انجام دے سکیں۔ چنانچہ نظر ایسا آتا ہے کہ جن حضرات کے ہاتھ میں حکومت کی مالی اسکیموں کی باگ ڈور ہے، وہ حکومت کے اعلانات کی پیچ بھرنے کے لئے کچھ متفرق

اور سطحی اقدامات کر کے خاموش ہو گئے ہیں، نہ اس سمت میں آگے بڑھنے کا کوئی منصوبہ انہوں نے بنایا ہے، اور نہ کبھی پیچھے مڑکر یہ دیکھنے کی زحمت گوارا کرتے ہیں کہ جن شعبوں کو سود سے پاک رکھنے کا اعلان کیا گیا تھا، وہاں اب عملاً کیا ہو رہا ہے؟

ہم انتہائی دردمندی کے ساتھ حکومت کو متوجہ کرتے ہیں کہ وہ اس معاملے میں اپنے طرزِ عمل پر نظر ثانی کرے۔ اس حکومت نے اپنے آپ کو نفاذِ شریعت کے حوالے سے دنیا میں متعارف کرایا ہے اور بارہا اپنی سیاست و معیشت اور قانون کو اسلامی ڈھانچے میں ڈھالنے کا عہد کیا ہے۔ لہٰذا اس پر یہ فریضہ سب سے زیادہ عائد ہوتا ہے کہ وہ اپنے ان وعدوں کو ایفا کرے۔ یوں بھی اس حکومت نے پاکستان کی تاریخ میں پہلی بار اپنے آپ کو اس بات کا دستوری طور پر پابند کیا ہے کہ وہ تین سال کی مدت کے اندر اندر اپنے مالیاتی قوانین کو سود سے پاک کر دے گی، ان تین سالوں میں سے دو سال اب گزر چکے ہیں اور صرف ایک سال باقی رہ گیا ہے لہٰذا حکومت پر دینی، اخلاقی، دستوری ہر اعتبار سے ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ آئندہ سال کے اندر اندر اپنے تمام مالی قوانین کو سود سے پاک کر دے۔

یہ کام اسی صورت میں ممکن ہے جب وہ اس مقصد کے لئے ایسے افراد منتخب کرے جو معاشی اور مالیاتی امور میں مہارت وبصیرت کے ساتھ اسلامی جذبے سے بھی پوری طرح سرشار ہوں، اور اپنی زندگی کے اہم مقصد کے طور پر ملک کو سود کی لعنت سے نجات دلانے کا تہیہ کیے ہوئے ہوں۔ اگر اسلامی نظریاتی کونسل کی تجاویز میں کوئی عملی اشکال نظر آتا ہو تو علماء اور ماہرین معاشیات کی مدد سے اس کا ایسا حل نکالیں جو شریعت کے مطابق ہو، جن اداروں سے سود ختم کیا جائے ان پر پوری نگرانی رکھیں کہ وہ اپنا کاروبار کس طرح چلا رہے ہیں؟ جب تک اس غرض کے لئے ایسے باہمت، بلند اور مقصدیت سے سرشار افراد اس کام کے لئے منتخب نہ کیے جائیں گے، ہماری معاشی زندگی کا یہ سنگین مسئلہ بدستور کھٹائی میں پڑا رہے گا۔ اور یہ قوم جو پینتیس سال سے پرفریب نعروں اور وعدوں کا شکار رہی ہے موجودہ حکومت کے وعدوں سے بھی مایوس ہو جائے گی، اور جو قوم اپنی حکومت سے مایوس ہو جائے، اس سے ملک کی تعمیر وترقی میں تعاون کی امید رکھنا خود فریبی کے سوا کچھ نہیں۔

اللہ تعالیٰ ہمارے اربابِ اقتدار کو اس حقیقت کا صحیح فہم اور اس پر جرأت مندی کے ساتھ عمل کا حوصلہ عطا فرمائیں، اور انہیں ان وعدوں کی تکمیل کی توفیق بخشیں جن کا ایفاء ان کے وجود کی واحد وجہ جواز ہے۔

وما علینا الا البلاغ

محمد تقی عثمانی

ذکر و فکر

مشارکہ کی نئی اسکیم

حمد وستائش اس ذات کے لئے جس نے اس کارخانہ عالم کو وجود بخشا

اور

درود وسلام اس کے آخری پیغمبر پر جنہوں نے دنیا میں حق کا بول بالا کیا

موجودہ حکومت نے برسراقتدار آنے کے بعد بار بار اپنے اس عزم کا اعلان کیا ہے کہ وہ ملکی نظامِ معیشت کو اسلامی اصولوں کے مطابق استوار کرنا چاہتی ہے۔ اسی سلسلے میں حکومت کی طرف سے اس حقیقت کا بھی برملا اعتراف کیا گیا ہے کہ ہمارے موجودہ نظامِ معیشت کی بنیادی خرابی جو پوری معیشت کو گھن کی طرح چاٹ رہی ہے، سود کی لعنت ہے، اور اس لعنت کا خاتمہ موجودہ حکومت کے اولین مقاصد میں شامل ہے۔

محترم صدر پاکستان جنرل محمد ضیاء الحق صاحب نے ۱۹۷۷ء میں جب اسلامی نظریاتی کونسل کی نئی تشکیل کی تو اس کے افتتاح کے موقع پر انہوں نے کونسل کو بھی ہدایت کی کہ وہ سود کے خاتمے کے لیے ٹھوس طریق کار وضع کرنے کو اولین اہمیت دے۔ چنانچہ اسلامی نظریاتی کونسل نے آج سے دو سال پہلے اس موضوع پر اپنی مفصل رپوٹ پیش کر دی، اور حکومت نے یہ اعلان بھی کر دیا کہ وہ عنقریب بلاسود بینکاری کا آغاز کرنا چاہتی ہے۔

اس اعلان کے بعد ملک کے تمام بینکوں میں ''غیر سودی کھاتوں'' کے نام سے ایک نئی اسکیم جاری کی گئی۔ اگرچہ بیک وقت سودی اور غیر سودی دونوں قسم کے کھاتوں کا باقی رہنا ہماری نظر میں درست نہ تھا، لیکن کچھ نہ ہونے کے مقابلے میں کچھ ہونے کو غنیمت سمجھ کر ہم نے اس اسکیم کا بڑی اُمیدوں کے ساتھ مطالعہ کیا، لیکن یہ دیکھ کر حیرت اور افسوس کی حد نہ رہی کہ اس اسکیم کا بیشتر حصہ جوں کا توں سودی طریق کار پر مشتمل تھا، اور نام کی تبدیلی کے سوا اس میں اور سودی نظام میں کوئی بنیادی فرق نہیں تھا۔

''البلاغ'' کے ان صفحات میں ہم ایک سے زائد بار اس طریق کار پر تنقید کر چکے ہیں، اور دلائل کے ساتھ ثابت کر چکے ہیں کہ یہ طریق کار اسلامی اصولوں سے مطابقت نہیں رکھتا۔

گزشتہ بجٹ کے موقع پر محترم وزیر خزانہ نے ان غیر سودی کھاتوں کے لئے ایک نئی ''مشارکہ

اسکیم'' کا اعلان کیا، اور تاثر یہ ملا کہ اب ان غیر سودی کھاتوں کی رقوم خالصتاً ''شرکت'' کے اصولوں کے مطابق سرمایہ کاری میں لگائی جائیں گی۔ اس مجمل اعلان سے ایک بار پھر یہ امید پیدا ہوئی کہ شاید اب ان غیر سودی کھاتوں کا قبلہ درست ہو جائے اور کم از کم ان کھاتوں کی حد تک سود کی لعنت سے نجات مل جائے۔

ایک مدت تک ہمیں اسی نئی ''مشارکہ اسکیم'' کی تفصیلات مہیا نہ ہوسکیں لیکن اب کچھ عرصے قبل اس کی تفصیلات سامنے آئیں تو ایک بار پھر ان خوشگوار امیدوں پر پانی پھر گیا، اور یہ دیکھ کر بے حد افسوس ہوا کہ ''مشارکہ'' کے معصوم نام سے یہ اسکیم بھی سود ہی کی ایک دوسری صورت ہے، بلکہ بعض حیثیتوں سے سود کی مروجہ شکل سے بھی بدتر!

اس اسکیم کا خلاصہ یہ ہے کہ جس کسی کاروباری ادارے کو بینک سے سرمایہ لینے کی ضرورت ہو، وہ ایک متعین مدت کے لئے اپنا ایک تجارتی پروگرام وضع کر کے بینک کو اس پروگرام میں شرکت کی دعوت دے گا، بینک اگر اس پروگرام کی متوقع کامیابی سے مطمئن ہو تو اس ادارے کو ''نفع ونقصان میں شرکت کی بنیاد'' پر سرمایہ مہیا کرے گا۔ معاہدے کے وقت تخمینی منافع اور اس میں فریقین کا تناسب طے ہو جائے گا، پھر معاہدے کے اختتام پر حقیقی منافع کا حساب کیا جائے گا، اور اس کے مطابق حصہ رسدی نفع تقسیم ہوگا۔

لیکن اگر کاروبار میں نقصان ہوا تو پہلے نقصان کی زد کاروباری ادارے کے مد محفوظ (RESERVE) پر پڑے گی، اس کے بعد بھی اگر نقصان باقی رہے تو بینک کے حصے کے نقصان کی تلافی اس طرح کی جائے گی کہ جتنی رقم کا نقصان ہوا ہے، بینک اس کاروباری ادارے کے اتنی رقم کے حصص کا خود بخود مالک بن جائے گا۔

اس طریق کار میں نفع کی تقسیم کا تو بظاہر درست ہے، لیکن نقصان میں جو طریق کار تجویز کیا گیا ہے وہ واضح طور پر شریعت کے خلاف، اور سود کی بدترین شکل ہے۔

اول تو یہ اصول بالکل غلط ہے کہ نقصان کی پہلی زد اس کاروباری ادارے کے مد محفوظ پر پڑے گی۔ ظاہر ہے کہ اس ادارے کا مد محفوظ بینک کی شرکت میں ہونے والے کاروبار کا جزء نہیں ہے، بلکہ اس ادارے کے سابقہ کاروبار کی بچت ہے۔ لہٰذا اس کی مثال ایسی ہے جیسے الف، ب کے ساتھ شرکت کا معاہدہ کرتے ہوئے یہ شرط عائد کرے کہ اگر مشترک کاروبار میں نقصان ہوا تو پہلے ب اسے ذاتی تجوری میں رکھی ہوئی رقم سے پورا کرے گا۔ اس شرط کے ظالمانہ ہونے میں کس کو تامل ہوسکتا ہے؟

دوسرے بینک کی تلافی کا یہ عجیب وغریب طریق کار اس اسکیم میں طے کیا گیا ہے کہ وہ

نقصان کی رقم کے بقدر اس ادارے کے حصص کا مالک بن جائے گا۔ سوال یہ ہے کہ اگر یہ واقعتاً ''مشارکہ'' ہے تو ایک فریق کے نقصان کی ذمہ داری دوسرے فریق پر عائد کرنے کا کیا مطلب ہے؟ ''سود'' اور ''شرکت'' کے درمیان بنیادی فرق اس کے سوا اور کیا ہے کہ سود میں ایک فرق کے متعین نفع کی ضمانت ہوتی ہے، اور دوسرے فریق کا نفع موہوم ہوتا ہے، جب کہ ''شرکت'' میں دونوں فریق نفع ونقصان کا خطرہ بیک وقت برداشت کرتے ہیں۔

بلکہ زیرنظر اسکیم کا یہ حصہ سود کے مروجہ طریق کار سے زیادہ ظالمانہ استحصال پر مشتمل ہے، اس لئے کہ مروجہ طریق کار میں تو بینک سود کا روپیہ لے کر فارغ ہو جاتا ہے، لیکن زیرنظر اسکیم میں وہ زبردستی اس کاروباری ادارے کا مستقل حصہ بن کر اس کے آئندہ ہونے والے تمام منافع میں ہمیشہ کے لئے دعوے دار بن جائے گا، لہٰذا حقیقت یہ ہے کہ نئی اسکیم بھی سود اور استحصال کی بدترین شکل ہے جسے اسلام کے نام پر رائج کرنا اسلام اور مسلمانوں کے ساتھ شرمناک فریب کے مرادف ہوگا۔

ہم انتہائی دردمندی اور دل سوزی کے ساتھ حکومت سے اپیل کرتے ہیں کہ خدا کے لئے اس قسم کے نیم دلانہ اقدامات سے پرہیز کیجئے، پہلے صرف ایک سودی کاروبار کا گناہ تھا، اس قسم کے اقدامات سے اس گناہ کے علاوہ (معاذ اللہ) اسلام اور مسلمانوں کے ساتھ فریب کا وبال بھی شامل نہ ہو جائے۔ ہم بار بار عرض کر چکے ہیں کہ سود کے خاتمے کے لئے اسلامی نظریاتی کونسل کا وضع کردہ طریق کار آپ کے سامنے موجود ہے، اگر اس طریق کار میں کوئی عملی دشواری نظر آتی ہے تو اسے باہمی افہام وتفہیم کے ذریعے دور کر کے اسے نافذ کیجئے، لیکن جب تک یہ نہیں ہوتا، خدا کے لئے کم از کم اس بدترین سودی طریق کار سے ''غیر سودی طریق کار'' کا لیبل اتار دیجئے، ورنہ اسلام کے نام سے خالص غیر اسلامی کاروبار جاری کرنے کا نتیجہ دنیا اور آخرت دونوں میں برا ہے۔

ہم بحیثیت مجموعی دینی اعتبار سے صدر پاکستان جنرل ضیاء الحق صاحب کے عہد حکومت کو پچھلی حکومتوں کے مقابلے میں بسا غنیمت سمجھتے ہیں، اور اسی لئے پورے اخلاص، خیر خواہی اور ہمدردی کے ساتھ ان کی کامیابی کے لئے دعا گو بھی ہیں اور حتی المقدور تعاون سے بھی گریز نہیں کرتے۔ لیکن ان کے عہد حکومت میں اس قسم کے اقدامات انتہائی افسوسناک اور تکلیف دہ معلوم ہوتے ہیں، اور ان سے حکومت کے خلاف شکوک وشبہات کو بھی تقویت ملتی ہے۔ ہماری دلی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ موجودہ حکومت کو اس قسم کے افسوس ناک اقدامات سے پاک کردے، اسے نفاذِ شریعت کی صحیح فہم، اس کے لئے صحیح طریق کار اختیار کرنے کی توفیق اور اس راستے کی رکاوٹوں کا ڈٹ کر مقابلہ کرنے کا حوصلہ عطا فرمائے۔ آمین

محمد تقی عثمانی ۱۸ جمادی الثانیہ ۱۴۰۳ھ

کاروبار کی مختلف اقسام (بہ لحاظ ملکیت)

(Different Kinds of Business)

کاروبار کی مختلف اقسام (بہ لحاظ ملکیت)

(Different Kinds of Business)

اشتراکی نظام میں چونکہ سارا نظام حکومتی پالیسی کے تحت چلتا ہے، اس لئے اس میں انفرادی اور ذاتی نوعیت کے کاروبار کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ لہٰذا کاروبار کی اقسام پر یہ گفتگو سرمایہ دارانہ نظام پر مبنی ہے۔

ملکیت کے لحاظ سے کاروبار کی تین قسمیں ہیں

۱۔ شخصی کاروبار...... (Private Proprietorship)

۲۔ شرکت...... (Partnership.)

۳۔ کمپنی...... (Joint Stock Company)

پہلی دو قسموں کا کاروبار اس وقت سے جاری ہے، جب سے انسان کاروبار کر رہا ہے۔ فقہاء نے بھی ان کی تفصیلات اور ان کے احکام ذکر کیے ہیں، اور ان کی موجودہ صورتحال ماضی سے بنیادی طور پر مختلف نہیں، اس لئے یہاں ان کی تفصیلات کا ذکر نہیں ہوگا، البتہ ''کمپنی'' کاروبار کی ایک نئی قسم ہے جس کا پہلے فقہاء کے دور میں وجود نہ تھا، اس لئے یہاں اس کی تفصیلات ذکر کرنے کی ضرورت ہے۔

کمپنی کا تعارف

کمپنی کے لغوی معنی ''شرکت'' ہیں اور کبھی ''رفقائے کار'' کو بھی کہا جاتا ہے، بعض دوکانوں کے نام میں ''فلاں اینڈ کمپنی'' لکھا ہوا ہوتا ہے، اس سے یہ لغوی معنی ہی مراد ہوتے ہیں جس کو عربی میں "فلان و شرکاہ" سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس سے وہ معاشی اور اصطلاحی معنی مراد نہیں ہوتے جس کا یہاں تعارف کرایا جارہا ہے۔ لیکن جب ''اینڈ'' کے لفظ کے بغیر کسی ادارے کے نام میں کمپنی کا لفظ ہو مثلاً ''تاج کمپنی'' تو اس سے مراد اصطلاحی کمپنی ہوتی ہے، اور عموماً اس کے ساتھ لمیٹڈ کا لفظ بھی ہوتا ہے جس کی تشریح آگے آئے گی۔

یورپ میں صنعتی انقلاب رونما ہونے کے بعد سترہویں صدی کے آغاز میں بڑے بڑے

کارخانوں وغیرہ کے قائم کرنے کے لئے جب عظیم سرمایہ کی ضرورت پڑنے لگی جس کو کوئی شخص اکیلا یا چند افراد مل کر فراہم نہیں کر سکتے تھے تو اس وقت عام لوگوں کی منتشر بچتیں یکجا کر کے ان سے اجتماعی فائدہ اٹھانے کے لئے کمپنی کا نظام رائج ہوا۔ اس نظام کی سب سے پہلی خصوصیت یہ ہے کہ شرکت میں ہر شریک کی الگ الگ ملکیت متصور ہوتی ہے۔ مگر اس نظام میں کئی افراد کے مجموعے کو ایک شخص قانونی قرار دیا جاتا ہے۔ جس کی وضاحت انشاء اللہ آگے آئے گی۔ اس شخصِ قانونی کو ''کارپوریشن'' کہتے ہیں جس کی ایک قسم کمپنی ہے۔

ابتداءً کمپنیاں عموماً نیم سرکاری ہوتی تھیں، عموماً حکومت کے چارٹر (اجازت نامے) کے تحت غیر ملکی تجارت کے لئے وجود میں آتی تھیں اور انہیں بہت وسیع اختیارات دیئے جاتے تھے۔ بسا اوقات ان کو قوانینِ تجارت وضع کرنے کا بھی اختیار ہوتا تھا، سکہ ڈھالنے اور فوج اور پولیس رکھنے کا بھی اختیار ہوتا تھا۔ برصغیر پر قابض ہونے والی ''ایسٹ انڈیا کمپنی'' بھی اسی قسم کی ایک کمپنی تھی۔ اب وسیع اختیارات کے ساتھ ایسی ریاستی کمپنیاں موجود نہیں رہیں، اب صرف تجارتی کمپنیاں ہوتی ہیں جو حکومت کی اجازت سے قائم ہوتی ہیں کمپنیوں کی تشکیل کی اجازت اور ان کو کنٹرول کرنے کا کام جو ادارہ کرتا ہے اس کو ہمارے ملک میں (Corporate Law Authority) (کارپوریٹ لاء اتھارٹی) کہا جاتا ہے۔ یہ وزارت خزانہ کا ذیلی ادارہ ہے۔

کمپنی کی تشکیل

سب سے پہلے ابتدائی مرحلے میں ماہرین کے مشورے سے ایک رپورٹ تیار کی جاتی ہے۔ جس میں یہ طے کیا جاتا ہے کہ جو کاروبار شروع کرنا ہے اس کے امکانات کس حد تک ہیں؟ اس کے لئے وسائل اور سرمایہ کتنا درکار ہوگا؟ تجارتی لحاظ سے یہ کاروبار کس حد تک نفع بخش ہے؟ یہ رپورٹ مختلف شعبوں کے ماہرین سے تیار کرائی جاتی ہے، اس کو ''تقریر الامکانیات'' (Feasibility Report) کہتے ہیں۔

پھر کمپنی کا اجمالی ڈھانچہ تیار کیا جاتا ہے، جس میں کمپنی کا نام، کاروبار کی نوعیت، مطلوبہ سرمایہ، ڈائریکٹرز، آئندہ کے لئے عزل و نصب کا طریقہ کار وغیرہ لکھا جاتا ہے، اس کو ''تذکرہ'' (Memorandum) کہتے ہیں۔

پھر کمپنی کے ضوابط لکھے جاتے ہیں جس کو عربی میں نظام الجمعیة یا لائحة الجمعیة اور انگریزی میں (Articles of Association) کہتے ہیں۔

میمورنڈم (مذکرہ) اور آرٹیکلز آف ایسوسی ایشن کے ساتھ حکومت کو کمپنی کی اجازت کے لئے درخواست دے دی جاتی ہے۔ جب وزارت خزانہ کے ذیلی ادارہ Corporate Law) (Authority (کارپوریٹ لاء اتھارٹی) کی طرف سے اجازت مل گئی تو اب کمپنی وجود میں آچکی ہے۔ اور قانون اب اس کو ایک فرضی شخص قرار دیتا ہے جو بیع وشراء کرے گا، مدعی ومدعی علیہ بنے گا، دائن ومدیون ہوگا۔

اس کو "شخص قانونی" (Legal person) یا (Juristic Person) یا (Juridicial Person) کہتے ہیں۔ بعض مرتبہ اس کو فرضی شخص (Fictitious Person) بھی کہا جاتا ہے۔

جب کمپنی وجود میں آگئی تو اب لوگوں کو حصہ دار بننے کی دعوت دینے کے لئے قانوناً ضروری ہے کہ کمپنی کا پورا طریق کار اور اسکا ترکیبی ڈھانچہ شائع کرایا جائے تاکہ عوام کو بھی اس کمپنی پر اعتماد ہو سکے۔ لوگوں کو کمپنی کے بنیادی طریق کار اور متعلقہ امور سے واقف کرنے کے لئے جو تحریری بیان شائع کیا جاتا ہے، اس کو عربی میں "نشرۃ الاصدار" اور انگریزی اور اردو میں پراسپکٹس (Prospectus) کہتے ہیں۔

کمپنی کا سرمایہ

حکومت جب کمپنی کو اجازت دیتی ہے تو سرمائے کی تحدید کرتی ہے کہ اتنے سرمائے کے حصے جاری کیے جا سکتے ہیں یا اتنے سرمائے میں لوگوں کو شرکت کی دعوت دی جا سکتی ہے اس کو "منظور شدہ سرمایہ" "راس المال المسموح" یا "راس المال المصرح بہ" (Authorised Capital) کہتے ہیں۔

اس میں سے سرمائے کی کچھ مقدار مقرر کردی جاتی ہے جو کمپنی جاری کرنے والوں کی طرف سے شامل کیا جائے گا، اس کو (Sponsors Capital) کہتے ہیں۔ پھر حصص جاری کرنے کے بعد عوام یا کمپنی قائم کرنے والوں نے جتنے سرمائے کے حصص لینے کا وعدہ کیا، اس کو "اشتراک شدہ سرمایہ" (Subscribed Capital) کہا جاتا ہے۔ پھر جن لوگوں نے کمپنی میں اشتراک (Subscription) کرلیا ہو اور سرمایہ کی ادائیگی ذمے لے لی ہو، ان سے سرمایہ فوری طور پر یکمشت شامل کرنا ضروری نہیں ہوتا، کبھی تدریجاً بھی ادا کرتے رہتے ہیں۔ سرمائے کا جتنا حصہ ادا کر دیا گیا ہو، اس کو "اداشدہ سرمایہ" "راس المال المدفوع" (Paid Up Capital) کہتے ہیں۔

کمپنی جس سرمائے کے شیئرز جاری کر کے لوگوں کو حصے لینے کی دعوت دے، اس سرمائے کو

''جاری کردہ سرمایہ'' راس المال المعروض" (Issued Capital) کہتے ہیں۔

لوگ فارم پُر کر کے جتنے سرمائے کے حصے خریدنے کا وعدہ کرلیں اس کو ''اشتراک کردہ سرمایہ'' راس المال المساهم" یا" راس المال المکتب" (Subscribed Capital) کہتے ہیں۔

مثلاً کمپنی کو ۱۰۰ ملین روپے سے کاروبار کی اجازت ملی تو ۱۰۰ ملین روپے ''منظور شدہ سرمایہ'' ہے، اس میں ۲۰ ملین کمپنی قائم کرنے والوں کے ذمے ہے، جس میں سے ۱۰ ملین روپے انہوں نے دیدیئے۔ یہ سپانسرز کیپٹل کا ''اداشدہ سرمایہ'' ہے، ۸۰ ملین عوام سے وصول کرنا ہے، جس میں سے فی الحال ۶۰ ملین روپے کے حصے جاری کیے جاتے ہیں، باقی آئندہ کی کسی ضرورت کے لیے محفوظ رکھ لیے گئے ہیں۔ یہ ۶۰ ملین روپے'' جاری کردہ سرمایہ'' ہے۔ ۶۰ ملین روپے میں سے لوگوں نے ۵۰ ملین روپے کے لئے فارم جمع کرادیے تو یہ ''اشتراک کردہ سرمایہ'' ہے۔

اگر درخواستیں زیادہ ہوں اور جاری کردہ سرمایہ کم ہو تو قرعہ اندازی کی جاتی ہے اور صرف انہی کی درخواستیں قبول کر کے انہیں حصہ دار بنایا جاتا ہے جن کا نام قرعہ میں نکل آئے۔ یہ اندیشہ بھی ہوتا ہے کہ درخواستیں سرمائے سے کم وصول ہوں۔ جتنے شیئرز جاری کیے گئے تھے لوگوں نے اتنے شیئرز نہیں لیے تو اس سے نمٹنے کے لئے بینک یا دوسرے مالیاتی اداروں سے اس بات کی ضمانت لی جاتی ہے کہ جو حصے لوگوں نے نہ لیے وہ ہم لے لیں گے۔ اس ضمانت کو''ضمان الاکتاب" (Under Writing) کہتے ہیں۔

بینک اس ضمانت پر کمپنی سے کمیشن کی شرح طے کرتا ہے۔ مثلاً اس ضمانت پر کہ کل سرمایہ کا ایک فیصد میں لوں گا۔ یہ کمیشن بینک بہر حال لیتا ہے چاہے اس کو کمپنی کے حصص (شیئرز) لینے پڑیں یا نہ لینے پڑیں۔ پھر اگر بینک کو حصے لینے پڑ جائیں تو حصے لے کر عموماً بینک اپنے پاس نہیں رکھتا، بلکہ بعد میں ان حصص کو فروخت کر دیتا ہے۔

یہ ضمانت ایک بینک سے بھی لی جاتی ہے اور تھوڑے تھوڑے سرمائے پر کئی بینکوں سے بھی لی جاسکتی ہے۔

کمپنی کے حصص (شیئرز)

جب لوگ کمپنی کے حصے لے کر سرمایہ دیدیتے ہیں، تو حصہ دار کو کمپنی ایک سرٹیفکیٹ جاری کرتی ہے جو اس بات کی سند ہوتی ہے کہ اس شخص کا کمپنی میں اتنا حصہ ہے۔ اس سرٹیفکیٹ کو اردو میں

''حصہ'' عربی میں ''سہم'' اور انگریزی میں (Share) کہتے ہیں۔

کاروبار جتنے سرمائے سے جاری کیا جاتا ہے اس سرمائے کو اکائیوں پر تقسیم کر کے ایک اکائی کو حصے (Share) کی قیمت قرار دی جاتی ہے۔ مثلاً آج کل عموماً دس، دس روپے کے شیئرز جاری کیے جاتے ہیں۔ یہ قیمت شیئرز کے اوپر لکھ دی جاتی ہے۔ یہ وہ رقم ہے جسکی ادائیگی پر یہ سرٹیفکیٹ جاری ہوا تھا۔ اس قیمت کو عربی میں "القیمته الاسمیته" اور انگریزی میں (Face Value) یا (Par Value) کہتے ہیں۔

شیئرز جاری کرنے کے دو طریقے ہیں۔ کبھی شیئرز پر حصہ دار کا نام درج ہوتا ہے اس کو ''السهم المسجل'' (Registered Share) کہتے ہیں، کبھی شیئرز اس طرح جاری ہوتے ہیں کہ اس پر کسی کا نام درج نہیں ہوتا، جس کے ہاتھ میں ہوگا وہی اس کا مالک سمجھا جائے گا۔ اس کو "السهم الحامله" (Bearer Share) کہتے ہیں۔

ہمارے ہاں زیادہ تر کمپنیوں کے حصص رجسٹرڈ ہی ہوتے ہیں۔ کبھی بیئرر بھی ہوتے ہیں جیسے این، آئی، ٹی میں دونوں صورتیں ہیں۔

حصص کی ایک تقسیم حصہ دار کے حقوق کے اعتبار سے ہوتی ہے۔ یعنی نفع وصول کرنے یا کمپنی کی پالیسی میں مداخلت کے اعتبار سے بھی حصص کی دو قسمیں ہیں۔

۱۔ السهم العادی (Ordinary Share)

۲۔ السهم الممتاز (Preference Share) جس کو ''ترجیحی حصص'' بھی کہتے ہیں۔

ان دو قسم کے حصص میں بنیادی فرق یہ ہے کہ ''السهم الممتاز'' کے حامل کو نفع تقسیم کرنے یا حق رائے دہی میں ''السهم العادی'' کے حامل سے مقدم رکھا جاتا ہے۔ "السهم الممتاز" کی ترجیح کی کئی صورتیں ہوتی ہیں۔

۱۔ ''السهم الممتاز'' کا نفع اس کے لگائے ہوئے سرمائے کی خاص شرح کے مطابق مقرر ہوتا ہے۔ مثلاً اس کے لگائے ہوئے سرمائے کا دس فیصد (۱۰%) پہلے ''السهم الممتاز'' کے حاملین میں نفع تقسیم کر کے انکا معینہ نفع ان تک پہنچایا جاتا ہے۔ اس کے بعد اگر کچھ بچے تو ''السهم العادی'' کے حاملین کو ملتا ہے، ورنہ وہ نفع سے محروم رہیں گے۔

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ کسی سال کمپنی کو نفع نہیں ہوا تو ایسی صورت میں بھی ''السهم الممتاز'' کا نفع محفوظ رہتا ہے، آئندہ سال جب نفع ہوگا تو پہلے ان کو دیا جائے گا، اس کے بعد نفع بچا تو ''السهم العادی'' کو ملے گا۔

۲۔ بعض اوقات ترجیح کی صورت یہ ہوتی ہے کہ "السهم الممتاز" کے نفع کی شرح "السهم العادی" سے زیادہ رکھی جاتی ہے۔

۳۔ کبھی ترجیح اس طرح ہوتی ہے کہ کمپنی کے سالانہ اجلاس میں "السهم الممتاز" والوں کو ووٹ کا حق ہوتا ہے۔ "السهم العادی" والے کو ووٹ کا حق نہیں ہوتا۔

۴۔ کبھی "السهم الممتاز" والے کو زیادہ ووٹ کا حق ہوتا ہے اور "السهم العادی" کو کم ووٹ کا۔ مثلاً یہ کہ "السهم الممتاز" والے کو دو ووٹ کا اور "السهم العادی" والے کو ایک ووٹ کا حق ہوگا۔

حاصل یہ کہ "السهم الممتاز" ترجیحی حصے کا نام ہے۔ پھر ترجیح کی شکلیں مختلف ہو سکتی ہیں۔ اس کی ضرورت عموماً اس وقت پیش آتی ہے، جب کہ کسی خاص بڑی پارٹی (مثلاً انشورنس کمپنی وغیرہ) سے سرمایہ لینا ہو۔ اب وہ اس پر آمادہ نہیں کہ عام حصہ دار (شیئر ہولڈر) کی حیثیت سے رقم لگائے، اس لئے کہ اس میں نفع طے شدہ نہیں۔ اور اس پر بھی آمادہ نہیں کہ محض قرض دہندہ (دائن) کی طرح سود پر قرض دے، اس لئے کہ محض قرض دہندہ کی حیثیت میں وہ کمپنی کی پالیسی پر اثر انداز نہیں ہو سکے گی۔ ایسی پارٹی سے سرمایہ لینے کے لئے اس کو ترجیحی حصص دیے جاتے ہیں، تاکہ اس کو مقررہ نفع بھی ملے اور کمپنی میں حصہ دار بھی ہو۔ چنانچہ یہ ایک اعتبار سے دائن اور ایک اعتبار سے حصہ دار ہوتی ہے۔

کمپنی کا انتظامی ڈھانچہ

کمپنی ایک قانونی شخص ہے جو وجود میں آنے کے بعد کاروبار کرے گا، مگر چونکہ یہ حقیقی شخص نہیں، لہٰذا اس قانونی شخص کی نمائندگی کے لئے حصہ داروں میں سے ہی چند افراد پر مشتمل ایک مجلس بنائی جاتی ہے جو کاروبار کرتی ہے۔ اس کو "مجلس الادارہ" (Board of Directors) کہتے ہیں۔

اس کا انتخاب تمام شیئرز ہولڈرز کی ووٹنگ سے ہوتا ہے۔ پھر یہ بورڈ آف ڈائریکٹرز اپنے میں سے ایک کو سربراہ ادارہ منتخب کرتا ہے۔ اس کو "العضو المنتدب" (Chief Eecutive) کہتے ہیں۔

یہ چیف ایگزیکٹو بورڈ آف ڈائریکٹرز میں سے بھی ہو سکتا ہے، اور باہر سے بھی کسی کو ملازم رکھا جا سکتا ہے۔ یہ بورڈ کی پالیسی کے ماتحت عملاً کام کرتا ہے۔

تمام شیئرز ہولڈرز کا ایک سالانہ اجتماع ہوتا ہے جس کو "ا لجمعية العمومية ا لسنوية"

(Annual General Meeting) کہتے ہیں۔اسی کا مخفف نام اے، جی، ایم (A.G.M) ہے۔اس میں کاروبار کی پالیسی، اکاؤنٹس (حسابات) اور آڈٹ رپورٹ وغیرہ پیش کی جاتی ہیں۔آئندہ کے لئے ڈائریکٹران کا انتخاب ہوتا ہے۔ ہر حصے کا ایک ووٹ ہوتا ہے، مثلاً کسی کے پاس دس شیئرز ہیں تو اس کے دس ووٹ ہوں گے۔سالانہ اجتماع میں ووٹ دینے کے بعد شیئر ہولڈرز کا کمپنی کے کاروبار میں کوئی عمل دخل نہیں ہوتا ہے۔

کمپنی کے وجود میں آجانے کے بعد ختم ہونے کی دو ہی صورتیں ہیں۔یا تو اے، جی، ایم میں کمپنی کے تحلیل ہونے کا فیصلہ ہو جائے یا کمپنی دیوالیہ ہو جائے اور اس کے دیون اثاثوں سے بڑھ جائیں۔ان دونوں صورتوں میں متعلقہ قانونی ادارے سے کمپنی ختم کرنے کی اجازت لینا ضروری ہے، قانونی اجازت لیے بغیر کمپنی کا وجود ختم نہیں کیا جا سکتا۔اور عموماً ایسی صورت میں حکومت کی طرف سے کمپنی کے اثاثوں کو قرض خواہوں یا حصہ داروں میں تقسیم کرنے کے لئے ایک منتظم مقرر کیا جاتا ہے جسے ''ریسیور'' (Receiver) یا تحلیل کنندہ (Liquidator) کہتے ہیں۔

منافع کی تقسیم

کمپنی سال بھر کاروبار کرنے کے بعد سالانہ نفع کا حساب لگاتی ہے اور یہ طے کرتی ہے کہ کتنا نفع ہوا؟ اس کے منافع کا کچھ حصہ بطور احتیاط کے محفوظ کر لیتی ہے، تا کہ آئندہ کمپنی کو کوئی نقصان ہو تو اس سے اس کا تدارک کیا جا سکے اس کو عربی میں ''احتیاطی'' اور انگریزی میں Reserve کہتے ہیں۔ اس احتیاطی نفع کا تعین عموماً بورڈ آف ڈائریکٹرز کرتا ہے۔اور قانوناً بھی اس کی تحدید ہوتی ہے، اس لئے کہ احتیاطی نفع منہا کر کے باقی نفع پر ٹیکس لگتا ہے، خطرہ ہے کہ ٹیکس سے بچاؤ کے لئے کوئی کمپنی زیادہ نفع احتیاطی میں رکھ لے، اس لئے قانوناً بھی اس کی تحدید ہوتی ہے۔

احتیاطی نکالنے کے بعد بقیہ نفع شیئر ہولڈرز میں تقسیم ہوتا ہے۔اب کمپنی کو جو دراصل نفع ہوا ہے وہ ''الربح'' ''نفع'' (Profit) ہے اور جو بطور احتیاط رکھا گیا ہے وہ ''احتیاطی'' یا محفوظ فنڈ (Reserve) ہے باقی نفع جو تقسیم ہوگا وہ ''الربح الموزع'' (Dividend) ہے۔ پرافٹ Profit اور Dividend ڈیویڈنڈ میں فرق یہ ہے کہ کل نفع پرافٹ ہے اور احتیاطی نکالنے کے بعد جو تقسیم ہوگا وہ ڈیویڈنڈ ہے، پرافٹ شخص قانونی کمپنی کا نفع ہے اور ڈیویڈنڈ شیئر ہولڈرز کا۔

(Dividend) کی تقسیم کے دو طریقے ہوتے ہیں۔کبھی تو نقد نفع لوگوں کو فراہم کر دیا جاتا ہے، کبھی اس نفع کے دوبارہ حصص (شیئرز) جاری کر دیئے جاتے ہیں۔اس قسم کے حصے کو ''بونس شیئر''

(Bonus Share) کہتے ہیں۔ بونس شیئر جاری کرنے سے کمپنی کا سرمایہ بڑھ جاتا ہے۔ ایسا عموماً اس وقت ہوتا ہے، جب کہ کمپنی کی کیش پوزیشن کمزور ہو، یعنی اس کے پاس نقد رقم کم ہوتو بجائے نفع دینے کے مزید حصص جاری کر دیے جاتے ہیں۔ کسی حصہ دار کو مثلاً دس روپے دینے کے بجائے دس روپے کا حصہ دے دیا جاتا ہے۔ لیکن اس کے لئے یہ ضروری ہوگا کہ ''منظور شدہ سرمایہ'' میں اس کی گنجائش ہو۔ مثلاً ۸۰ ملین کی اجازت ملی تھی، ان میں ابھی تک ۶۰ ملین جاری کیے تھے، ۲۰ ملین کی گنجائش ہے، اگر منظور شدہ سرمائے میں مزید گنجائش نہیں ہے تو درخواست دے کر اجازت لی جائے گی ــــــ بونس شیئرز جاری کرنے کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ اس کمپنی کے شیئرز کی بازاری قیمت (Market Value) قیمته اسمیته (Face Value) سے کم نہ ہو۔ اگر بازار میں قیمت گر گئی ہے تو اب بونس شیئرز جاری کرنے میں حصہ داران (شیئر ہولڈرز) کا نقصان ہے۔ مثلاً دس روپے کے شیئر کی قیمت بازار میں ۹ روپے ہے تو حصہ دار کو دس روپے کی بجائے ۹ روپے کا شیئر ملے گا تو اس کو ایک روپیہ کا نقصان ہوا۔

''لمیٹڈ'' کمپنی کا تصور

لمیٹڈ کمپنی کو ''الشركة المحدودة'' کہتے ہیں۔ اس سے مراد مسئولية (Liability) یعنی ذمہ داری کا محدود ہونا ہے۔ لمیٹڈ کمپنی کے حاملانِ حصص کی ذمہ داری ان کے لگائے ہوئے سرمائے کی حد تک محدود ہوتی ہے۔ یعنی اگر کمپنی خسارے میں گئی تو ان کا زیادہ سے زیادہ نقصان یہ ہوگا کہ ان کا لگایا ہوا سرمایہ ڈوب جائے گا۔ اگر کمپنی پر قرض زیادہ ہوگیا تو حاملانِ حصص سے ان کے لگائے ہوئے سرمائے سے زیادہ کا مطالبہ نہیں ہوگا۔ اسی طرح کمپنی کی ذمہ داری بھی اس کے اثاثوں کی حد تک محدود ہوگی۔ قرضے ادا کرنے کے لئے زیادہ سے زیادہ کمپنی کے اثاثے قرقی کرائے جاسکتے ہیں اثاثوں سے زیادہ مطالبہ نہیں ہوگا۔ اسی لئے ''لمیٹڈ'' لکھنا ضروری ہے تاکہ قرض دینے والا اس بات کو ملحوظ رکھتے ہوئے دے کہ اس مدیون کی ذمہ داری محدود ہوگی۔

عام طور پر تو کمپنیاں ہی لمیٹڈ ہوتی ہیں، لیکن شرکت (PartnerShip) بھی لمیٹڈ ہوتی ہے۔

پرائیویٹ کمپنی

کمپنی کی دو قسمیں ہیں (۱) پبلک کمپنی (شركة عاملة) (۲) پرائیویٹ کمپنی (شركة

خاصہ)، اب تک جو تفصیلات ذکر کی گئی ہیں وہ ''پبلک کمپنی'' کی ہیں۔ پرائیویٹ کمپنی بھی ایک شخص قانونی ہوتا ہے، مگر اس کے شرکاء کی تعداد محدود ہوتی ہے، (مثلاً ہمارے یہاں کم از کم ۲ اور زیادہ سے زیادہ ۵۰ شرکاء ہو سکتے ہیں) یہاں سرمائے کے حصص جاری نہیں کیے جاتے ہیں، پراسپکٹس نہیں شائع کیا جاتا ہے، اس کے شیئرز بازارِ حصص (اسٹاک ایکسچینج) میں فروخت نہیں ہوتے ہیں ـــــ قانونی تقاضا ہے کہ پرائیویٹ کمپنی کے ساتھ پرائیویٹ لکھنا ضروری ہوتا ہے۔

شرکت اور کمپنی میں فرق

شرکت (Partner Ship) کو عربی میں ''الشرکة'' (بکسر الشین و سکون الراء) یا ''شرکة الاشخاص'' کہتے ہیں۔ اور کمپنی کو شرکة المساهمة (بفتح الشین و کسر الراء) کہتے ہیں۔ شرکت اور کمپنی میں کئی امتیازی فرق ہیں۔

۱۔ شرکت میں ہر شخص کاروبار کے تمام اثاثوں کا مشاع طور پر مالک ہوتا ہے۔ ہر شریک دوسرے شریک کا وکیل ہوتا ہے، ہر شخص کی ذمہ داری یکساں ہوتی ہے، مثلاً کوئی دین واجب ہوا تو تمام شرکاء سے برابر درجے میں مسئولیت ہوگی، مگر کمپنی میں ایسا نہیں ہوتا۔ کمپنی ایک ''شخص قانونی'' ہے اس کا الگ وجود ہے اور حصہ داران کا الگ وجود ہے، حاملینِ حصص اس حد تک تو کمپنی کے اثاثوں میں شریک ہیں کہ اگر کمپنی تحلیل ہو اور اس کے اثاثے تقسیم ہوں تو ان کو متناسب حصے ملیں گے، لیکن کمپنی کی تحلیل سے پہلے قانون، حاملِ حصص کا یہ حق تسلیم نہیں کرتا کہ وہ کمپنی کے اثاثوں میں تصرف کر سکے۔ یہی وجہ ہے کہ اگر کوئی حاملِ حصص مدیون ہو اور اس کے اثاثے قرق کیے جائیں تو جو شیئرز اس کے ہاتھ میں ہیں وہ تو قرق ہوں گے، مگر اس کے شیئر کے تناسب سے کمپنی کے اثاثوں پر اس کو تصرف کا حق نہیں ہے۔

۲۔ شرکت میں کاروبار کی طرف سے کسی پر دعویٰ ہو یا کسی کی طرف سے کاروبار پر دعویٰ ہو تو تمام شرکاء مدعی یا مدعیٰ علیہ ہوں گے۔ مگر کمپنی خود ایک شخص قانونی ہے، لہٰذا کمپنی خود ہی مدعی یا مدعیٰ علیہ ہوگی، حاملینِ حصص (شیئر ہولڈرز) نہیں ہوں گے۔ اس شخص قانونی کی نمائندگی عدالت میں انتظامیہ کا کوئی فرد کریگا۔

۳۔ شرکت کا الگ سے کوئی قانونی وجود نہیں ہوتا، کمپنی کا الگ سے قانونی وجود ہوتا ہے، جس کو ''شخص قانونی'' کہتے ہیں۔

۴۔ شرکت میں کوئی شریک شرکت فسخ کر کے اپنا سرمایہ نکالنا چاہے تو نکال سکتا ہے، مگر کمپنی میں

سے اپنا سرمایہ نہیں نکالا جا سکتا، البتہ شیئرز فروخت کیے جا سکتے ہیں۔

۵۔ شرکت میں عموماً ذمہ داری کاروبار کے اثاثوں تک محدود نہیں ہوتی، کمپنیوں میں ذمہ داری محدود ہوتی ہے۔

کمپنی کے لئے فنڈ کی فراہمی

کمپنی میں ابتداءً کچھ سرمایہ (Sponsers) یعنی کمپنی بنانے والوں کی طرف سے ہوتا ہے، سرمائے کا بہت سا حصہ اجرائے حصص کے ذریعے عوام سے حاصل کیا جاتا ہے، مگر عموماً یہ سرمایہ کمپنی کے لئے کافی نہیں ہوتا، وقتاً فوقتاً مزید سرمایہ حاصل کرنے کی ضرورت بھی پیش آتی رہتی ہے۔اس کے لئے مختلف طریقے اختیار کیے جاتے ہیں۔

الف۔ کبھی مزید سرمایہ حاصل کرنے کے لئے کمپنی مزید حصص جاری کرتی ہے۔ جب کہ منظور شدہ (Authorised) سرمایہ میں اس کی گنجائش ہو یا دوبارہ اجازت لی جائے۔ یہ حصص جواب جاری کیے گئے ہیں، ان میں قدیم حصہ داران (شیئر ہولڈرز) کا ترجیحی حق ہوتا ہے کہ اگر وہ نئے حصص لینا چاہیں تو لے لیں۔جن نئے حصص میں پرانے حصہ داروں کو ترجیحی حق ہوتا ہے انکو "سهام الا ولوية" (Right Shares) کہتے ہیں۔

یہ حق شفعہ سے ملتا جلتا ہے۔اس کے قدیم حصہ داران کو دو فائدے ہوتے ہیں۔(الف) عموماً کمپنی کا کاروبار شروع ہونے کے بعد شیئر کی بازاری قیمت (Market Value) لکھی ہوئی قیمت (Face Value) سے زیادہ ہوتی ہے۔اس لئے ان کے خریدنے میں نفع ہوتا ہے۔اس نفع کے لینے کا حق پہلے قدیم حصہ داران کو دیا جاتا ہے، مثلاً لکھی ہوئی قیمت ۱۰ روپے اور بازاری قیمت ۲۰ روپے ہے تو شیئر دس روپے میں ملے گا مگر فروخت ہوگا ۲۰ روپے میں، لہٰذا شیئر لینے والے کو دس روپے کا نفع ہوگا۔(ب) دوسرا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ مزید سرمائے کے حصص جاری کرنے سے حصہ داران کی شرکت کی نسبت میں کمی آجاتی ہے۔ان کو اپنی نسبت بحال کرنے کے لیے نئے شیئرز خریدنے کا ترجیحی حق دیا جاتا ہے مثلاً کمپنی میں پہلے ایک لاکھ روپے کا سرمایہ لگا ہوا تھا، جس میں سے کسی نے دو ہزار روپے کے شیئرز لئے تھے تو اس کی شرکت کی نسبت دو فیصد ہے، اب جب کمپنی ایک لاکھ کے مزید حصص جاری کرے گی تو اب کمپنی کا سرمایہ دو لاکھ ہو گیا۔۲ ہزار کی نسبت ۲ لاکھ سے ۱٪ فیصد رہ جائے گی۔اس لئے اس کو حق دیا گیا ہے کہ مزید دو ہزار کے شیئرز لے کر دوبارہ نسبت دو فیصد کر لے۔

۲۔ مزید حصص جاری کرنے میں کچھ مشکلات بھی ہوتی ہیں، مثلاً سرمائے کی منظوری کی حدود قیود

ہوتی ہیں، حصہ داران میں اضافہ ہو جاتا ہے اور ان کا کمپنی پر کنٹرول ہوتا ہے۔اس جیسی مشکلات کی وجہ سے کمپنیاں مزید حصص جاری کرنے کا طریقہ پسند نہیں کرتیں، بلکہ مزید سرمایہ حاصل کرنے کے لئے قرض لیتی ہیں۔قرض لینے کی دو صورتیں ہیں۔

الف۔ بینک یا کسی مالیاتی ادارے سے قرض لیا جاتا ہے، جو عموماً سود پر لیا جاتا ہے۔

ب۔عوام کو شیئرز لینے کی نہیں، بلکہ قرضے دینے کی دعوت دی جاتی ہے۔اس کے لئے دو طرح کی دستاویزات کمپنی جاری کرتی ہے، جس کو لے کر لوگ قرضے دیتے ہیں۔

(۱) سند (بانڈ)(Bond)

بانڈ معینہ مدت کے لئے جاری ہوتا ہے۔اس وقت تک اس پر سالانہ سود ملتا رہتا ہے۔مدت کبھی زیادہ ہوتی ہے، کبھی کم۔ایسا بھی ہوا ہے کہ بانڈز ننانوے سال کے لئے جاری ہوئے۔بانڈز کا حامل مدت پوری ہونے سے پہلے اس کو فروخت بھی کر سکتا ہے۔

(۲) "شهادة الاستثمار" (Debenture)(ڈیبنچر)

بانڈ اور ڈیبنچر میں اتنی بات قدر مشترک ہے کہ ان دونوں کا حامل کمپنی میں حصہ دار نہیں ہوتا، محض دائن ہوتا ہے جس کو کمپنی کی طرف سے سالانہ سود دیا جاتا ہے اور وقت مقرر پر رقم واپس کر دی جاتی ہے۔اور ان دونوں فرق دو طرح سے ہے۔ایک تو یہ کہ بانڈ صرف قرضے کی دستاویز ہے، اب بعض اوقات قرضوں کے بانڈز کو تحفظ دینے کے لئے ایک دستاویز جاری کی جاتی ہے، جس میں ان بانڈز کو کمپنی کی کسی ایک جائیداد یا بہت سی جائیدادوں کے ساتھ متعلق کر دیا جاتا ہے کہ اگر یہ قرضے ادا نہ ہوئے تو ان جائیدادوں سے ادا کر دیے جائیں گے۔اس کو (Debenture) کہتے ہیں۔گویا بانڈ قرضے کی دستاویز ہے اور ڈیبنچر اس کے رہن کا وثیقہ ہے۔دوسرا فرق یہ ہے کہ اگر کمپنی دیوالیہ ہو جائے تو اثاثوں سے جن لوگوں کا حق متعلق ہوتا ہے، ان کے حقوق کی ادائیگی کی قانوناً ترتیب ہوتی ہے، اس ترتیب میں ڈیبنچر اس جائیداد کی حد تک مقدم ہوتا ہے جس کو رہن بنایا گیا تھا، بانڈز کی ادائیگی اس کے بعد ہوتی ہے۔

بانڈ کی ایک قسم ایسی ہے، جس میں حامل کو یہ اختیار ہوتا ہے کہ وہ بانڈ کو شیئر میں تبدیل کر لے۔پہلے وہ دائن تھا، اب وہ کمپنی میں حصہ دار ہوگا۔اس کے لئے کبھی مدت مقرر ہوتی ہے کہ اتنی مدت کے بعد شیئر میں بدل سکتے ہیں اور کبھی مدت مقرر نہیں ہوتی، کبھی مخصوص شرائط ہوتی ہیں، کبھی نہیں۔ایسے بانڈز کو "سندات قابلة للتحويل" (Convertible Bonds) کہتے ہیں۔

(۳) ''اجارہ'' ــــ سرمایہ حاصل کرنے کا ایک طریقہ اور رائج ہوا ہے جس کو ''اجارہ''

(Leasing) کہتے ہیں۔ اجارہ دو طرح کا ہوتا ہے، ایک (Operating Leas)(آپریٹنگ لیز) یہ وہ اجارہ ہے جو عام طور پر معروف ہے، اس میں واقعتاً فریقین میں موجر و مستاجر کا رشتہ ہوتا ہے۔ یہ اجارہ سرمایہ حاصل کرنے کا ذریعہ نہیں ہوتا۔ سرمایہ حاصل کرنے کا ذریعہ دوسری قسم کا اجارہ ہے جس کو (Financial Lease) (فنانشل لیز) کہتے ہیں۔ اس کی وضاحت یہ ہے کہ یہاں اصل مقصود اجارے کا رشتہ قائم کرنا نہیں ہوتا، بلکہ کمپنی کو جامد اثاثوں کی (مثلاً مشینری کی) ضرورت ہے تو کمپنی بینک سے قرض لے کر خود مشینری خریدنے کی بجائے کسی بینک یا مالیاتی ادارے کو یہ کہتی ہے کہ یہ مشینری خرید کر ہمیں کرایہ پر دیدو۔ اس دوران مشینری کا مالک بینک یا مالیاتی ادارہ ہوگا اور کمپنی کرایہ دار ہونے کی حیثیت سے اسے استعمال کرتی ہے ایک مخصوص مدت کے لئے کرایہ اس تناسب سے طے کیا جاتا ہے کہ اس میں مشینری کی قیمت بھی وصول ہو جائے اور اتنی مدت کے لئے اگر یہ رقم قرض دی جاتی تو اس پر جتنا سود ملنا تھا وہ بھی وصول ہو جائے۔ جب یہ مدت گزر جاتی ہے اور کرایہ کی شکل میں مشینری کی قیمت بمع معینہ شرح سود ادا ہو جاتی ہے تو اب یہ مشینری خود بخود کمپنی کی مملوک بن جاتی ہے، یہ بات کبھی معاہدے میں لکھی ہوتی ہے اور کبھی لکھی تو نہیں جاتی، مگر معروف اسی طرح ہے۔

قرض کی بجائے اجارے کا طریقہ اختیار کرنے کے دو مقصد ہوتے ہیں۔

۱۔ اس کی وجہ سے بعض صورتوں میں ٹیکس سے بچت ہو جاتی ہے یا ٹیکس میں کمی ہو جاتی ہے۔

۲۔ قرض کی وصولیابی کے لئے اجارے کا طریقہ بہ نسبت اقراض کے زیادہ باعث اعتماد ہے، اس لئے کہ اجارے میں مشینری موجر کی ملکیت میں ہوتی ہے، اس پر اسی کا لیبل لگا رہتا ہے، اگر بالفرض رقم نہ ملی تو موجر کو کوئی خطرہ نہیں، اس لئے کہ مشینری اسی کی ملکیت میں ہے۔

یہاں یہ بھی یاد رہے کہ فنانشل لیزنگ سے چونکہ ایک درجے میں سرمایہ حاصل کرنے میں مدد لینا ہی مقصود ہوتا ہے، اسلئے اس کو فنڈز کی فراہمی کا ایک طریقہ شمار کر کے اس کو ''تمویل'' (Financing) کے ذیل میں لایا گیا ہے، ورنہ حقیقت میں یہ تمویل نہیں ہے، اسلئے کہ تمویل وہ ہوتی ہے جس میں کوئی چیز کمپنی کی ملک میں آجائے اور یہاں وہ مشینری ابھی کمپنی کی ملکیت میں نہیں آئی۔

کمپنی کے حسابات

ہر کمپنی اپنے حسابات باقاعدہ رکھنے کا اہتمام بھی کرتی ہے، حسابات رکھنے کے اصول بھی ہوتے ہیں۔ حسابات رکھنا ایک باقاعدہ فن ہے۔ اس کا اجمالی تعارف بھی ضروری ہے، اس لئے کہ معاملات کو سمجھنے کے لئے اس کی کافی ضرورت پڑتی ہے۔

تختہ توازن (Balance Sheet)

کمپنی کی املاک کو اردو میں ''اثاثے'' عربی میں ''موجودات'' یا ''اصول'' اور انگریزی میں (Assets) کہتے ہیں۔ اور دوسروں کے جو حقوق کمپنی کے ذمہ واجب ہوتے ہیں ان کو ''ذمہ داریاں'' اور عربی میں ''دیون'' یا ''حقوق'' یا ''مطلوبات'' اور انگریزی میں (Liabilities) کہتے ہیں۔

کمپنی سال میں ایک بار یا کسی معینہ تجارتی دورانیہ میں اپنی ذمہ داریوں اور اثاثوں کی تفصیل تیار کرتی ہے اس کو ''تختہ توازن'' ''لا ئحة الرصيد'' (Balance Sheet) کہتے ہیں۔ بیلنس شیٹ کا اجمالی تعارف یہ ہے کہ ایک طرف کمپنی کے اثاثے اور دوسری طرف ذمہ داریاں لکھ لی جاتی ہیں ''اثاثوں'' سے مراد کمپنی کی املاک اور واجب الوصول (Receivable) اموال ہیں، اور ذمہ داریوں سے مراد وہ مالی واجبات ہیں جو کمپنی کے ذمے دوسروں کے لئے واجب الادا ہیں، پھر ان دونوں میں تناسب دیکھا جاتا ہے۔ اور اس تناسب کی بنیاد پر کمپنی کا استحکام معلوم کیا جاتا ہے۔

ذمہ داریوں اور اثاثوں میں کیا تناسب ہونا چاہئے؟ اس کے بارے میں عموماً یہ سمجھا جاتا ہے کہ اگر ایک اور دو کا تناسب ہو یعنی اثاثے ذمہ داریوں کے مقابلے میں دوگنے ہوں تو کمپنی خوب مستحکم سمجھی جاتی ہے، چنانچہ ایسی کمپنی کو بینک وغیرہ قرض دینے کے لئے زیادہ آمادہ ہوتے ہیں۔

بیلنس شیٹ تیار کرنے کے طریقے کی کچھ وضاحت یہ ہے کہ ایک طرف درج ذیل طریقے سے کمپنی کے اثاثے لکھے جاتے ہیں۔

اثاثے

اس کو عربی میں "موجودات" اور انگریزی میں (Assets) کہتے ہیں۔
اثاثے تین قسم کے لکھے جاتے ہیں۔

ا۔ رواں اثاثے (Current Assets) ان کو عربی میں ''موجودات متداولة'' کہتے ہیں جو نقد ہوں یا بسہولت نقد پذیر ہوں۔ اس میں چار مدات شامل ہوتی ہیں۔ (الف) نقد (Cash) (ب) کمپنی نے جو رقم کسی سے وصول کرنی ہے (Accounts Receivable) مثلاً کوئی چیز فروخت کی ہے، اس کی قیمت ابھی قابل وصول ہے۔ (ج) اگر کمپنی نے دوسرے اداروں کو قرض دے کر اس کی دستاویزات اور رسیدیں اپنے پاس رکھی ہوئی ہیں تو وہ بھی اس کے اثاثوں میں شمار ہیں، مثلاً بانڈز وغیرہ اس کو (Notes Receivable) کہتے ہیں۔ (د) کسی اور کمپنی یا ادارے میں سرمایہ

کاری کی گئی ہے اور وہاں سے رقوم کی وصولی متوقع ہے (Investments)

۲۔ جامد اثاثے (Fixed Assets) ان کو عربی میں "موجودات ثابتہ" کہتے ہیں۔ ان سے مراد غیر نقد اثاثے ہیں جو جلدی نقد پذیر نہیں۔ جیسے مشینری، بلڈنگ وغیرہ۔

۳۔ غیر مادی اثاثے (Intangible Assets) ان کو عربی میں "موجودات غیر مادیۃ" کہتے ہیں۔ ایسے اثاثے جن کو مادی طور پر محسوس نہیں کیا جاسکتا۔ جیسے گڈوِل، اس کی قیمت بھی لگتی ہے۔ بیع وشراء بھی ہوتی ہے مگر یہ کوئی محسوس مادی چیز نہیں، یا کسی تجارت کی ایڈورٹائزنگ (تشہیر) پر رقم خرچ ہوئی، اس تشہیر کا کئی سال تک فائدہ ہوگا۔ یہ بھی غیر مادی اثاثوں میں شامل ہوگی۔

اثاثے لکھنے کے بعد یہ بھی لکھا جاتا ہے کہ یہ اثاثے کن ذرائع سے حاصل ہوئے، ان کے لئے سرمائے کا حصول (Financing) کہاں سے ہوئی۔

اثاثوں کی قیمتیں مختلف ہوتی ہیں۔ ایک وہ قیمت جو بوقت خرید تھی، پھر استعمال کے بعد فرسودگی کی وجہ سے اس کی قیمت کم ہو جاتی ہے، زمانہ گزرنے سے قیمت میں اضافہ بھی ہوتا ہے، لیکن چونکہ قیمت کے اس تغیر کا ٹھیک ٹھیک اندازہ مشکل ہوتا ہے اس لئے بیلنس شیٹ میں اثاثوں کی وہ قیمت لگائی جاتی ہے جس پر وہ اصلاً خریدے گئے تھے۔ اس کو "کتابی قیمت" یا (Book Value) کہا جاتا ہے، چونکہ ان اثاثوں کی موجودہ بازاری قیمت عموماً مختلف ہوتی ہے اس لئے عموماً بیلنس شیٹ سے کمپنی کی صورتحال کی حقیقی نمائندگی نہیں ہوتی، بلکہ ظنی اور تقریبی ہوتی ہے۔ اس میں دھوکہ بھی چلتا ہے۔

ذمہ داریاں

بیلنس شیٹ کے دوسرے حصہ میں "ذمہ داریاں" لکھی جاتی ہیں۔ یعنی وہ یہ رقوم ہیں جو کمپنی پر واجب الادا ہیں، اور کمپنی کو ادا کرنی ہیں۔ ذمہ داریوں میں ملازمین کی تنخواہیں جو دینی ہیں، کوئی چیز خریدی ہے اس کی قیمت واجب الادا ہے، سرمایہ لیا ہے وہ واجب الادا ہے، اس جیسی چیزیں داخل ہیں۔ ذمہ داریاں لکھنے کی ترتیب یہ ہوتی ہے کہ پہلے طویل المیعاد ذمہ داریاں لکھی جاتی ہیں۔ مثلاً قرض لیا ہے جو پانچ سال کے بعد ادا کرنا ہے۔ ایسی ذمہ داریوں کو (Long Term Liabilities) کہتے ہیں۔ اس کے بعد "رواں ذمہ داریاں" لکھی جاتی ہیں، جو تھوڑی مدت میں ادا کرنی ہیں، مثلاً ملازمین کی تنخواہیں، ٹیکس، کوئی چیز خریدی ہے اس کا بل ادا کرنا ہے، طویل المیعاد قرضوں کا وہ حصہ جو ایک سال کے اندر ادا کرنا ہے۔ ایسی ذمہ داریوں کو (Current Liabilities) کہتے ہیں۔

صافی مالیت

اثاثوں میں سے ذمہ داریاں منہا کر کے جو باقی بچے اس کو ''صافی مالیت'' ''المالیة الصافیة'' (Net Worth) کہتے ہیں۔ یہی مالیت دراصل حصہ داروں کی ملکیت ہوتی ہے۔

نفع، نقصان کا میزانیہ

تختہ توازن (بیلنس شیٹ) تو کمپنی کا مالی استحکام معلوم کرنے کے لئے ہوتی ہے، اس کا اس بات سے کوئی تعلق نہیں ہوتا کہ کمپنی کو کتنا نفع یا نقصان ہوا؟ نفع، نقصان کو بیان کرنے کے لئے جو رپورٹ تیار کی جاتی ہے اس کو عربی میں ''اللائحة المالیة'' یا ''البیان المالی'' اور انگریزی میں (Income Statement) کہتے ہیں۔ اس کی ترتیب یہ ہوتی ہے

مجموعی فروختگی،	(Gross Sales)
-واپسی،	(Returns)
=صافی فروختگی،	(Net Sales)
-براہ راست اخراجات،	(Direct Expenses)
=اجمالی منافع،	(Gross Profit)
-بالواسطہ اخراجات،	(Indirect Expenses)
=صافی منافع (قبل ٹیکس)،	(Net Profit (Pre Tax))
-ٹیکس،	(Tax)
=صافی منافع (بعد ٹیکس)،	(Net Profit (After Tax))
-محفوظ فنڈ،	(Reserve)
	(Dividend)

''واپسی'' سے مراد وہ اشیاء ہیں جو بیچنے کے بعد واپس لینی پڑتی ہیں۔ وہ چونکہ فروختگی میں شامل ہو چکی ہیں اس لئے ان کو منہا کر کے جو فروختگی بچے گی وہ ''صافی فروختگی'' ہے۔ ''براہ راست اخراجات'' سے مراد وہ اخراجات ہیں جو اس چیز کی تیاری پر ہوتے ہیں جو کمپنی کا اصل سامانِ تجارت ہے، مثلاً اگر کوئی مل ہے تو اس کے خام مال کی خریداری پر جو اخراجات ہوں گے وہ براہِ راست اخراجات میں داخل ہوں گے یا کوئی اخبار نکلتا ہے تو اس کی طباعت اور اس کے کاغذ کے اخراجات اسی

مد میں آئیں گے۔ ''صافی فروختگی'' سے یہ اخراجات منہا کر کے جو رقم بچے وہ کمپنی کا ''اجمالی نفع'' ہے۔ ''بالواسطہ اخراجات'' سے مراد وہ اخراجات ہیں جن کا تعلق براہِ راست اشیائے فروخت کی تیاری سے نہیں ہے، مثلاً دفتر کی عمارت کا کرایہ، ایڈیٹر کی تنخواہ وغیرہ۔ ''براہِ راست اخراجات'' اور ''بالواسطہ اخراجات'' میں عملی فرق یہ ہے کہ براہِ راست اخراجات اس وقت ہوں گے جب کہ اشیاء تیار ہوں، اگر اشیاء تیار نہ ہوں تو یہ اخراجات نہیں ہوں گے۔ پھر اشیاء زیادہ تیار ہوں تو خرچہ بھی زیادہ ہوگا، کم تیار ہوں تو اخراجات بھی کم ہوں گے۔ بالواسطہ اخراجات بہرحال بدستور جاری رہیں گے چاہے پروڈکشن ہو یا نہ ہو، کم ہو یا زیادہ۔ ''اجمالی نفع'' سے اس قسم کے اخراجات منہا ہوں تو بقیہ ''صافی نفع'' (قبل از ٹیکس) ہے۔ پھر اس میں سے حکومت کو ادا کیا جانے والا ٹیکس منہا ہو کر بقیہ ''صافی نفع'' (بعد ٹیکس) ہے۔ اس ''صافی نفع'' کا کچھ حصہ محفوظ فنڈ یا ریزرو میں منتقل کرنے کے بعد جو منافع بچتا ہے، وہ ''قابلِ تقسیم منافع'' یا (Distributable Profit) کہلاتا ہے۔

انکم اسٹیٹمنٹ میں جو صافی دکھایا جاتا ہے اس کا کیش کی شکل میں ہونا ضروری نہیں۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ کمپنی نفع بہت دکھاتی ہے، مگر اس کے پاس نقد اتنا نہیں ہوتا بلکہ وہ پروڈکشن میں لگا ہوا ہوتا ہے۔ ایسی صورتوں میں ہی ''بونس شیئر'' جاری کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے۔

❁❁❁

بازارِ حصص

(Stock Exchange)

بازارِ حصص
(Stock Exchange)

کمپنی کے احکام پر غور کرنے کے لیے ''بازارِ حصص'' کی بنیادی تفصیلات کا معلوم ہونا بھی بہت اہم ہے۔

تعارف وضرورت

جب کوئی شخص کمپنی کے شیئرز لے کر اس کا حصہ دار بن جائے تو اس کے لیے ممکن نہیں ہے کہ وہ کسی وقت اپنی رقم واپس لے کر شرکت ختم کر سکے۔ بلکہ جب تک کمپنی وجود میں ہے، اس سے حصہ کی رقم واپس نہیں لی جا سکتی۔ چونکہ بہت سے شرکاء یہ چاہتے ہیں کہ وہ اپنی شرکت کو ختم کر کے اپنے حصہ کو نقد میں تبدیل کر لیں، اس لیے یہ ضمانت فراہم کرنا ضروری تھا کہ رقم لگانے کے بعد بوقت ضرورت اپنے شیئرز کو نقد میں تبدیل کرنا ممکن ہوگا، اس کے لیے بازارِ حصص قائم کیا گیا ہے جس میں شیئرز بیچے جا سکتے ہیں۔ یعنی کمپنی کے حصہ دار اپنی شرکت ختم کر کے کمپنی سے تو اپنا سرمایہ واپس نہیں لے سکتے۔ لیکن بازارِ حصص میں وہ اپنا حصہ کسی اور کو بیچ سکتے ہیں جس کے نتیجے میں خریدار ان کی جگہ کمپنی کا حصہ دار بن جاتا ہے۔ جس جگہ شیئرز کی خرید وفروخت ہوتی ہے اس کو ''بازار حصص (Stock Market)'' کہتے ہیں۔

شیئرز کی خرید وفروخت کے دو طریقے ہیں۔ ایک یہ کہ دو شخص کسی ادارے کے توسط کے بغیر شیئرز کی خرید وفروخت کریں۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ کسی ادارے کے توسط سے شیئرز کی خرید وفروخت ہو۔ وہ ادارہ ''اسٹاک ایکسچینج'' ہے جو شیئرز کی خرید وفروخت کی نگرانی بھی کرتا ہے اور واسطہ بھی بنتا ہے۔ اس کو عربی میں ''بورصہ'' کہتے ہیں۔ اسٹاک ایکسچینج کے توسط کے بغیر جو شیئرز کا کاروبار ہوتا ہے، اس کو ''عملیات من وراء المنصة'' (Over the Counter Transactions) کہتے ہیں۔ اس انداز کی خرید وفروخت کا کوئی خاص نظم نہیں، اس کی تفصیلات جاننے کی بھی ضرورت نہیں۔ جو خرید وفروخت اسٹاک ایکسچینج کے ذریعے ہوتی ہے اس کی چند تفصیلات سمجھنا ضروری ہے۔ اسٹاک ایکسچینج ایک پرائیویٹ ادارہ ہوتا ہے۔ جو حکومت کی اجازت وسرپرستی کے ساتھ کمپنیوں کے شیئرز کی

خرید و فروخت کا کام کرتا ہے۔ لیکن اسٹاک ایکسچینج انہی کمپنیوں کے شیئرز کا کاروبار کرتا ہے جو قابل اعتماد ہوں اور کچھ نہ کچھ ساکھ رکھتی ہوں۔ جن کمپنیوں کے شیئرز کی خرید و فروخت اسٹاک ایکسچینج میں ہوتی ہے ان کو (Listed Companies) کہتے ہیں۔ ایسی کمپنیوں کے شیئرز کی خرید و فروخت اسٹاک ایکسچینج میں بھی ہوسکتی ہے اور ''اوور دی کاؤنٹر'' بھی ہوسکتی ہے۔ کسی کمپنی کی لسٹنگ کبھی اس کے وجود میں آجانے کے بعد ہوتی ہے۔ کبھی کمپنی منظور ہونے کے بعد اس کے کاروبار شروع ہونے سے پہلے، بلکہ کبھی شیئرز فلوٹ ہونے سے بھی پہلے لسٹنگ ہو جاتی ہے اس کو عبوری (Provisional) لسٹنگ کہتے ہیں۔ اس کا کاؤنٹر بھی الگ ہوتا ہے۔ جن کمپنیوں کے شیئرز اسٹاک ایکسچینج نہیں لیتا ہے ان کو (Unlisted Companied) کہتے ہیں۔ ان کے شیئرز کی خرید و فروخت ''اوور دی کاؤنٹر'' ہی ہوسکتی ہے اسٹاک ایکسچینج میں نہیں ہوسکتی۔

ممبر شپ

اسٹاک ایکسچینج میں ہر شخص شیئرز کی خرید و فروخت کا کام نہیں کرسکتا، اس کے لیے ممبر ہونا ضروری ہے، ممبر شپ کی فیس بھی ہوتی ہے۔ ممبر ہونا اس لیے ضروری ہے کہ اسٹاک ایکسچینج میں شیئرز کا کاروبار بہت وسیع، نازک اور فنی نوعیت کا ہوتا ہے۔ وہاں کی مخصوص اصطلاحات ہوتی ہیں۔ ایک نیا ناتجربہ کار شخص کاروبار میں غلطی بھی کرسکتا ہے۔ اور ادارہ وہاں ہونے والے تمام معاملات میں ادائیگیوں کا ذمہ دار ہوتا ہے۔ لہٰذا ادارہ ہر شخص کو خرید و فروخت کی اجازت دے کر اس کے معاملات کا ذمہ دار نہیں بننا چاہتا، اس لئے ممبر ہونا ضروری قرار دیدیا گیا ہے۔

اسٹاک ایکسچینج میں دلالی

اسٹاک ایکسچینج کے ممبر اپنے لئے بھی شیئرز خریدتے ہیں اور بحیثیت دلال کمیشن لے کر دوسروں کے لیے بھی خریدتے ہیں۔ غیر ممبر کو شیئرز خریدنے ہوں تو وہ کسی دلال کے واسطے سے خریدتا ہے۔ شیئرز خریدنے کے لیے دلال کو آرڈر دینے کی تین صورتیں ہیں:

۱۔ مارکیٹ آرڈر (Market Order) یعنی ایسا آرڈر جس میں دلال سے یہ کہہ دیا گیا ہو کہ مارکیٹ میں جو بھی ریٹ ہو اس پر فلاں کمپنی کے شیئرز خرید لیے جائیں۔

۲۔ لمیٹڈ آرڈر (Limited Order) یعنی ایک قیمت مقرر کر کے آرڈر دیا جائے کہ اگر قیمت پر شیئرز مل جائیں تو لے لیے جائیں، اس سے زیادہ قیمت پر نہ خریدے جائیں۔

۳۔ اسٹاپ آرڈر (Stop Order) یعنی شیئرز کا مالک اپنے شیئرز کی بیع کا مشروط آرڈر دیتا ہے کہ اگر اس کی قیمت بحال رہے یا بڑھتی رہے تو شیئرز نہ بیچنا اور اگر قیمت گرنے لگے تو بیچ دینا۔

شیئرز کی قیمتوں کا تعین

کمپنیوں کے شیئرز کی قیمتوں میں کمی بیشی ہوتی رہتی ہے۔ اس میں کمپنی کے اثاثوں کا بھی دخل ہوتا ہے۔ اثاثے بڑھنے سے قیمت بڑھتی ہے، لیکن اثاثوں کے علاوہ اور کئی خارجی عوامل سے بھی قیمتیں اثر پذیر ہوتی ہیں، مثلاً منافع کے امکانات، طلب و رسد کا رجحان، سیاسی حالات، موسمی حالات، غیر مادی عوامل جیسے بعض افواہوں اور تخمینوں سے بھی قیمتیں اثر پذیر ہوتی ہیں۔ چونکہ قیمتوں کے اتار چڑھاؤ میں خارجی عوامل بھی اثر انداز ہوتے ہیں، اس لئے شیئرز کی قیمتوں سے کمپنی کے اثاثوں کی حقیقی نمائندگی نہیں ہوتی۔ کسی کمپنی کے شیئرز کی قیمت بڑھ جائے تو اس شیئر کی مارکیٹ کو اسٹاک ایکسچینج کی اصطلاح میں (Bull Market) کہتے ہیں، اور قیمت کم ہو جائے تو اسے (Bear Market) کہتے ہیں۔

خریدارِ حصص کی قسمیں

شیئرز خریدنے والے دو طرح کے ہوتے ہیں

۱۔ بعض لوگ کمپنی میں حصہ دار بننے کے لیے شیئرز خریدتے ہیں اور شیئرز اپنے پاس رکھ کر سالانہ نفع حاصل کرتے ہیں، مگر ایسے لوگ بہت کم ہیں۔

۲۔ اکثر لوگ ایسے ہوتے ہیں جو شیئرز کو بذاتِ خود مالِ تجارت سمجھ کر اس کی خرید و فروخت کرتے ہیں، جب شیئرز کی قیمت کم ہو اس وقت خریدتے ہیں اور جب قیمت بڑھ جائے تو بیچ دیتے ہیں۔ دونوں قیمتوں میں جو فرق ہوتا ہے وہ ان کا نفع ہوتا ہے۔ قیمتوں کے بڑھ جانے کی وجہ سے جو نفع حاصل ہوتا ہے اس کو (Capital Gain) کہتے ہیں۔ اس کاروبار میں پہلے تخمینہ اور اندازہ لگانا ہوتا ہے کہ کونسے شیئرز کی قیمتیں آئندہ کم ہوں گی اور کونسے شیئرز کی قیمتیں بڑھیں گی، اس عملِ تخمین کو (Speculation) کہتے ہیں۔ یہ اندازہ کبھی صحیح ثابت ہوتا ہے اور کبھی غلط۔

شیئرز کی خرید وفروخت کا طریقِ کار

شیئرز کی خریداری کے تین طریقے ہیں:

۱۔ حاضر سودا (Spot Sale)

یہ خرید وفروخت کا عام سادہ انداز ہے کہ کسی نے شیئرز دے کر ان کی قیمت وصول کر لی۔ اس حاضر سودے میں بھی شیئرز کے سرٹیفکیٹ پر قبضہ عموماً ایک ہفتے کے بعد ہوتا ہے۔

۲۔ (Sale On Margin)

اس سے مراد شیئرز کی ایسی خریداری ہے جس میں قیمت کا کچھ فیصد حصہ فی الحال ادا کر دیا جائے باقی ادھار ہو۔ مثلاً دس فیصد قیمت ادا کر دی اور ۹۰ فیصد ادھار ہے ___ اس کی عموماً صورت یہ ہوتی ہے کہ جو لوگ اکثر شیئرز خریدتے رہتے ہیں ان کے دلالوں سے تعلقات ہوتے ہیں۔ اب کوئی شخص دلال سے کہتا ہے کہ فلاں کمپنی کے شیئرز **Margin** پر خرید لو، جس کی شرح طے کر لی جاتی ہے مثلاً دس فیصد، اتنی رقم تو خریدار دیدیتا ہے، باقی ۹۰ فیصد دلال اپنی طرف سے ادا کرتا ہے۔ یہ رقم دلال کا قرض ہوتا ہے خریدار کے ذمے۔ دلال کبھی اس پر سود لیتا ہے اور کبھی نہیں۔ اور کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ چند دن تک تو مہلت بلا سود ہے، اس کے بعد سود ادا کرنا لازمی ہوتا ہے مثلاً اگر باقی ماندہ قیمت تین دن تک ادا کر دی تو سود نہیں ہوگا لیکن اس کے بعد سود لگے گا۔ اس میں دلال کا اصل فائدہ کمیشن ہوتا ہے۔ اپنا کاروبار جاری رکھنے کے لیے اور کمیشن لینے کے لیے وہ قرض دینے کو بھی تیار ہوتا ہے۔

۳۔ (Short Sale)

شارٹ سیل درحقیقت ''بیع غیر مملوک'' کا نام ہے، یعنی بائع ایسے شیئر فروخت کر دیتا ہے جو ابھی اس کی ملکیت میں نہیں ہوتے۔ لیکن اسے یہ توقع ہوتی ہے کہ سودا ہو جانے کے بعد میں یہ شیئرز لے کر خریدار کو دے دوں گا۔

حاضر اور غائب سودے

شیئرز کے سودے دو طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک کو حاضر سودا (Spot Sale) کہتے ہیں اور دوسرے کو غائب سودا (Forward Sale) کہتے ہیں۔ حاضر سودے میں شیئرز کی بیع ابھی ہو جاتی ہے اور حقوق کی منتقلی بھی ابھی ہو جاتی ہے۔ خریدار ابھی سے شیئرز لینے کا حقدار ہوتا ہے، مگر بعض انتظامی مجبوریوں کی بناء پر شیئرز کے سرٹیفکیٹ کی ادائیگی (ڈیلیوری) میں تاخیر ہوتی ہے۔ عموماً ایک

سے تین ہفتوں تک تاخیر ہو جاتی ہے۔ لیکن زیادہ تر یہ تاخیر رجسٹرڈ شیئرز کی ادائیگی میں ہوتی ہے، جن پر حامل کا نام لکھا ہوا ہوتا ہے۔ حامل کا نام بدلنے کے لیے کمپنی کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے اس کی وجہ سے تاخیر ہو جاتی ہے۔ بیئرر شیئرز میں زیادہ تاخیر نہیں ہوتی ہے ـــــ حاضر سودے میں بھی چونکہ شیئرز پر قبضہ ہونے میں تاخیر ہو جاتی ہے، اس لئے یہاں بھی خریدار شیئرز کے سرٹیفکیٹ کو اپنی تحویل میں لینے سے پہلے آگے بیچ دیتا ہے۔ بسا اوقات قبضے کا وقت آنے پر اس کی کئی ہاتھوں میں بیع ہو چکی ہوتی ہے۔

حاضر سودے میں شیئرز کی بیع ہو جانے کے بعد قبضے سے پہلے اگر کمپنی نفع تقسیم کر دے تو کمپنی نفع بائع کے نام ہی جاری کرتی ہے، لیکن طریق کار یہی ہے کہ چونکہ بیع ہونے کے بعد نفع تقسیم ہوا ہے، اس لئے بائع وہ نفع خریدار کو دیدیتا ہے۔

غائب سودے میں بیع تو ابھی ہو جاتی ہے، مگر مستقبل کی طرف مضاف ہوتی ہے۔ جیسے ابھی شیئرز کی بیع ہو چکی ہے، مگر قبضے وغیرہ کے حقوق فلاں تاریخ سے متعلق ہوں گے۔ غائب سودے میں جب وہ تاریخ آتی ہے جس پر شیئرز کی ادائیگی طے کی گئی تھی تو بعض اوقات شیئرز خریدار کے حوالے کر دیئے جاتے ہیں، اور بعض اوقات یہ بھی ہوتا ہے کہ بائع اور خریدار شیئرز لینے کے بجائے خریداری کی تاریخ کی قیمت اور ادائیگی کی تاریخ کی قیمت کا فرق آپس میں برابر کر لیتے ہیں۔ مثلاً یکم جنوری کو ۳۰ مارچ کی تاریخ کے لئے غائب سودا کیا گیا تھا، اور فی شیئر دس روپے قیمت مقرر ہوئی تھی۔ لیکن جب ۳۰ مارچ کی تاریخ آئی تو شیئرز کی قیمت بڑھ کر بارہ روپے ہوگئی۔ اب بائع خریدار کو شیئرز دینے کے بجائے دو روپے فی شیئر ادا کر دیتا ہے، یا اگر قیمت آٹھ روپے رہ گئی تو خریدار بجائے اس کے کہ بائع کو دس روپے دیکر اس سے شیئرز وصول کرے، اسے فی شیئر دو روپے دیدیتا ہے اور شیئرز وصول نہیں کرتا۔ پھر غائب سودے میں سودے کی تاریخ کے بعد ادائیگی کی تاریخ آنے تک بعض اوقات بہت سے سودے ہو جاتے ہیں یعنی پہلا خریدار دوسرے کو، دوسرا تیسرے کو بیچتا رہتا ہے۔ اور بعض اوقات آخر میں سب شیئرز کے لین دین کے بجائے قیمتوں کا فرق برابر کر لیتے ہیں۔

اجناس میں حاضر اور غائب سودے

بعض ممالک میں اسٹاک ایکسچینج کے ذریعے جیسے شیئرز کے حاضر اور غائب سودے ہوتے ہیں ایسے ہی اجناس اور اشیاء کے بھی حاضر اور غائب سودے ہوتے ہیں۔ یہ سودے چند منتخب بڑی بڑی اجناس میں ہوتے ہیں مثلاً گندم، کپاس وغیرہ۔

اجناس کا حاضر سودا تو یہ ہوتا ہے کہ کسی جنس کی ابھی بیع ہوئی اور حقوق بھی منتقل ہو گئے اور

خریدار ابھی سے قبضے کا حقدار قرار پایا۔ کسی انتظامی مجبوری کی بناء پر قبضے میں تاخیر ہو تو وہ الگ بات ہے، مگر وہ حقدار قبضے کا بن چکا ہے۔

غائب سودا یہ ہے کہ بیع تو ہوگئی، مگر قبضے کے لیے کوئی آئندہ تاریخ مقرر ہو جاتی ہے، اصولی طور پر اس کو (Forward Sale) بھی کہتے ہیں اور (Future Sale) بھی کہتے ہیں۔ مگر آج کل عملی طور پر ان دونوں میں فرق ہوتا ہے۔ غائب سودے میں اگر جانبین کا مقصد مقررہ تاریخ پر لینا دینا ہی ہو یعنی مشتری کا مقصد جنس وصول کرنا اور بائع کا مقصد قیمت لینا، اس کو (Forward Sale) کہتے ہیں۔ اور اگر جانبین کا مقصد مقررہ تاریخ پر لینا، دینا نہ ہو بلکہ جنس کو محض معاملے کی بنیاد کی حیثیت سے اختیار کیا گیا ہو اس کو (Future Sale) کہتے ہیں۔ اور عربی میں اس کو "مستقبلیات" کہتے ہیں۔ اس میں جنس کا لینا مقصود نہیں ہوتا، بلکہ مقصد دو باتوں میں سے ایک بات ہوتی ہے۔

۱۔ سٹہ (Speculation)

تاریخ مقررہ پر جنس لینے، دینے کے بجائے قیمتوں کا فرق برابر کر کے نفع کمایا جاتا ہے۔ مثلاً یکم دسمبر کو یہ معاملہ طے ہوا کہ یکم جنوری کو کپاس کی سو گانٹھیں ایک لاکھ روپے میں دینی ہوں گی، مگر نہ بائع کا مقصد کپاس دینا ہوتا ہے اور نہ مشتری کا مقصد کپاس لینا ہوتا ہے، بلکہ تاریخ آنے پر دونوں آپس میں نفع یا نقصان برابر کر لیتے ہیں۔ اگر یکم جنوری کو سو گانٹھوں کی قیمت ایک لاکھ دس ہزار ہوگئی تو بائع مشتری کو دس ہزار دے کر معاملہ صاف کر لے گا۔ اور اگر یکم جنوری کو قیمت ۹۰ ہزار ہوگئی تو بائع مشتری سے دس ہزار لے کر معاملہ صاف کر لے گا۔

۲۔ (Future Sale)

کا دوسرا مقصد ممکنہ نقصان سے تحفظ ہوتا ہے۔ اس کو (HEDGING) کہتے ہیں، عربی میں اس کو "تامین ضد الخسارۃ" کہا جاسکتا ہے۔ اس کا حاصل یہ ہے کہ کوئی شخص کسی جنس کا غائب سودا (Forward Sale) کرتا ہے اور اس کا مقصد واقعی جنس وصول کرنا ہی ہوتا ہے، سٹہ مقصود نہیں ہوتا۔ لیکن خریدار یہ خطرہ محسوس کرتا ہے کہ اگر مقررہ تاریخ تک اس جنس کی قیمت گر گئی تو مجھے نقصان ہوگا تو وہ اس نقصان سے بچنے کے لیے اسی جنس کو (Future Market) میں اسی تاریخ کے لیے (Future) پر فروخت کرتا ہے، تا کہ اگر اس جنس کی قیمت گر گئی تو پہلے معاملے میں جتنا نقصان

ہوگا اتنا ہی دوسرے معاملے میں وصول ہو جائے گا۔

مثلاً زید نے یکم دسمبر کو کپاس کی سو گانٹھیں ایک لاکھ روپے میں خریدیں، قبضہ یکم جنوری کو طے ہوا۔ اس کا خیال یہ ہے کہ یکم جنوری کو کپاس کی سو گانٹھیں لے کر آگے بیچ کر نفع کماؤں گا، مگر خطرہ یہ ہے کہ یکم جنوری کو کپاس کی قیمت گر گئی تو اس کو نقصان ہوگا۔ زید اس نقصان سے بچنے کے لئے یہ کارروائی کرتا ہے کہ کپاس کی سو گانٹھیں یکم جنوری تک ایک لاکھ روپے میں (Futures) مارکیٹ میں خالد کو بیچ دیتا ہے۔ اب اگر یکم جنوری کو سو گانٹھوں کی قیمت ۹۰ ہزار ہو گئی تو زید کو دس ہزار کا خسارہ ہوا۔ مگر اتنی ہی گانٹھیں چونکہ اس نے خالد کو (Futures) کے بازار میں بیچی ہوئی ہیں، اس لئے یکم جنوری کو وہ ۹۰ ہزار میں دوسری گانٹھیں خرید کر خالد کو ایک لاکھ میں فروخت کر دیگا۔ اور اس طرح پہلے معاملے میں زید کو جو دس ہزار کا خسارہ ہوا تھا وہ اس نے خالد کے ساتھ کیے ہوئے معاملے سے وصول کر لیا۔ ''فیوچر سیلز'' اس طرح نقصان سے بچنے کے لیے بھی ہوتی ہے، اسی کو (Hedging) ہیجنگ کہتے ہیں۔

(Futures) وغیرہ کا کاروبار بعض ممالک میں اسٹاک ایکسچینج ہی میں ہوتا ہے اور بعض ممالک میں اس کا الگ بازار ہوتا ہے۔

بیع الخیارات (Options)

کسی خاص چیز کو خاص قیمت پر بیچنے یا خریدنے کے حق کا نام ''خیارات'' یا Options ہے۔ کوئی شخص دوسرے سے وعدہ کرتا ہے کہ اگر تم چاہو گے تو فلاں چیز اتنی قیمت میں اتنی مدت تک میں خریدنے کا معاہدہ کرتا ہوں، تم جب چاہو بیچ سکتے ہو، اس کو بیچنے کا آپشن کہتے ہیں۔

Option دینے والا یہ حق دینے پر فیس لیتا ہے۔ Option دینے والا اس مدت میں اس چیز کو اسی قیمت پر خریدنے کا پابند ہوتا ہے، لیکن Option لینے والا بیچنے کا پابند نہیں ہوتا، اسی طرح اس کے برعکس بعض اوقات ایک شخص سے یہ وعدہ کرتا ہے کہ میں تم کو فلاں چیز فلاں تاریخ کو فلاں نرخ پر بیچنے کی ذمہ داری لیتا ہوں، اس تاریخ تک تم جب چاہو مجھ سے اس نرخ پر یہ چیز خرید لینا۔ یہ خریداری کا آپشن ہے۔ Option کرنسی پر بھی ہوتا ہے اور اجناس پر بھی ہوتا ہے۔ اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ Option دینے والا لینے والے کو اس کرنسی یا جنس کی قیمتوں کے اتار چڑھاؤ سے مطمئن کرتا ہے اور یہ اطمینان دلانے پر کمیشن لیتا ہے۔

مثلاً ایک شخص نے ۲۵ روپے کا ایک ڈالر خریدا۔ وہ اس کشمکش میں ہے کہ اگر یہ اپنے پاس

رکھوں تو اس کی قیمت گرنے کا احتمال ہے۔ اگر ابھی آگے فروخت کر دوں تو ہو سکتا ہے کہ آئندہ اس کی قیمت بڑھ جائے تو نفع سے محروم رہوں گا۔ اب دوسرا شخص اس کو اطمینان دلاتا ہے کہ ڈالر تم اپنے پاس رکھو، میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ تین ماہ تک یہ ڈالر میں تم سے ۲۵ روپے میں خریدوں گا، اور اس وعدہ پر اتنی فیس لوں گا۔ اس کی وجہ سے وہ شخص قیمت گرنے سے مطمئن رہے گا۔ اگر قیمت بڑھے گی تو کسی اور کو فروخت کر دے گا، قیمت گر گئی تو Option بیچنے والے کو ۲۵ روپے میں فروخت کر دے گا۔

Option کو مستقل مالِ تجارت سمجھا جاتا ہے۔ اس کی آگے بھی بیع ہو جاتی ہے۔ یہ کاروبار دوسرے ممالک میں بہت وسیع پیانے پر ہو رہا ہے۔ اور اس کی صورتیں روز بروز پیچیدہ سے پیچیدہ تر ہوتی جا رہی ہیں۔

السوق المالیة (Financial Market)

اسٹاک ایکسچینج ایک بڑے بازار کا حصہ ہے جس کو ''السوق المالیة (Financial Market) یا (Capital Market) کہتے ہیں۔ جس میں صرف کمپنیوں کے شیئرز ہی نہیں، بلکہ دوسرے اداروں (بینک، دیگر مالیاتی ادارے، حکومت وغیرہ) کی جاری کردہ مالیاتی دستاویزات کی خرید و فروخت بھی ہوتی ہے۔ گو اس بازار کا کوئی الگ جغرافیائی وجود ضروری نہیں، عملاً یہ سب کام اسٹاک ایکسچینج میں ہی ہو سکتے ہیں، مگر اصطلاح میں اس کا معنوی تصور ہے۔ اسی Financial Market میں ''سرکاری تمسکات'' (Government Securities) کی بیع و شراء بھی ہوتی ہے۔ ''سرکاری تمسکات'' ان دستاویزات کو کہتے ہیں جو حکومت وقتاً فوقتاً عوام سے قرض لینے کے لیے جاری کرتی ہے۔ جب حکومت کے ذرائع آمدنی (ٹیکس وغیرہ) بجٹ کے لئے ناکافی ہوں تو حکومت یہ مالیاتی دستاویز عوام سے قرض لینے کے لیے جاری کرتی ہے۔ مثلاً

۱۔ انعامی بانڈ جس میں ہر بانڈ پر تو نفع نہیں ہوتا، تمام بانڈز سے حاصل ہونے والی رقوم پر مجموعی طور پر نفع ہوتا ہے جو قرعہ اندازی سے تقسیم ہوتا ہے۔

۲۔ ڈیفنس سیونگ سرٹیفکیٹ

۳۔ خاص ڈپازٹ سرٹیفکیٹ

۴۔ فارن ایکسچینج بیئرز سرٹیفکیٹ ــــ پہلے عوام کو فارن ایکسچینج (بیرونی کرنسی) اپنے پاس رکھنے کی اجازت نہیں تھی۔ جس کا نتیجہ یہ تھا کہ جب کسی کو فارن ایکسچینج کی ضرورت پیش آتی تو اس میں بہت سی قانونی مشکلات ہوتی تھیں۔ اس صورت حال کا ایک نقصان یہ تھا کہ لوگ غیر قانونی ذرائع سے فارن

ایکسچینج حاصل کرتے اور اپنے پاس رکھتے تھے۔ دوسرا نقصان یہ تھا کہ لوگ باہر سے فارن ایکسچینج مثلاً ڈالر لاتے تو وہ حکومت کو نہیں دیتے تھے، جب کہ حکومت کو ان کی ضرورت ہوتی ہے۔ لہٰذا اس کو قانونی شکل دے کر لوگوں سے فارن ایکسچینج بطور قرض لینے کے لئے جو دستاویز حکومت نے جاری کی اس کو ''فارن ایکسچینج بیرئر سرٹیفکیٹ'' (F.E.B.C) کہتے ہیں ـــــ اس کی شکل یہ ہے کہ حکومت ڈالر لے کر اس وقت کی قیمت کے مطابق پاکستانی روپے کا سرٹیفکیٹ جاری کر دیتی ہے، مثلاً اس وقت ڈالر کی قیمت ۲۵ روپے ہے اور باہر سے آنے والا سو ڈالر لے کر آیا تو حکومت اس سے ڈالر کی قیمت لے کر اس کو دو ہزار پانچ سو روپے کا سرٹیفکیٹ جاری کرے گی، جس کا مطلب یہ ہوگا کہ حکومت حاملِ سرٹیفکیٹ کے لئے پاکستانی ڈھائی ہزار روپوں کی مقروض ہے۔

الیف، ای، بی، سی پر سالانہ ۱۲ فیصد اضافہ ملتا ہے، اور اس کا حامل جب چاہے یہ سرٹیفکیٹ پیش کر کے دوبارہ ڈالر لے سکتا ہے، اور حامل اس سرٹیفکیٹ کو بیچ بھی سکتا ہے۔

یہ تمام سرکاری تمسکات ہیں، ان میں اصل معاملہ تو حکومت اور قرض دہندہ (حاملِ دستاویز) کے درمیان ہوتا ہے، لیکن عوام کی سہولت کے لئے ان کے بیچنے کی بھی گنجائش رکھی گئی ہے (Financial Market) میں ان کی خرید و فروخت ہوتی ہے۔ حاملِ دستاویز جب اس کی بیع کرے گا تو اب وہ دائن نہیں رہے گا، اس کا معاملہ حکومت سے ختم ہو جائے گا اور اب خریدار دائن ہوگا اور حکومت کا معاملہ خریدار سے وابستہ ہو جائے گا۔ شیئرز یا قرضے کی دستاویزات جہاں ان کے جاری کنندہ کے بجائے کسی تیسرے شخص کو فروخت کی جائیں، اس بازار کو ''ثانوی بازار'' (Secondary Market) کہا جاتا ہے۔ جن دستاویزات کا کوئی ثانوی بازار ہو، یعنی وہ کسی تیسرے فریق کو بیچی جا سکتی ہوں، ان کو زیادہ پرکشش سمجھا جاتا ہے اور لوگ روپے کے عوض یہ دستاویزات لینے سے اس لئے زیادہ دلچسپی رکھتے ہیں کہ جب چاہیں گے انہیں ثانوی بازار میں بیچ کر نقد رقم حاصل کر لیں گے۔

کمپنی پر ایک نظر شرعی حیثیت سے!

کمپنی پر ایک نظر شرعی حیثیت سے!

اب تک کمپنی کے بارے میں مروّجہ نظام کا ذکر ہوا ہے۔ کمپنی کی یہ حقیقت معلوم ہونے کے بعد اب اس کی شرعی حیثیت پر گفتگو مناسب ہوگی۔ اس موضوع پر بحث کو دو حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ ایک حصہ اصولی اور بنیادی طور پر کمپنی کے جواز یا عدم جواز کی بحث سے متعلق ہے اور دوسرا حصہ کمپنی سے متعلق جزوی مسائل کا ہے۔

جہاں تک پہلی بحث کا تعلق ہے تو اتنی بات تو پہلے بھی واضح ہو چکی ہے کہ کمپنی کی جو خصوصیات سامنے آئی ہیں، ان کے لحاظ سے کمپنی شرکت کی معروف اقسام میں سے کسی میں داخل نہیں۔ فقہاء نے شرکت کی چار اقسام ذکر کی ہیں، اگر مضاربت کو بھی اس میں شامل کر لیا جائے تو پانچ اقسام بن جاتی ہیں کمپنی کا یہ نظام ان پانچوں میں سے کسی میں بھی بتمام وکمال داخل نہیں، جیسا کہ پہلے شرکت اور کمپنی میں فروق بتائے جا چکے ہیں ـــــ اب یہاں علمائے معاصرین کے تین نقطہ نظر ہیں۔ ایک یہ کہ چونکہ شرعاً شرکت ان پانچ قسموں میں منحصر ہے اور کمپنی ان میں کسی میں بھی بتمام وکمال داخل نہیں، لہٰذا یہ جائز نہیں۔ دوسرا نقطہ نظر یہ ہے کہ محض اس بناء پر کہ کمپنی ان پانچ قسموں میں داخل نہیں اس کو ناجائز نہیں کہا جا سکتا، اس لئے کہ فقہاء کرامؒ نے جو اقسام ذکر کی ہیں وہ منصوص نہیں، بلکہ فقہاء نے شرکت کی مروجہ صورتوں کا استقراء کر کے اس کی روشنی میں تقسیم فرمائی ہے۔ پھر کسی نص میں یا فقہاء کے کلام میں کہیں یہ تصریح نہیں کہ جو صورت ان اقسام سے خارج ہو وہ جائز نہیں ہوگی۔ لہٰذا اگر شرکت کی کوئی صورت ان اقسام میں داخل نہ ہو اور شرکت کے اصول منصوصہ میں سے کسی کے خلاف بھی نہ ہو تو جائز ہوگی۔

تیسرا نقطہ نظر حکیم الامت حضرت تھانویؒ کا ہے۔ انہوں نے فرمایا کہ اپنی حقیقی روح کے اعتبار سے کمپنی شرکت عنان میں داخل ہے۔ (امداد الفتاویٰ ص ۴۹۴ ج ۳)۔ اگرچہ کمپنی کی بعض ایسی خصوصیات ہیں جو معروف شرکت عنان میں نہیں پائی جاتیں، لیکن ان کی وجہ سے عنان کی حقیقت تبدیل نہیں ہوتی۔ اب کمپنی کی شرعی حیثیت پر گفتگو کرنے کے لئے اس کی خصوصیات پر الگ الگ غور کرنا ہوگا کہ وہ شریعت کے مطابق ہیں یا نہیں؟ ان خصوصیات میں سے اکثر انتظامی نوعیت کی ہیں جو شرعاً قابل اعتراض نہیں۔ البتہ کمپنی میں دو چیزیں شرعی اعتبار سے خاص طور پر قابلِ غور اور باعثِ تردّد

ہیں۔ ان امور کے بارے میں احقر اپنی اب تک کی سوچ کا حاصل اہل علم کے غور وفکر کے لئے پیش کرتا ہے۔

۱۔ پہلا مسئلہ یہ ہے کہ شرکت کا الگ سے کوئی قانونی وجود نہیں ہوتا، مگر کمپنی کا اپنا مستقل قانونی وجود ہوتا ہے جس کو شخص قانونی کہا جاتا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ شخص قانونی کا تصور درست ہے یا نہیں؟ــــ جائزہ لینے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ شریعت میں گو شخص قانونی کی اصطلاح موجود نہیں، لیکن اس کے نظائر موجود ہیں۔

''شخص قانونی'' کے نظائر

۱۔ وقف ــــ اس کے لئے اگرچہ شخص قانونی کی اصطلاح استعمال نہیں ہوئی، مگر حقیقت میں یہ ایک شخص قانونی ہے۔ اس لئے کہ وقف مالک ہوتا ہے، مسجد یا وقف کو چندہ دیا جائے تو وہ چندہ یا دیگر عطیات وقف نہیں ہوتے جب تک کہ ان کی وقف ہونے کی تصریح نہ کر دی جائے، بلکہ وقف کے مملوک ہوتے ہیں، اور وقف مالک ہوتا ہے، وقف دائن بھی ہوتا ہے۔ ایسے ہی وقف مدیون بھی ہوتا ہے مثلاً کوئی شخص وقف کا ملازم ہے تو اس کی تنخواہ وقف کے ذمے دین ہے، عدالت میں مقدمہ ہو تو وقف مدعی اور مدعی علیہ بھی ہو سکتا ہے، اور متولی اس کی نمائندگی کرتا ہے۔ مالک ہونا، دائن ہونا، مدیون ہونا یا مدعی علیہ ہونا شخص کے اوصاف میں سے ہے۔ معلوم ہوا کہ وقف میں شخص قانونی کی خصوصیات تسلیم کی گئی ہیں۔ گو فقہاء نے یہ اصطلاح استعمال نہیں کی۔

۲۔ بیت المال ــــ بیت المال سے پوری قوم کا حق تو متعلق نہیں ہے، مگر ہر شخص اس مال میں ملک کا دعویٰ نہیں کر سکتا، اس مال کا مالک بیت المال ہی ہوتا ہے، معلوم ہوا کہ بیت المال بھی ایک شخص قانونی ہے بلکہ فقہاء کی تفصیلات سے معلوم ہوتا ہے کہ بیت المال کی ہر مد ایک مستقل شخص قانونی ہے۔ بیت المال کے دو الگ الگ حصے ہیں۔ بیت المال الصدقہ اور بیت المال الخراج، امام زیلعیؒ نے (۱) مسئلہ لکھا ہے کہ اگر ایک حصے میں مال نہ ہو تو بوقت ضرورت دوسرے حصے سے قرض لیا جا سکتا ہے۔ تو اس صورت میں جس حصے سے قرض لیا گیا وہ دائن اور جس حصے کے لئے لیا گیا وہ مدون ہوگا۔ دائن یا مدیون تو شخص ہوا کرتا ہے، معلوم ہوا کہ بیت المال کو بھی شخص فرض کر لیا گیا ہے۔

۳۔ ترکة مستغرقة بالدین ــــ کسی میت کا سارا ترکہ مدیون سے مستغرق ہو تو اس صورت میں دائنین کا مدیون نہ میت ہے، اس لئے کہ مرنے کے بعد کوئی شخص مدیون نہیں ہوتا اور نہ

(۱) تبیین الحقائق، کتاب السیر، قبیل باب المرتدین ۳: ۲۸۳

ورثاء مدیون ہیں، اس لئے کہ ان کو تو میراث ملی ہی نہیں ۔ لہٰذا یہاں مدیون ترکہ ہوگا جو شخص قانونی ہے۔

۴۔ خلطة الشیوع ــــ یہ نظیر حنفیہ کے مطابق نہیں، بلکہ ائمہ ثلاثہ کے مذہب کے مطابق ہے، ان کے ہاں مالِ زکوۃ کئی شخصوں میں مشاع طور پر مشترک ہو تو زکوۃ انفرادی حصوں پر نہیں، بلکہ مجموعے پر ہوتی ہے۔ معلوم ہوا کہ ائمہ ثلاثہ کے ہاں مجموعہ ایک شخص قانونی ہے ــــ یہاں یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ خلطة الشیوع اور کمپنی کے نظام میں یہ فرق ہے کہ خلطة الشیوع میں ائمہ ثلاثہ کے ہاں مجموعے پر زکوۃ ہوتی ہے، پھر ہر شریک کی انفرادی ملکیت پر زکوۃ نہیں ہوتی، اور کمپنی کے نظام میں کمپنی پر الگ ٹیکس ہوتا ہے اور شیئرز ہولڈرز پر الگ ٹیکس ہوتا ہے۔

ان نظائر سے معلوم ہوتا ہے کہ شخص قانونی کا تصور فی نفسہٖ کوئی ناجائز تصور نہیں ہے، اور نہ فقہ اسلامی کے لئے کوئی اجنبی تصور ہے۔ البتہ یہ اصطلاح نئی ضرور ہے۔

محدود ذمہ داری کی شرعی حیثیت

کمپنی کی دوسری خصوصیت جو شرعی اعتبار سے قابل غور ہے وہ (Limited Liability) یعنی ''محدود ذمہ داری'' ہے جس کی تشریح پیچھے کی جا چکی ہے ــــ اس میں جہاں تک شیئرز ہولڈرز کی محدود ذمہ داری کا تعلق ہے، اس کی تو شرعی نقطہ نظر سے ایک نظیر موجود ہے، اس لئے کہ جب تک رب المال مضارب کو دوسروں سے قرض لینے کی اجازت نہ دے، مضاربت میں بھی رب المال کی ذمہ داری اس کے سرمائے تک محدود ہوتی ہے۔ چنانچہ اگر رب المال نے مضارب کو سرمایہ دیا اور مزید قرض لینے کی اجازت نہیں دی، پھر کاروبار کے نتیجہ میں مضارب پر دیون واجب ہو گئے تو ایسی صورت میں رب المال کا زیادہ سے زیادہ اس کے سرمائے کی حد تک نقصان ہوگا، اس سے زیادہ کا رب المال سے مطالبہ نہیں ہوگا۔ بلکہ اس سے زیادہ کا ذمہ دار مضارب ہوگا، کیونکہ اس نے رب المال کی اجازت کے بغیر قرضے لیے ہیں اس لئے وہی ان کا ذمہ دار ہے۔ ایسے ہی شیئرز ہولڈر جو خود عمل نہ کر رہا ہو تو اس کی ذمہ داری کے محدود ہونے کی شرط مضاربت کے اصول پر صحیح معلوم ہوتی ہے۔ البتہ یہاں یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ تقریباً تمام کمپنیوں کے پراسپکٹس میں یہ بات درج ہوتی ہے کہ کمپنی ضرورت کے مواقع پر بینکوں وغیرہ سے قرض لے سکے گی۔ اور جو لوگ کمپنی کے شیئرز ہولڈرز بنتے ہیں، ان کو یہ بات معلوم ہوتی ہے، لہٰذا جب وہ پراسپکٹس کو دیکھ کر کمپنی کے حصہ دار بنتے ہیں تو ان کی طرف سے گویا معنوی اجازت ہے کہ کاروبار کے لئے قرض لیا جا سکتا ہے، اور جب رب المال مضارب کو قرض کی اجازت

دیدے تو اس کی ذمہ داری محدود نہیں رہتی۔ لیکن اس شبہ کا جواب یہ ہو سکتا ہے کہ پراسپکٹس ہی میں یہ بات بھی درج ہوتی ہے کہ شیئرز ہولڈرز کی ذمہ داری محدود ہوگی جس کا مطلب یہ ہوا کہ حصہ داروں کی طرف سے کمپنی کو قرض لینے کی اجازت اس شرط کے ساتھ ہوتی ہے کہ ہم پر ان قرضوں کی ذمہ داری لگائے ہوئے سرمائے سے زیادہ نہ ہو۔ لہٰذا اس کی صحیح نظیر یہ ہے کہ رب المال مضارب کو اس شرط کے ساتھ قرض لینے کی اجازت دے کہ اس کی ذمہ داری وہ خود برداشت کرے۔

لیکن یہاں شرعی نقطہ نظر سے اصل اشکال یہ ہے کہ مضاربت میں رب المال کی ذمہ داری تو محدود ہوتی ہے، مگر مضارب کی ذمہ داری محدود نہیں ہوتی، لہٰذا دائنین رب المال کے سرمائے سے زائد دیون مضارب سے وصول کر سکتے ہیں۔ چنانچہ دائنین کا ذمہ خراب نہیں ہوتا۔ لیکن کمپنی میں ڈائریکٹران کی ذمہ داری بھی محدود ہے اور خود کمپنی جو شخص قانونی ہے اس کی ذمہ داری بھی محدود ہے، جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ کمپنی کے اثاثوں سے زائد دائنین کا جو دین ہوگا اس کی وصولیابی کی کوئی صورت نہیں رہے گی، دائنین کا ذمہ خراب ہو جائے گا، ''خراب الذمة'' فقہاء کی اصطلاح ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ دائن کا دَین ادا ہونے کی کوئی صورت نہ رہے۔

اسی اشکال کی بناء پر بعض علمائے عصر کی رائے یہ ہے کہ محدود ذمہ داری کا تصور شرعاً صحیح نہیں، اس لئے کہ اس سے لوگوں کے حقوق ضائع ہوتے ہیں۔ کم از کم ڈائریکٹران کی ذمہ داری غیر محدود ہونی چاہیے۔ لیکن اس مسئلہ کو اگر دوسرے زاویئے سے دیکھا جائے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ کمپنی کی محدود ذمہ داری کے تصور کی بنیاد دراصل شخص قانونی کے تصور پر ہے۔ شخص قانونی کو حقیقت ماننے کے بعد محدود ذمہ داری کو ماننا مشکل نہیں رہتا۔ شخص حقیقی مفلس (دیوالیہ) ہو جائے تو دائنین صرف اس کے اثاثوں سے دین وصول کر سکتے ہیں، اس سے مزید کا مطالبہ نہیں کر سکتے۔ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کی تفلیس فرمانے کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دائنین کو فرمایا تھا ''خذوا ما وجدتم، ليس لكم الا ذلك''[1] البتہ اگر وہ دوبارہ غنی ہو جائے تو اب پھر مطالبہ کیا جا سکتا ہے، لیکن اگر مفلس ہونے کی حالت میں اس کی موت واقع ہو جائے تو ''خراب الذمہ'' ہو جاتا ہے، ان کے دیون ادا ہونے کی صورت نہیں رہتی۔ معلوم ہوا کہ شخص حقیقی اگر مفلس ہو کر مر جائے تو اس کی ذمہ داری اثاثوں تک محدود ہوتی ہے اور دائنین کا ذمہ خراب ہو جاتا ہے۔ جب کمپنی کو بھی شخص مان لیا گیا ہے تو یہ بھی اگر دیوالیہ ہو کر تحلیل ہو جائے تو اس کی ذمہ داری بھی اثاثوں تک محدود ہونی چاہیے، اس لئے کہ کمپنی کا تحلیل ہو جانا ہی اس شخص قانونی کی موت ہے۔

(۱)　صحیح مسلم ص ۲۱۹ ج ۱۰ ادارۃ القرآن کتاب باب وضع الجوائح

خصوصاً جب کہ کمپنی کے ساتھ معاملہ کرنے والا یہ دیکھ کر معاملہ کرتا ہے کہ یہ کمپنی لمیٹڈ ہے، میرا حق صرف اثاثوں کی حد تک محدود ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ لمیٹڈ کمپنی کے ساتھ لمیٹڈ لکھنا ضروری ہوتا ہے۔ پھر کمپنی کی بیلنس شیٹ بھی شائع ہوتی رہتی ہے۔ قرض دینے والا بیلنس شیٹ کے ذریعے سے کمپنی کا مالی استحکام دیکھ کر قرض دیتا ہے۔ غرضیکہ جو شخص بھی لمیٹڈ کمپنی سے معاملہ کرتا ہے وہ علیٰ بصیرۃ کرتا ہے اس میں کسی قسم کا فراڈ یا دھوکہ نہیں ہوتا۔ اس لئے اکثر علماء عصر کی رائے یہی ہے کہ محدود ذمہ داری کے تصور کی وجہ سے شرکت کو فاسد نہیں کہا جا سکتا ہے۔

لمیٹڈ کمپنی کی فقہی نظیر

فقہ میں لمیٹڈ کمپنی کی ایک نہایت دلچسپ نظیر موجود ہے، جو لمیٹڈ کمپنی سے بہت ہی قریب ہے۔ وہ ''عبدماذون فی التجارۃ'' ہے، یہ اپنے آقا کا مملوک ہوتا ہے اور اس کو آقا کی طرف سے تجارت کی اجازت ہوتی ہے، جو تجارت وہ کرتا ہے وہ بھی مولیٰ کی مملوک ہوتی ہے۔ اس پر اگر دیون واجب ہوں تو وہ اس غلام کی قیمت کی حد تک محدود ہوں گے۔ اس سے زیادہ کا نہ غلام سے مطالبہ ہو سکتا ہے نہ ہی مولیٰ سے۔ یہاں بھی دائنین کا ذمہ خراب ہو گیا۔ یہ نظیر لمیٹڈ کمپنی سے زیادہ قریب اس لئے ہے کہ جیسے کمپنی میں شیئرز ہولڈرز کے زندہ ہوتے ہوئے ذمہ خراب ہو جاتا ہے، ایسے ہی یہاں مولیٰ کے زندہ ہوتے ہوئے دائنین کا ذمہ خراب ہو جاتا ہے۔

کمپنی کے چند جزوی مسائل

(Under Writing) کی شرعی حیثیت

"ضمان الاکتتاب" (Under Writing) کی تشریح شروع میں گذر چکی ہے کہ اس میں کوئی ادارہ نئی قائم ہونے والی کمپنی کے لئے یہ ضمانت لیتا ہے کہ اگر اس کے جاری کردہ شیئرز لوگوں نے نہ لیے تو وہ خود لے لے گا اور اس کی ضمانت پر اجرت وصول کرتا ہے۔ اس میں دو باتیں قابل غور ہیں۔ ایک یہ کہ Under Writer جو ضمانت لیتا ہے اس کی حیثیت کیا ہے؟ یہ ضمانت فقہی نقطہ نظر سے ضمان یا کفالت نہیں ہے، اس لئے کہ کفالت یا ضمانت تو ایسے دین کے بارے میں ہوتی ہے جو واجب ہو۔ شیئرز لینا واجب نہیں اس لئے شیئرز لینے کا ضامن بننا ضمانت یا کفالت نہیں، بلکہ ایک وعدہ ہے یا مالکیہ کی اصطلاح میں اس کو التزام کہا جا سکتا ہے۔ (التزام، اپنے اوپر کسی چیز کو لازم کر لینا، یہ

مالکیہ کے ہاں ایک مستقل باب ہے)اور وعدہ حنفیہ کے ہاں دیانۃً لازم ہوتا ہے قضاءً لازم نہیں ہوتا، البتہ مالکیہ کے ہاں بعض صورتوں میں لازم ہو جاتا ہے۔لہٰذا زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ مالکیہ کا قول اختیار کرتے ہوئے یہ وعدہ لازم ہوگا۔

دوسرا مسئلہ کمیشن کا ہے جو (Under Writing) پر لیا جاتا ہے۔اس کمیشن کے لینے کے جواز کی کوئی صورت نہیں، اس لئے کہ یہ کمیشن بلاعوض ہے جو فقہ میں رشوت کہلاتا ہے، جب وہ شیئرز لے گا تو کمپنی کا شریک بن جائے گا اور شریک بننے پر رقم لینے کا کوئی جواز نہیں۔تاہم چند باتیں ایسی ہیں جن پر Under Writer اجرت لے سکتا ہے۔ مثلاً ضمان الاکتتاب سے پہلے ضمانت دینے والے کو کمپنی کے بارے میں کئی چیزوں کا جائزہ لینا پڑتا ہے، مثلاً کمپنی کیا کاروبار کرے گی، کون لوگ کمپنی کو لے کر چلیں گے، نفع نقصان کے کیا امکانات ہیں، اس کو ''دراسات'' (Studies) کہتے ہیں۔ضمانت دینے والا ان دراسات کا حقیقی خرچ لے سکتا ہے۔ایسے ہی اس ضمانت کے انداز کو تبدیل بھی کیا جا سکتا ہے۔ وہ اس طرح کہ بینک اس بات کی ضمانت کی بجائے کہ میں حصے خریدلوں گا اس بات کا معاہدہ کرے کہ جو شیئرز نہیں خریدے جائیں گے میں ان کے خریدار مہیا کردوں گا۔ یہ ایسا عمل ہے جو سمسرہ کے قبیل سے ہے۔اس پر اجرت لینا جائز ہے۔اس تبدیلی میں کوئی خاص عملی مشکل بھی نہیں، اس لئے کہ مروجہ صورت میں بھی بینک عملاً یہی کرتا ہے کہ شیئرز اپنے پاس نہیں رکھتا، بلکہ دوسرے لوگوں کو بیچ دیتا ہے۔

واضح رہے کہ بعض معاصرین نے ضمان الاکتتاب (Under Writing) پر اجرت لینے کے لئے یہ تجویز پیش کی ہے کہ ضامن الاکتتاب (Under Writer) کو اجرت دینے کے بجائے اس کو حصے کم قیمت پر فروخت کر دیئے جائیں، مثلاً دس روپے کا حصہ ساڑھے نو روپے میں دیدیا جائے، لیکن درحقیقت یہ صورت بھی شرعاً جائز نہ ہوگی، کیونکہ حصہ لینے کا مطلب کمپنی کے ساتھ شرکت قائم کرنا ہے، اور اگر دس روپے کا حصہ ساڑھے نو روپے میں دیا جائے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ضامن ساڑھے نو روپے میں دس روپے کے اثاثوں کا مالک بن جائے گا جو شرکت کے آغاز میں جائز نہیں ہے۔

شیئرز کی شرعی حیثیت اور ان کی خرید و فروخت

بعض علمائے معاصرین (جو بہت کم ہیں) کی رائے یہ ہے کہ یہ شیئر کمپنی کے اثاثوں میں شیئر ہولڈر کی ملکیت کی نمائندگی نہیں کرتا ہے، بلکہ یہ محض اس بات کی دستاویز ہے کہ اس شخص نے اتنی رقم

کمپنی کو دے رکھی ہے، جیسے دیگر قرضوں کی دستاویزات ہوتی ہیں، جیسے بانڈز وغیرہ، ایسے ہی یہ بھی ایک شہادت اور دستاویز ہے۔ صرف اتنا فرق ہے کہ بانڈز وغیرہ پر معین شرح سے سود ہوتا ہے اور شیئرز پر سود کی شرح معین نہیں ہوتی، بلکہ کمپنی کو جو نفع ہوتا ہے، اسی کا ایک متناسب حصہ اس کو دیدیا جاتا ہے، اگر شیئر کمپنی کے اثاثوں میں ملکیت کی نمائندگی کرنے والا ہوتا تو شیئر ہولڈر کے دیوالیہ ہونے کی صورت میں جہاں اس کی دوسری املاک کی قرقی ہوتی ہے، کمپنی میں اس کی متناسب ملکیت کی بھی قرقی ہونی چاہئے، مگر نہیں ہوتی، معلوم ہوا کہ کمپنی کے اثاثوں میں شیئر ہولڈر کی ملکیت نہیں ہوتی۔

اس نقطہ نظر کی بناء پر نہ شیئر لینا جائز ہے اور نہ اس کو کم وبیش پر آگے بیچنا اور خریدنا جائز ہے اور چونکہ شیئر ہولڈر کی اثاثوں میں ملکیت نہیں، اس لئے ان کے ہاں زکوۃ بھی واجب نہیں ہوگی۔

اس نقطہ نظر پر کافی غور کیا گیا، لیکن یہ بات صحیح معلوم نہیں ہوتی ہے، کمپنی کے ظاہری تصور کے اعتبار سے اور اس موضوع پر جو کتابیں لکھی گئی ہیں ان کی روشنی میں واقعتاً یہ سمجھا جاتا ہے کہ شیئر ہولڈر کی کمپنی کے اثاثوں میں متناسب ملکیت ہوتی ہے، یہی وجہ ہے کہ اگر باہمی قرارداد سے کمپنی تحلیل ہو جائے تو شیئر ہولڈرز کو صرف ان کی لگی ہوئی رقم واپس نہیں ملتی، بلکہ کمپنی کے اثاثوں میں متناسب حصہ ہر شیئر ہولڈر کو دیا جاتا ہے۔ جب کہ دوسری مالی دستاویزات مثلاً بانڈز وغیرہ پر کمپنی تحلیل ہونے کی صورت میں صرف لگی ہوئی رقم مع سود واپس کردی جاتی ہے۔ جس سے معلوم ہوا کہ شیئر محض قرضے کی شہادت نہیں، بلکہ یہ شیئرز کمپنی کے اثاثوں میں شیئر ہولڈرز کی متناسب ملکیت کی نمائندگی کرتے ہیں۔

شیئرز کی حقیقت واضح ہو جانے کے بعد معلوم ہوا کہ شیئرز اپنی ذات میں کوئی چیز نہیں، بلکہ اس کی پشت پر جو املاک اور اثاثے ہیں وہ اصل چیز ہیں، لہٰذا شیئرز کی خرید وفروخت دراصل کمپنی کے اثاثوں میں سے متناسب ملکیت کی خرید وفروخت ہے۔ اور کمپنی کے اثاثے مختلف صورتوں میں ہوتے ہیں۔ نقد، قابل وصول دیون، جامد اثاثے، سامانِ تجارت وغیرہ، اور ہر قسم میں شیئرز ہولڈرز کا متناسب حصہ ہوتا ہے، لہٰذا شیئر کی فروختگی کا مطلب یہ ہے کہ نقد، دیون، جامد اثاثوں اور اموالِ تجارت میں سے ہر ایک میں اپنی متناسب ملکیت کو فروخت کر رہا ہے۔ شیئر کی خرید وفروخت کی اس حیثیت کے مطابق شیئر کی خرید وفروخت کی شرائط وتفصیلات یہ ہیں۔

شیئرز کی بیع وشراء کی شرائط

۱۔ شیئرز کی کم وبیش پر خرید وفروخت کے جواز کی ایک شرط یہ ہے کہ کمپنی کے اثاثے صرف نقد اور دیون کی شکل میں ادا ہوں گے۔ اگر کمپنی نے ابھی تک کسی قسم کے جامد اثاثے (مثلاً بلڈنگ، مشینری

وغیرہ) یا سامانِ تجارت نہیں خریدے بلکہ اس کے پاس صرف نقود ہیں یا کسی کے ذمے دیون ہیں تو اس صورت میں شیئر کی بیع وشراء اس کی قیمت اسمیہ (Face Value) سے کم وبیش جائز نہیں۔ اس لئے کہ اب شیئر صرف نقد کی نمائندگی کر رہا ہے۔ مثلاً دس روپے کا شیئر صرف دس روپے کی نمائندگی کر رہا ہے، اگر اس کو گیارہ روپے میں فروخت کیا جائے گا تو دس روپے کی بیع گیارہ روپے کے ساتھ ہوئی جو کہ نا جائز ہے۔

جب نقود کے علاوہ کمپنی کے دیگر اثاثے بھی وجود میں آجائیں تو اب اس کے اثاثے مخلوط ہو گئے، اس میں نقود اور غیر نقود دونوں شامل ہیں۔ اب شیئرز کی بیع کا مطلب یہ ہے کہ کمپنی کے اثاثوں میں ہر ایک کے متناسب حصے کی بیع ہو رہی ہے۔ اس مسئلے کا مدار اب ''مدعجوۃ'' کے مسئلہ پر ہوگا۔ ''مدعجوۃ'' امام ابوحنیفہؒ اور امام شافعیؒ کے درمیان ایک اختلافی مسئلے کا عنوان ہے۔ جس کو ''سیف محلی'' اور ''منطقہ مفضہ'' سے بھی تعبیر کرتے ہیں۔ اس مسئلے کا حل یہ ہے کہ ایسے مال کو جو مال ربوی اور غیر ربوی سے مخلوط ہو خالص مال ربوی سے بیچا جائے۔ جیسے تلوار پر سونا لگا ہوا ہو تو تلوار غیر ربوی اور سونا ربوی ہے اس کی بیع دنانیر سے ہو تو اس کی خرید وفروخت کا کیا حکم ہے؟ اس میں اختلاف ہے۔ امام شافعیؒ کے ہاں مخلوط کی خالص مالِ ربوی سے بیع جائز نہیں، جب تک کہ مخلوط سے مال ربوی کو الگ نہ کر لیا جائے۔ امام ابوحنیفہؒ کے ہاں یہ بیع جائز ہے بشرطیکہ خالص مالِ ربوی مخلوط میں شامل مال ربوی سے زیادہ ہو۔ مالِ ربوی کے مقابلہ میں مالِ ربوی ہوگا اور زائد خالص مالِ ربوی غیر ربوی کے مقابلے میں ہوگا، البتہ بعض شافعیہ اور حنابلہ کا موقف یہ ہے کہ اگر مخلوط میں اکثر مالِ ربوی ہو تو خالص مالِ ربوی سے بیع نا جائز ہے، اور اگر مخلوط میں غیر ربوی مال زیادہ اور مالِ ربوی کم ہو تو خالص مالِ ربوی سے بیع جائز ہے

بالکل یہی صورت حال یہاں ہے کہ نقود وغیر نقود کی بیع صرف نقود سے ہو رہی ہے، لہٰذا امام شافعیؒ کی رائے کے مطابق ایسی حالت میں شیئرز کی بیع جائز نہیں۔ اور بعض شافعیہ اور حنابلہ کے موقف کے مطابق اگر کمپنی کے اثاثے زیادہ ہیں اور نقود کم ہیں تو شیئر کی بیع جائز ہوگی۔ اور اگر نقود زیادہ اور دیگر اثاثے کم ہیں تو شیئرز کی بیع نا جائز ہوگی۔

آج کل علمائے عرب میں سے اکثر یہی فتویٰ دے رہے ہیں۔ اس کی رو سے شیئرز خریدنے سے پہلے کمپنی کے اثاثوں کا جائزہ لینا ضروری ہوگا کہ نقود زیادہ ہیں یا غیر نقود زیادہ ہیں ـــــ لیکن حنفیہ کے ہاں اس تحقیق کی ضرورت نہیں۔ جب یہ تحقیق ہو جائے کہ کمپنی کے کچھ اثاثے غیر نقد بھی ہیں تو اب لکھی ہوئی قیمت (Face Value) سے زیادہ پر بیع وشراء جائز ہوگی۔ البتہ ہر شیئر کے حصے میں

کمپنی کے نقود اور دیون کی جتنی مقدار آئی ہے، اگر شیئر کی کل قیمت اس کے برابر یا اس سے کم ہو تو بیع جائز نہ ہوگی۔ مثلاً دس روپے کے حصے میں اگر آٹھ روپے نقود و دیون کے مقابل ہیں، اور دو روپے جامد اثاثوں کے مقابل، تو شیئر کی بیع آٹھ روپے یا اس سے کم میں جائز نہ ہوگی، البتہ نو روپے یا اس سے زائد میں جائز ہوگی۔

۲۔ شیئرز کی خرید و فروخت کے جواز کے لئے یہ بھی شرط ہے کہ کمپنی حلال کام کرتی ہو۔ اگر کمپنی کا اصل کاروبار ہی حرام ہو تو اس کے شیئرز لینا جائز نہیں۔ مثلاً کوئی کمپنی شراب کا کاروبار کرتی ہو یا کمپنی کا اصل کاروبار ہی سود ہو جیسے بینک وغیرہ۔

۳۔ بعض اوقات یہ صورت ہوتی ہے کہ کمپنی اصلاً تو حلال کاروبار ہی کرتی ہے، مگر کسی نہ کسی طرح سود میں ملوث ہو جاتی ہے۔ مثلاً بینک سے سود پر قرضہ لیتی ہے، یا زائد رقم بینک میں رکھوا کر اس پر سود لیتی ہے۔ یہ کمپنی کا اصل کاروبار نہیں، بلکہ ایک ذیلی اور ضمنی کام ہے۔ آج کل بیشتر کمپنیاں اسی نوعیت کی ہیں۔ ایسی کمپنیوں کے شیئرز لینے کا کیا حکم ہے؟ اس میں علمائے عصر کا اختلاف ہے۔ بعض علماء کا نقطہ نظر یہ ہے کہ سودی کاروبار کمپنی اصلاً کر رہی ہو یا تبعاً، سودی کاروبار کم ہو یا زیادہ، ہر صورت میں چونکہ سودی کاروبار کر رہی ہے اور اگر کوئی شخص کمپنی کا شیئر لیتا ہے تو یہ کمپنی کو سودی کاروبار کا وکیل بنا رہا ہے لہٰذا کمپنی کا سودی لین دین اس کی طرف بھی منسوب ہوگا اس لئے جو کمپنی کسی نہ کسی طرح سودی لین دین میں ملوث ہو اس کے شیئرز لینا جائز نہیں خواہ اس کا حقیقی کاروبار درست ہو ـــــ لیکن صحیح یہ معلوم ہوتا ہے کہ کمپنی کے سودی لین دین کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ کمپنی قرضہ لے اور اس پر سود ادا کرے۔ اس صورت میں کمپنی کی آمدنی میں کوئی حرام عنصر شامل نہیں ہوا، اس لئے کہ جب کوئی شخص سود پر قرضہ لے تو یہ فعل تو حرام اور سخت گناہ ہے، مگر وہ قرض کا مالک بن جائے گا، اس کے ساتھ کاروبار کر کے جو آمدنی حاصل ہوگی وہ بھی حلال ہوگی۔ اس صورت میں زیادہ سے زیادہ اشکال یہ ہو سکتا ہے کہ کمپنی چونکہ اس شیئر ہولڈر کی وکیل ہے، اس لئے سودی قرضے کی نسبت اس کی طرف بھی ہوگی اور اس کو سودی قرضے لینے پر رضامند سمجھا جائے گا۔ اس کا جواب حکیم الامت حضرت تھانویؒ نے یہ دیا ہے کہ شیئر ہولڈر کسی طرح یہ آواز اٹھا دے کہ میں سودی کاروبار پر راضی نہیں ہوں تو اس کی ذمہ داری ختم ہو جائے گی۔ کمپنی کے ذمے داران کی طرف اس مضمون کا خط لکھ دینا بھی کافی ہو سکتا ہے[1] (آج کل اس کی بہتر صورت یہ ہے کہ سالانہ جمعیت (A.G.M) میں اس کی آواز اٹھائی جائے۔) اس پر بھی اشکال ہو سکتا ہے جو حضرتؒ نے ذکر نہیں فرمایا وہ یہ کہ کمپنی کے ذمہ داران کی شرکت کی وجہ سے اس

(۱) امداد الفتاوی، ج ۳، ص ۴۹۱۔

کے وکیل تو بہر حال ہیں اور یہ معلوم ہے کہ جو آواز اٹھائی جارہی ہے اس پر عمل نہیں ہوگا تو وکالت کے ہوتے ہوئے ایسی غیر موثر آواز اٹھانے سے وہ بری الذمہ کیسے ہوسکتا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ کمپنی میں جو وکالت ہے یہ اس وکالت سے مختلف ہے جو شرکت (Partner Ship) میں ہوتی ہے۔ شرکت میں ہر شریک کی وکالت اس درجے قوی ہوتی ہے کہ ایک شریک بھی اگر کسی کاروبار سے اختلاف کردے تو وہ کاروبار نہیں کیا جاسکتا۔ شرکت میں فیصلے اتفاق رائے سے ہوتے ہیں۔ جب کہ کمپنی میں وکیل اور موکل کا رشتہ اس درجہ قوی نہیں ہوتا کہ ایک شیئر ہولڈر بھی اختلاف کردے تو فیصلہ نہ ہو پائے۔ کمپنی میں فیصلے اتفاق رائے سے نہیں ہوتے ہیں اور نہ اتفاق رائے سے کام چلانا ممکن ہے، یہاں فیصلے کثرتِ رائے سے ہوتے ہیں۔ اب جہاں فیصلے کثرتِ رائے سے ہوتے ہوں وہاں کوئی شخص سودی لین دین کے خلاف آواز اٹھائے، مگر اقلیت میں ہونے کی وجہ سے اس پر عمل نہ ہو اور سودی لین دین بدستور قائم رہے تو یہ نہیں کہا جاسکتا کہ یہ سودی لین دین اس کے خلاف آواز اٹھانے والے کی وکالت اور رضامندی سے ہو رہا ہے ___ لہٰذا صحیح یہ معلوم ہوتا ہے کہ جب کمپنی کا اصل کاروبار تو جائز ہو اور ضمناً بھی وہ سود پر قرضہ لیتی ہو تو اس کے شیئر لینا جائز ہے، بشرطیکہ سود سے براءت کی آواز اٹھا دی جائے۔

کمپنی کے سودی لین دین کی دوسری صورت یہ ہے کہ کمپنی قرضہ دے کر سود لے، جیسا کہ آج کل بیشتر کمپنیاں زائد رقم بینکوں کے سیونگ اکاؤنٹ میں رکھوا کر اس پر سود لیتی ہیں۔ یہاں دو اشکال ہیں۔ ایک یہ کہ سودی معاملے میں شیئر ہولڈر کی بھی شرکت ہو جائے گی۔ اس کا حل تو وہی ہے جو اوپر مذکور ہوا۔ دوسرا اشکال یہ ہے کہ کمپنی جو منافع (Dividend) تقسیم کرے گی اس میں سود بھی شامل ہوگا آمدنی کا جو حصہ سود سے حاصل ہوا وہ حرام ہے۔ اس کے بارے میں حضرت تھانویؒ نے دو باتیں ارشاد فرمائی ہیں۔ ایک یہ کہ ہمیں ہر کمپنی کے بارے میں یقین سے معلوم نہیں کہ اس نے سود لیا ہے، تعمق کے ہم مامور نہیں۔ دوسری بات یہ کہ اگر بالفرض سود لیا بھی ہو تو وہ قلیل ہے جو مالِ حلال میں مخلوط ہو گیا ہے۔ مالِ مخلوط میں اکثر حلال ہو تو اس کے استعمال کی گنجائش ہوتی ہے

لیکن اس پر یہ اشکال رہتا ہے کہ کوئی شخص مالِ مخلوط میں سے ہدیہ دے اور حرام حصہ اس مال مخلوط میں کم ہو تو ہدیہ لینا اس لئے جائز ہے کہ یہ سمجھا جائے گا کہ یہ حلال میں سے دے رہا ہے، لیکن کمپنی کے نفع (Dividend) کی صورت اس سے مختلف ہے، اس لئے کہ کمپنی کو جتنی مدات سے آمدنی حاصل ہوئی ہر مد کی آمدنی کا ایک متناسب حصہ اس نفع (Dividend) میں شامل ہوتا ہے۔ لہٰذا سود کا ایک متناسب حصہ بھی نفع (Dividend) میں شامل ہے۔ اگر کمپنی کی آمدنی کا دس فیصد حصہ

سودی اکاؤنٹ سے حاصل ہوا ہے تو نفع (Dividend) کا بھی دس فیصد حصہ سودی ہوگا۔لہٰذا نفع (Dividend) کا جتنا حصہ سودی ہے اس کا بلانیت ثواب صدقہ کرنا لازمی ہوگا۔ یہ بات کہ آمدنی کا کتنا حصہ سودی ہے، کمپنی کے (Income Statements) سے معلوم کی جاسکتی ہے۔اگر اس میں اس کی وضاحت نہ ہو تو کمپنی کے ذمے داران سے معلوم بھی کیا جاسکتا ہے۔

خلاصہ یہ کہ کسی کمپنی کے شیئرز کی خرید وفروخت کی چار شرائط ہوئیں۔

۱۔ کمپنی کا اصل کاروبار حلال ہو۔

۲۔ قیمت اسمیہ (Face Value) سے کم وبیش پر بیچنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ کمپنی کے اثاثے صرف نقد کی شکل میں نہ ہوں۔

۳۔ سود کے خلاف آواز اٹھائے۔

۴۔ کمپنی کی آمدنی میں سود شامل ہو تو نفع کی اتنی مقدار صدقہ کردے۔

شیئرز سے تجارت (Capital Gain) کا حکم

شیئرز کی خرید وفروخت پر جو گفتگو اب تک کی گئی ہے یہ اس صورت میں ہے جب کہ شیئرز خریدنے والے کا مقصد کمپنی کا حصہ دار بن کر سرمایہ کاری کرنا ہی ہو۔اگر خریدار کا مقصد سرمایہ کاری نہ ہو، بلکہ اس ارادے سے خریدے کہ اس کی قیمت بڑھے گی تو فروخت کرکے نفع کماؤں گا۔ اس طریقے سے شیئرز کی خرید وفروخت کا کیا حکم ہے؟ اس میں بھی دو نقطۂ نظر ہیں۔فقہ خصوصاً فقہ المعاملات میں مہارت رکھنے والے عالم اسلام کے معروف عالم شیخ محمد صدیق الضریر کی رائے یہ ہے کہ اس طریق کار کی بنیاد محض تخمین اور قیاس آرائیوں پر ہے جس کو (Speculation) کہتے ہیں، اس لئے جائز نہیں۔ان کا کہنا یہ ہے کہ قیاس آرائیوں کی بنیاد پر خرید وفروخت کی اجازت دینا سٹہ بازی کا راستہ کھولنا ہے۔ان کے ہاں شیئرز خریدنا صرف اس صورت میں جائز ہوگا، جب کہ خریدار کمپنی کے نفع، نقصان میں شریک ہوکر سرمایہ کاری کے لئے خرید رہا ہو۔

اصولی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ اصل سوال یہ نہیں کہ خریدار کس ارادے اور نیت سے خرید رہا ہے۔اصل سوال یہ ہے کہ شیئرز فی نفسہٖ بیع وشراء کے قابل ہیں یا نہیں؟ جب یہ بات تسلیم کرلی گئی کہ شیئرز قابل بیع وشراء ہیں، شیئرز کی بیع دراصل کمپنی کے اثاثوں میں متناسب حصے کی بیع ہے تو خرید وفروخت جائز ہوگی خواہ کسی بھی نیت سے ہو۔خواہ شیئرز اپنے پاس رکھ کر سرمایہ داری کے لئے ہو یا قیمت بڑھنے پر بیچ کر نفع کمانے کے لئے ہو۔کسی چیز کو قابل بیع وشراء

ماننے کے بعد محض نیت کی بنیاد پر جواز وعدم جواز کی تفریق کی کوئی فقہی وجہ نہیں ۔ ہاں ! البتہ بیع وشراء کی شرعی شرائط کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے ۔ اور ان شرائط کی رعایت کرنے سے سٹہ بازی کا سد باب خود ہی ہو جائے گا۔

یہ بات مشہور ہو گئی ہے کہ تخمین و قیاس آرائی جس کو (Speculation) کہا جاتا ہے، بذاتِ خود حرام ہے، یہ بات غلط ہے۔ تخمین (Speculation) یہ ہے کہ یہ اندازہ لگایا جائے کہ کس چیز کی قیمت کم ہو رہی ہے ۔ جس چیز کی قیمت کم ہونے کا اندیشہ ہو اس کو بیچ دیا جائے اور جس چیز کی قیمت بڑھنے کی امید ہو اس کو رکھا جائے ۔ یہ بات بذات خود ممنوع نہیں، یہ تو ہر تجارت میں ہوتی ہے ۔ جو بات ممنوع ہے وہ یہ ہے کہ بیع وشراء کی شرعی شرائط کی رعایت نہ کی گئی ہو، مثلاً غیر مملوک کی بیع یا غیر مقبوض کی بیع کی جارہی ہو یا قمار کی شکل بن رہی ہو ۔ قمار دو باتوں سے مل کر بنتا ہے ۔ ایک یہ کہ ایک طرف سے ادائیگی متعین ہو اور دوسری طرف سے موہوم ہو ۔ دوسری بات یہ کہ جس طرف سے ادائیگی ہوگئی ہے اس کی رقم دو باتوں میں دائر ہو ۔ یا تو یہ رقم خود بھی ڈوب جائے گی یا اور رقم کو کھینچ کر لائے گی۔

اس تفصیل کی روشنی میں شیئرز کی بیع وشراء کی جزئیات پر غور کیا جائے تو درج ذیل مسائل سامنے آتے ہیں ۔

۱۔ پہلے بتایا جا چکا ہے کہ کمپنیوں کے وجود میں آنے سے پہلے ہی سٹاک ایکسچینج میں ان کی لسٹنگ ہو جاتی ہے ۔ ایسی (Provisionally Listed) کمپنی کے شیئرز کی بیع وشراء جائز نہیں، اس لئے کہ شیئرز کی بیع دراصل کمپنی کے اثاثوں کی بیع ہوتی ہے اور یہاں ابھی کمپنی کی ملکیت میں اثاثے ہیں ہی نہیں ۔ لہٰذا یہ غیر مملوک کی بیع ہے جو جائز نہیں ہے، عملاً ایسے شیئرز کی بیع وشراء اسٹاک ایکسچینج میں ہوتی ہے ۔ ایسی بھی مثالیں موجود ہیں کہ ایک کمپنی کے وجود میں آنے سے پہلے ہی اس کا دس روپے کا شیئر ۱۸۰ روپے تک میں فروخت ہوا۔

۲۔ (Future Sales) یعنی شیئرز کی ایسی بیع وشراء کہ شیئر لینا دینا مقصود نہ ہو، محض نقصان برابر کر کے نفع کمانا ہو تو یہ بھی شرعاً جائز نہیں ہے۔

۳۔ غائب سودے جن میں بیع کی اضافت مستقبل کی طرف کی جاتی ہے وہ بھی شرعاً جائز نہیں ۔ اس لئے کہ بیع کی وقتِ مستقبل کی طرف اضافت یا تعلیق باتفاق فقہاء ناجائز ہے ۔ البتہ مستقبل میں بیع کا وعدہ کیا جا سکتا ہے لیکن وقت آنے پر بیع باقاعدہ کرنی ہوگی۔

۴۔ حاضر سودے میں بھی شیئرز کا قبضہ بعض انتظامی مجبوریوں کی بناء پر ایک سے تین ہفتوں تک

تاخیر سے ہوتا ہے، حاضر سودا ہو جانے کے بعد شیئرز وصول کرنے سے پہلے ان کی آگے بیع کرنا جائز ہے یا نہیں؟ اس کا دارومدار اس پر ہے کہ یہ معلوم ہو کہ یہ بیع قبل القبض ہے یا نہیں؟ اگر بیع قبل القبض ہے تو جائز نہیں، ورنہ جائز ہے۔ یہ فیصلہ کرنے کے لئے کہ یہ بیع قبل القبض ہے یا نہیں پہلے یہ معلوم کرنا ہوگا کہ شیئر کا قبضہ کس چیز کو کہیں گے؟ جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے، ''شیئر'' درحقیقت کمپنی کی املاک میں متناسب حصہ داری کا نام ہے، اور ''شیئر سرٹیفکیٹ'' درحقیقت اس حصہ داری کا تحریری ثبوت ہے، لہٰذا مبیع وہ تحریری ثبوت نہیں، بلکہ کمپنی کی املاک کا ایک مشاع حصہ ہے، یہ مشاع حصہ بیع کی تکمیل ہوتے ہی مشتری کی طرف منتقل ہو جاتا ہے، چونکہ وہ حصہ مشاع ہے، اس لئے اس پر حسی قبضہ تو ہو نہیں سکتا، لہٰذا اس میں معنوی قبضہ ہی معتبر ہونا چاہیے۔ اب دو صورتیں ہیں، یا تو یوں کہا جائے کہ معنوی قبضہ اس وقت ہوگا جب سرٹیفکیٹ ہاتھ میں آ جائے، یا پھر یوں کہا جائے کہ جس وقت وہ مشاع حصہ مشتری کے ضمان میں آ جائے اس وقت معنوی قبضہ متصور ہوگا۔ اس بات کو طے کرنے کے لئے بیع قبل القبض کی حقیقت معلوم کرنا ضروری ہے۔ بیع قبل القبض کی ممانعت کا مدار دو وجوں پر ہے۔[1] قبضے سے پہلے مبیع مقدور التسلیم نہیں ہوتا، لہٰذا یہ بات یقینی نہیں ہے کہ وہ مشتری کو ضرور قبضہ کرا دے گا، یہ غرر ہے، جس کی بناء پر بیع جائز نہیں۔ بیع کی بہت سی صورتیں ایسی بھی ہوتی ہیں کہ ان میں یہ غرر کی وجہ نہیں پائی جاتی۔ باوجود اس کے کہ مبیع حساً مقبوض نہیں لیکن حکماً وہ مشتری کے تصرف میں آ جاتی ہے۔ لہٰذا ایسی صورتوں میں بیع قبل القبض نہیں پائی جائے گی۔[2] بیع قبل القبض کی ممانعت کی دوسری وجہ یہ ہے کہ قبضے سے پہلے مبیع بائع کے ضمان میں نہیں آتا اور ربح مالم یضمن جائز نہیں۔

اب جہاں حسی قبضہ تو نہ ہوا ہو، مگر مشتری کا حکماً قبضہ ہو چکا ہو، یعنی مبیع سے انتفاع بھی مشتری کے تصرف میں آ چکا ہو، اور اس کا ضمان بھی ثابت ہو چکا ہو تو اس کی بیع جائز ہوگی۔ اسٹاک ایکسچینج کے لوگوں سے تفصیلی گفتگو کے بعد یہ بات سامنے آئی کہ حاضر سودا ہو جانے کے بعد شیئرز کے تمام حقوق اور ذمہ داریاں خریدار کی طرف منتقل ہو جاتی ہیں۔ وہ خریدار کے ضمان میں داخل ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ حاضر سودا ہو جانے کے بعد شیئرز پر حسی قبضہ سے پہلے اگر کسی حادثے کے نتیجے میں کمپنی بالکل نیست و نابود ہو جائے تو نقصان مشتری کا سمجھا جاتا ہے، اسٹاک ایکسچینج بائع کو پیسے دلوائے گا۔ ایسے ہی قبضے سے پہلے نفع (Dividend) تقسیم ہو جائے تو گو کمپنی تو بائع کے نام نفع جاری کرے گی، اس لئے کہ کمپنی کے ریکارڈ میں ابھی تک بائع کا نام درج ہے، لیکن کاروباری ضابطہ سے وہ اس بات کا پابند ہوگا کہ شیئرز کے ساتھ نفع بھی مشتری کو دے۔ ان باتوں سے معلوم ہوا کہ حسی قبضے سے پہلے بھی وہ شیئرز مشتری کے ضمان میں آ چکے ہیں۔ اب جو بات باقی ہے وہ صرف یہ ہے کہ شیئرز کی ملکیت کا تحریری

ثبوت مشتری کے پاس آجائے۔ اور محض اتنی بات سے قبضہ منتفی نہیں ہوتا۔ اس کا تقاضا یہ ہے کہ سرٹیفکیٹ کے ہاتھ میں آنے سے پہلے بھی شیئر کی بیع جائز ہو۔ لیکن دوسری طرف اگر اس جانب نظر کی جائے کہ ہر چیز کے قبضہ کا سرٹیفکیٹ ہاتھ میں آجائے، تو پھر عدم جواز کا حکم ہونا چاہیے بالخصوص جب کہ اس طرح سٹے کے کاروبار کی حوصلہ افزائی بھی ہوسکتی ہے لہٰذا ان متعارض جہات کی موجودگی میں احتیاط یہی ہے کہ سرٹیفکیٹ پر قبضہ کیے بغیر آگے بیع نہ کی جائے۔

شیئرز پر زکوٰۃ

کمپنی کے شیئرز پر زکوٰۃ کے کیا احکام ہیں؟ اس سلسلے میں تین باتیں قابل ذکر ہیں:

۱۔ کمپنی پر بحیثیت کمپنی (جو شخص قانونی ہے) زکوٰۃ واجب نہیں۔ اس کا مدار خلطة الشیوع کے مسئلے پر ہے۔ ائمہ ثلاثہ کے ہاں خلطة الشیوع کا اعتبار ہے اور زکوٰۃ مجموعہ پر واجب ہوتی ہے اور امام شافعیؒ کے ہاں یہ بھی تصریح ہے کہ خلطة الشیوع کا اعتبار صرف سوائم ہی میں نہیں، اموال تجارت میں بھی ہوتا ہے، اس لئے ان کے ہاں کمپنی پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔ اگرچہ کمپنی ایسا شخص نہیں جو مکلّف ہو اور زکوٰۃ ایک عبادت ہے جو مکلّف پر واجب ہوتی ہے، لیکن شافعیہ کا اصول یہ ہے کہ زکوٰۃ انسان پر نہیں، بلکہ اموال پر واجب ہوتی ہے۔ حالانکہ وہ مکلّف نہیں، لہٰذا ان کے ہاں کمپنی پر زکوٰۃ واجب ہے، مگر شیئر ہولڈرز پر زکوۃ واجب نہیں۔ اس لئے کہ حدیث میں یہ اصول مذکور ہے۔

"لا ثنی فی الاسلام"

یعنی ایک مال پر دوہری زکوۃ نہیں ہوتی...... حنفیہ کے ہاں خلطة الشیوع کا اعتبار نہیں اور ان کے ہاں زکوۃ انسان پر واجب ہوتی ہے، اس لئے حنفیہ کے ہاں کمپنی پر بہ حیثیت شخص قانونی زکوۃ نہیں، شیئر ہولڈرز پر زکوۃ واجب ہوگی۔

۲۔ شیئرز پر زکوٰۃ کس حساب سے دی جائے؟ اس میں دو باتیں قابل ذکر ہیں۔ ایک یہ کہ شیئرز کی قیمتیں تین طرح کی ہیں۔ (۱) فیس ویلیو یعنی سرٹیفکیٹ پر لکھی ہوئی قیمت (۲) مارکیٹ ویلیو یعنی بازاری قیمت جس پر شیئرز بازار میں فروخت ہوتے ہیں (۳) بریک اپ ویلیو (Break Up Value) یعنی اگر کمپنی تحلیل ہوتو ہر شیئر کے مقابلے میں کمپنی کے اثاثوں کا جو حصہ آئے گا وہ بریک اپ ویلیو ہے۔ ان تین طرح کی قیمتوں میں سے کس حساب سے زکوۃ واجب ہوگی؟ اگر کسی کمپنی کی بریک اپ ویلیو بہ آسانی معلوم ہوسکتی ہوتو غالباً زکوٰۃ کے حساب کی بنیاد بننے کے لئے وہ سب سے زیادہ موزوں ہے، لیکن بریک اپ ویلیو کا تعین بہت مشکل ہے، اور عام حصہ داروں کے لئے تو بہت

ہی مشکل ہے، لہٰذا اس بات پر تقریباً تمام علماء عصر کا اتفاق ہے کہ بازاری قیمت کا اعتبار ہوگا۔ اس لئے کہ قیمت اسمیہ اگرچہ ابتداءً سرمایہ لگاتے وقت تو حقیقت کی نمائندگی کرتی ہے، مگر جب سرمایہ کمپنی کے اثاثوں میں بدل جائے گا تو اب فیس ویلیو حقیقت کے زیادہ قریب نہیں، اس لئے کہ اثاثوں کی قیمت کم وبیش ہوتی رہتی ہے۔ مارکیٹ ویلیو میں اثاثوں کے علاوہ دوسرے عوامل اثر انداز ہوں تب بھی مارکیٹ ویلیو حقیقت کے زیادہ قریب ہے۔

دوسری بات یہ قابل غور ہے کہ شیئر کمپنی کے تمام اثاثوں میں متناسب ملکیت کی نمائندگی کرتا ہے۔ اور کمپنی کے بعض اثاثے قابلِ زکوٰۃ ہوتے ہیں، جیسے نقود، اموالِ تجارت وغیرہ اور بعض قابل زکوٰۃ نہیں ہوتے، جیسے بلڈنگ، مشینری وغیرہ۔ شیئرز کی زکوٰۃ ادا کرتے وقت قابل زکوٰۃ یا نا قابل زکوٰۃ میں تفریق کی جائے گی یا نہیں؟ اس میں فقہائے عصر کی دو رائیں ہیں۔ مصر کے شیخ ابوزہرہ مرحوم کی رائے یہ ہے کہ شیئرز خود عروضِ تجارت بن چکے ہیں، اس لئے ان کی پوری مارکیٹ ویلیو پر زکوٰۃ ہوگی۔ اس تحقیق کی ضرورت نہیں کہ اس کے پیچھے کتنے اثاثے قابل زکوٰۃ ہیں اور کتنے قابل زکوٰۃ نہیں ہیں؟ دوسرے علماء کی رائے یہ ہے کہ شیئرز چونکہ کمپنی کے اثاثوں میں ہی ملکیت کی نمائندگی کرتے ہیں، اس لئے اثاثوں کے قابل زکوٰۃ یا نا قابل زکوٰۃ ہونے کی تحقیق کی جاسکتی ہے، میں نے ان دونوں نقطہ ہائے نظر میں اس طرح تطبیق دی ہے کہ اگر کسی نے کمپنی کے منافع میں شرکت کے لئے شیئر لیا ہے تو اس کو عروضِ تجارت میں شمار کرنا مشکل ہے اس میں گنجائش ہے کہ اگر کسی کے لئے قابل زکوٰۃ اور نا قابل زکوٰۃ اثاثوں کی تحقیق ممکن ہو تو وہ تحقیق کر کے صرف قابل زکوٰۃ اثاثوں کی حد تک زکوٰۃ دے اور جو شخص تحقیق نہ کرسکتا ہو وہ احتیاطاً پوری بازاری قیمت کی زکوٰۃ دے دے۔ اور اگر کسی نے شیئر تجارت کرنے (Capital Gain) کے لئے اور آگے بیچ کر نفع کمانے کے لئے خریدا ہے تو یہ عروضِ تجارت میں شمار ہوگا، اس لئے کہ گویا اس نے کمپنی کے اثاثوں کا ایک متناسب حصہ آگے بیچنے کے لئے خرید لیا ہے اس لئے تمام قیمت پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔

۳۔ فقہی اصول یہ ہے کہ کسی پر دیون واجب ہوں تو دیون منہا کر کے باقی اموال پر زکوٰۃ واجب ہوتی ہے۔ مگر یہ بات آج کل بہت قابل غور ہے کہ اکثر بڑے بڑے سرمایہ داروں نے بینکوں اور دیگر مالیاتی اداروں سے اتنے قرض لے رکھے ہوتے ہیں کہ ان کے قرضے ان کے قابل زکوٰۃ سرمائے سے عموماً بڑھ جاتے ہیں۔ عموماً صورتحال یہ ہوتی ہے کہ اگر ان کے قرضے منہا کیے جائیں تو نہ صرف یہ کہ ان پر زکوٰۃ واجب ہوگی، بلکہ بعض صورتوں میں وہ خود مستحقِ زکوٰۃ قرار پائیں گے۔ اس سلسلے میں ایک تجویز تو یہ پیش کی جاتی ہے کہ مشینری پر زکوٰۃ واجب قرار دی جائے، لیکن یہ بات اس لئے قابل ذکر

نہیں کہ مشینری کو مالِ زکوٰۃ قرار نہیں دیا جاسکتا، یہ بات منصوص ہے۔ اس مسئلے کا صحیح حل یہ ہے کہ زکوٰۃ سے دیون کا مستثنیٰ ہونا فقہاء کے ہاں متفق علیہ نہیں۔ حنفیہ اور حنبلیہ کے ہاں تو دیون مستثنیٰ ہوتے ہیں، شافعیہ کے ہاں مستثنیٰ نہیں ہوتے۔ اور مالکیہ کے ہاں نقود میں تو مستثنیٰ ہوتے ہیں، غیر نقود میں نہیں ہوتے۔[1] احقر کی ناچیز رائے اس مسئلہ کے بارے میں یہ ہے کہ یہ دیکھا جائے کہ جو قرضہ لیا گیا ہے وہ کہاں صرف کیا گیا ہے۔ اگر ان قرضوں کے ذریعے اشیاء خریدی گئیں جو خود قابل زکوٰۃ ہیں تو یہ قرضے زکوٰۃ سے مستثنیٰ ہوں گے۔ اور اگر ان قرضوں سے ایسی اشیاء خریدی گئیں جو قابل زکوٰۃ نہیں تو یہ قرضے مستثنیٰ نہیں ہوں گے۔ ان قرضوں کے سلسلے میں مالکیہ اور شافعیہ کے قول پر عمل کیا جائے گا۔ یہ رائے قائم کرنے کے بعد حافظ ماردینیؒ کی کتاب "الجوهر النقی" میں نظر سے گذرا کہ امام مالکؒ کا قول بھی اس کے قریب قریب ہے۔ وہ فرماتے ہیں، ان کان عنده عروض، تفی بدینه زکاة العين (الجوهر النقی حاشیه ص ۱۴۹ ج۴ باب الدين مع الصدقه)

❀❀❀

---

(۱) کتاب الفقه على المذاهب الاربعه للجزیری ۱: ۶۰۲۔۶۰۵ مبحث زکاة الدين، وفقه الاسلام وادلته ۲ : ۷۴۷

نظامِ زر

(Monetary System)

نظامِ زر

(Monetary System)

زر، نقد (Money) کی تعریف

جو چیز عرفاً آلۂ مبادلہ کے طور پر استعمال ہوتی ہو اور وہ قدر کا پیمانہ ہو اور اس کے ذریعے مالیت کو محفوظ کیا جا سکتا ہو، اسے ''زر'' کہتے ہیں۔ یہ تین خصوصیات جس چیز میں پائی جاتی ہوں اس کو عربی میں ''نقد'' اردو میں ''زر'' اور انگریزی میں Money کہتے ہیں۔ مالیت کے تحفظ سے مراد یہ ہے کہ کسی کے پاس جنس رکھی ہوئی ہو تو اس کی قیمت کم و بیش ہوتی رہتی ہے، نیز ضروری نہیں کہ ہر وقت اس کا خریدار مل جائے۔ اس لئے اس کی مالیت مکمل طور پر محفوظ نہیں۔ اس کی بجائے اگر زر رکھ لیا جائے تو عام حالات میں اس سے مالیت محفوظ رہتی ہے، یعنی غیر معمولی حالات سے قطع نظر، اس کی ذاتی قیمت یکساں رہتی ہے، نیز اس سے کوئی بھی چیز جب چاہیں خریدی جا سکتی ہے۔

زر اور کرنسی میں فرق

زر وہ چیز ہے جس کے ذریعے سے تبادلہ ہوتا ہو، قدر کی پیائش ہوتی ہو اور مالیت کا تحفظ بھی ہو، مگر یہ ضروری نہیں کہ قانونی طور پر بھی اس کو جبری آلہ تبادلہ قرار دیا گیا ہو۔ مثلاً چیک یا انعامی بانڈز جیسی دستاویزات سے لوگ تبادلہ کرتے ہیں۔ لیکن اگر کوئی شخص انعامی بانڈ سے ادائیگی کرے اور دوسرا شخص اپنا حق انعامی بانڈ کی صورت میں لینے پر آمادہ نہ ہو تو اس کو قانوناً لینے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا۔ اور کرنسی وہ زر ہے جس کو خاص ملک میں قانونی طور پر آلہ تبادلہ قرار دیا گیا ہو جیسے روپیہ۔ اگر کوئی شخص روپے میں ادائیگی کرے تو قانوناً اسے لینے پر مجبور کیا جائے گا۔ ایسی قانونی کرنسی کو عربی میں ''عملة قانونية'' اردو میں ''زر قانونی'' اور انگریزی میں Legal Tender کہتے ہیں۔ پھر اس کی دو قسمیں ہیں۔ ایک ایسی کرنسی جس میں ایک خاص حد تک قانوناً ادائیگی کی جا سکتی ہے، اس سے زائد مقدار دی جائے گی تو قانوناً اسے لینے پر جبر نہیں کیا جائے گا۔ جیسے چونی کہ اگر کوئی شخص چونیوں سے کوئی بڑا قرض ادا کرنا چاہے تو لینے والا قانوناً اسے لینے سے انکار کر سکتا ہے، اور یہ مطالبہ کر سکتا ہے کہ میرا قرض

مجھے روپیہ میں ادا کرو۔ اس کو عربی میں ''عملة قانونية محدودة'' اردو میں ''محدود زرِ قانونی'' اور انگریزی میں Limited Legal Tender کہتے ہیں۔ دوسری قسم جس میں قانوناً ادائیگی کی کوئی حد مقرر نہ ہو۔ اس کو ''عملة قانونية غير محدودة'' یا غیر محدود زرِ قانونی Unlimited Legal Tender کہتے ہیں۔ جیسے دھات یا کاغذ کا روپیہ۔

زر کا ارتقاء اور مختلف نظامہائے زر

ابتداءً لوگوں میں سامان کے بدلے سامان کی بیع کا طریقہ رائج تھا، جس کو ''مقايضة'' (Barter) کہتے ہیں۔[1] مگر اس میں متعدد دشواریاں تھیں مثلاً یہ کہ سامان کا نقل وحمل مشکل تھا، اس طریقے میں طلب ورسد کا ایک ہی جگہ ملاپ کم ہوتا تھا۔ مثلاً ایک شخص گندم دے کر کپڑے کا خواہشمند ہے اور کپڑے والا گندم لینا نہیں چاہتا۔ اجناس کو چھوٹی چھوٹی اکائیوں میں تقسیم کر کے ان کو کاروبار کی بنیاد بنانا مشکل تھا۔ ''مقايضة'' (Barter) کے بعد بعض اہم اشیاء کو ہی ثمن قرار دیدیا گیا، مثلاً گندم، جو، چمڑا وغیرہ۔ اس کے بعد سونے اور چاندی کو ثمن قرار دیا گیا۔ اس لئے کہ یہ عالمی طور پر قابل قبول تھے اور ان کا نقل وحمل بھی آسان تھا۔ ابتداءً سونے کے ذریعے مبادلات سکہ ڈھالے بغیر ان کے وزن پر ہوتے تھے۔ اس کے بعد سکے ڈھالنے کا آغاز ہوا۔ شروع میں ہر شخص کو سکہ ڈھالنے کی اجازت ہوتی تھی۔ اس دور کے نظام کو ''طلائی معیار'' اور عربی میں ''قاعدة الذهب'' اور انگریزی میں Gold Standard کہتے ہیں۔ پھر اس کے علاوہ چاندی کے سکے بھی ڈھالے جانے شروع ہوئے، اس نظامِ زر کو جس میں سونے اور چاندی دونوں کے سکے ڈھالے جاتے تھے ''دو دھاتی معیار'' (Bi Metallic Standard)۔ کہتے ہیں۔ اور عربی میں ''نظام المعدنين'' کہتے ہیں۔ اس کے بعد ایک ایسا دور آیا کہ لوگ سونے، چاندی کے سکے صرافوں کے پاس امانت رکھوا دیتے تھے اور صراف اس کے وثیقے کے طور پر رسید لکھ دیتے تھے، بوقت ضرورت رسید دکھا کر صراف سے اپنا سونا واپس لیا جاتا تھا۔ پھر رفتہ رفتہ لوگوں نے صرافوں کی دی ہوئی رسیدوں سے اشیاء خریدنی شروع کر دیں، یعنی بجائے اس کے کہ خریدار پہلے صراف سے سونا لے کر بائع کو دے، اور بائع سونا لے کر پھر صراف کے پاس رکھوائے، خریدار بائع کو سونے کی رسید دیدیتا جس کا مطلب یہ ہوتا کہ اس رسید کا سونا بائع کی طرف منتقل ہو گیا ہے، اس طرح رسیدوں سے لین دین شروع ہو گیا، اور صرافوں سے سونا واپس لینے کی

(۱) کتابوں میں یہی لکھا گیا ہے، تاریخ اس بات کی توثیق نہیں کرتی، اس لئے کہ تاریخی طور پر ایسا کوئی دور نہیں ملتا جس میں کوئی چیز بطور زر اور ثمن کے رائج نہ ہو۔

نوبت کم آنے لگی۔ جب صرافوں نے دیکھا کہ لوگ عموماً سونا واپس لینے نہیں آتے تو انہوں نے لوگوں کا رکھا ہوا سونا دوسروں کو قرض دینا شروع کر دیا۔

اس طرح نوٹ اور بینکنگ کا آغاز ہوا یعنی صرافوں کی جاری کی ہوئی رسیدیں نوٹ بن گئیں جس کی تفصیل بینکنگ پر گفتگو کرتے ہوئے ذکر کی جائے گی۔ ابتداءً ہر شخص نوٹ جاری کر سکتا تھا، مگر اس وقت یہ زر قانونی (Legal Tender) نہیں تھے۔ صرف لوگوں کے تعامل کی وجہ سے قابل قبول تھے۔ اس مقبولیت اور سہولت کے پیش نظر بعد میں نوٹ کو زر قانونی (Legal Tender) قرار دیا گیا لیکن زر قانونی کی حیثیت رکھنے والے نوٹ ہر شخص کو جاری کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ حکومت کے منظور شدہ (Authorised) ادارے (بینک) ہی جاری کر سکتے تھے۔ شروع میں عام تجارتی بینک نوٹ جاری کرتے تھے، بعد میں یہ اختیار صرف مرکزی بینک کی حد تک محدود کر دیا گیا۔

نوٹ کے (Legal Tender) بننے کے بعد اس پر کئی دور گزرے ہیں۔ ایک دور وہ تھا جب نوٹ کے پیچھے سو فیصد سونا ہوتا تھا۔ قانوناً اس بات کی پابندی تھی کہ جتنا سونا موجود ہے، اتنے ہی نوٹ جاری کیے جائیں۔ اس نظام کو عربی میں ''قاعدة سبائك الذهب'' اور انگریزی میں (Gold Bullion Standard) کہتے ہیں۔ پھر جب دیکھا گیا کہ لوگ سونا لینے کم ہی آتے ہیں تو نوٹ کی پشت پر سونے کی شرح کم کر دی گئی۔ شرح کے تناسب بدلتے رہے یعنی نوٹ کی پشت پر رکھے ہوئے سونے کی فیصد شرح گھٹتی چلی گئی۔ ایسے نوٹ کو جس کی پشت پر سو فیصد سونا نہ ہو، ''نقود الثقة'' (Fiduciary Money) کہتے ہیں، پھر سونے کی شرح کم ہوتے ہوتے صفر رہ گئی اور کم از کم ملکی معاملات کی حد تک نوٹ کی پشت پر سونے کا وجود ضروری نہیں رہا۔ ایسے نوٹوں کو ''النقود الرمزية'' (Token Money) کہتے ہیں۔ ان سکوں کی قانونی قیمت حقیقی قیمت کی نمائندگی نہیں کرتی۔ مثلاً سو روپے کے نوٹ کی قانونی قیمت سو روپے ہے مگر اس کی ذاتی قیمت کچھ بھی نہیں۔ کچھ عرصہ تک ''نقود رمزیہ'' کا بھرم اس طرح رہا کہ بیشتر ممالک نے اپنے نوٹوں کو ڈالر سے وابستہ کر رکھا تھا، گویا ان کے نوٹوں کے پیچھے ڈالر تھے، اور چونکہ امریکہ نے ڈالر کے بدلے سونا دینے کا اقرار کیا ہوا تھا۔ اس لئے ڈالر کے پیچھے سونا تھا، اور اس طرح دوسرے ملکوں کے نوٹ بھی بالواسطہ سونے سے وابستہ تھے۔ لیکن بالآخر ۱۹۷۱ء میں امریکہ نے بھی سونے سے ڈالر کی وابستگی ختم کر دی، جس کی تفصیل آ رہی ہے اور اس طرح اب کسی نوٹ کے پیچھے کوئی سونا چاندی نہیں ہے۔ اب ''نوٹ'' محض ایک اصطلاحی ثمن ہے جو قوتِ خرید کی نمائندگی کرتا ہے اور بس۔

شرح مبادلہ کا تعین

مختلف ملکوں کی کرنسیوں کے باہمی تبادلے کی شرح کیسے متعین ہوتی ہے؟ اس کے بھی مختلف زمانوں میں مختلف طریقے رائج رہے ہیں۔ ۱۸۸۰ء سے ۱۹۱۳ء تک دنیا میں طلائی نظام رائج تھا گو اس سے پہلے بھی طلائی نظام رائج تھا، مگر جس طرح اس دور ایسے میں مکمل طور پر رائج رہا ویسے پہلے رائج نہ تھا۔

طلائی نظام میں ہر ملک کی کرنسی سونے کی ایک مخصوص مقدار کی نمائندگی کرتی تھی۔ مثلاً انگلینڈ نے طے کر رکھا تھا کہ ایک پاؤنڈ کے پیچھے سونے کی اتنی مقدار ہوگی اور امریکہ نے بھی طے کر رکھا تھا کہ امریکی ڈالر کے پیچھے سونے کی اتنی مقدار ہوگی۔ جب یہ طلائی نظام رائج تھا اس وقت دونوں ملکوں کی کرنسیوں میں تبادلے کی شرح ان کرنسیوں کی پشت پر موجود سونے کی مقدار کے تناسب سے طے ہوتی تھی۔ یعنی یہ دیکھا جاتا تھا کہ ہر ملک کی کرنسی کے پیچھے سونے کی کتنی مقدار ہے۔ دونوں ملکوں کی کرنسیوں کے بدلے میں ملنے والی سونے کی مقداروں میں جو تناسب ہوتا اسی تناسب سے کرنسیوں کا تبادلہ ہوتا تھا مثلاً اگر انگلینڈ کے پونڈ کے پیچھے چار تولے سونا ہو اور امریکی ڈالر کے پیچھے دو تولے سونا ہو تو پونڈ اور ڈالر میں ایک اور دو کی نسبت ہوئی، لہٰذا ایک پونڈ کا دو ڈالر سے تبادلہ ہوگا۔

اس کے بعد رفتہ رفتہ طلائی نظام ختم ہو گیا، اس کے بعد شرح تبادلہ کے تعین کا کیا طریقہ رائج ہوا اس کو سمجھنے کے لئے بین الاقوامی تجارتی نظام میں جو تبدیلیاں آئیں ان کی اجمالی وضاحت ضروری ہے۔

پہلی جنگ عظیم کے بعد دنیا کا نظام درہم برہم ہوا۔ پھر ۱۹۳۰ء میں عالمی کساد بازاری ہوئی اور تمام ممالک نے نوٹ پر سونا دینا بند کر دیا۔ پھر دوسری جنگ کے بعد انگلینڈ اور یورپ کے دوسرے ممالک اقتصادی طور پر درہم برہم ہو گئے، مگر امریکہ اقتصادی طور پر خاصا مستحکم تھا۔ اس کے پاس سونے کے کافی ذخائر تھے۔ ۱۹۴۴ء میں امریکہ کے تعاون سے یورپ کی تعمیر نو کے لئے متعدد ممالک کی ایک عظیم کانفرنس منعقد ہوئی۔ یہ کانفرنس امریکہ کے ایک شہر ''بریٹن ووڈز (Bretton Woods)'' میں منعقد ہوئی۔ اس کانفرنس کا موضوع یہ تھا کہ عالمی تجارت کو کیسے فروغ دیا جائے؟ سرمایہ کاری (Investment) کو کیسے فروغ دیا جائے؟ اور نیا عالمی نظام زر کس طرح طے کیا جائے جس میں وہ خرابیاں نہ ہوں جو ''طلائی نظام'' میں تھیں۔ اس کانفرنس نے تین ادارے قائم کرنے کی تجویز منظور کی اور ایک نظام طے کیا گیا۔ پہلے ان تین اداروں کا مختصر تعارف ذکر کیا جاتا ہے، پھر نظام پر گفتگو ہوگی۔

بریٹن ووڈز کانفرنس کے تین ادارے

۱۔ پہلا ادارہ جس کا قیام اس کانفرنس میں طے پایا تھا وہ ہے ''بین الاقوامی تجارتی تنظیم'' (International Trade Oraganization) جس کو عربی میں ''منظمة التجارية الدولية'' کہتے ہیں۔اس کا پس منظر یہ ہے کہ سولہویں صدی سے اٹھارہویں صدی تک یہ نظریہ بہت مقبول تھا کہ ہر ملک اپنی اقتصادی ترقی کے لئے اپنا سونا بڑھائے اور اس کے لئے برآمدات کو فروغ دے اور درآمدات میں رکاوٹ ڈالے،اس نظریئے کو مرکنٹائل ازم (Mercantilism) اور عربی میں ''مذہب التجاریین'' کہتے ہیں۔لیکن بعد میں یہ نظریہ کامیاب نہ ہوا اور یہ نظریہ مقبول ہوا کہ اقتصادی ترقی کے لئے بین الاقوامی تجارت کو فروغ دیا جائے اور درآمدات پر ایسی پابندیاں نہ لگائی جائیں جو بین الاقوامی تجارت میں رکاٹ ڈالیں۔اسی نظریئے کے پیش نظر اس کانفرنس میں مذکورہ ادارے کا قیام طے ہوا جس کا مقصد یہ تھا کہ ادارہ بین الاقوامی تجارت میں حائل رکاوٹوں کو ختم کرنے کا انتظام کرے گا مگر امریکہ اس ادارے کے قیام کا مخالف تھا۔اس لئے کہ امریکہ ایک زرعی ملک ہے، اگر بین الاقوامی تجارت کو فروغ ہوتا تو یورپ کا مال سستے دام پر امریکہ میں آتا اور کسان زراعت کو چھوڑ کر تجارت کی طرف متوجہ ہوتے۔اس سے امریکہ کی زرعی پالیسی کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ تھا۔ایک عرصہ تک اس ادارہ کا قیام امریکہ اور دوسرے ممالک میں باعثِ نزاع بنا رہا۔دوسرے ممالک اس ادارے کے قیام کا مطالبہ کرتے تھے اور امریکہ اس کا انکار کرتا تھا۔حتی کہ ۱۹۴۸ء میں باہمی مصالحت ہوئی اور اس کے نتیجے میں ایک اور ادارہ وجود میں آیا۔جس کو (General Agreement on Tariff and Trade) (جنرل ایگری میںٹ آن ٹیرف اینڈ ٹریڈ) کہتے ہیں جس کے معنی اردو میں یوں کیے جاسکتے ہیں ''محصولات و تجارت کا معاہدہ عام'' اس ادارے کو تخفیفاً (GATT) (گیٹ) کہتے ہیں،عربی میں اس ادارے کو "الاتفاقية العامة لتصرفات الجمركية والتجارة" کہتے ہیں۔

اس معاہدے سے زرعی اجناس کو مستثنیٰ کرلیا گیا تھا۔زرعی اجناس کے علاوہ دیگر مصنوعات میں بین الاقوامی تجارت کو فروغ دینے کے لئے یہ اصول طے ہوئے۔

۱۔ کوئی ملک بین الاقوامی تجارت میں کوئی پابندی یا رکاوٹ عائد کرے تو دوسرے ممالک اس رکاوٹ ختم کرانے کے لئے ''گیٹ'' میں آواز اٹھا سکیں گے اور جو ملک اس ''گیٹ'' کے ممبر ہیں اس پر ''گیٹ'' کے فیصلے پر عملدرآمد کرنا ضروری ہوگا۔تجارت میں رکاوٹیں دو طرح کی ہوتی ہیں۔

(۱) محصولاتی رکاوٹیں۔ کوئی ملک کسی ملک کی مصنوعات پر زیادہ محصول لگاتا ہے، جس کی وجہ سے اس ملک کی مصنوعات اس ملک میں مہنگی ہو جاتی ہیں اوران کی خرید وفروخت کم ہو جاتی ہے۔

(۲) غیر محصولاتی روکاٹیں۔ محصول کے علاوہ کوئی اور پابندی ایسی لگادی جائے جس کی وجہ سے دوسرے ممالک کی مصنوعات منگوانے میں لوگ تنگی محسوس کریں۔ مثلاً فرانس نے جاپان کے وی سی آر پر یہ پابندی لگادی تھی کہ یہ صرف فلاں چھوٹے پورٹ سے ہی آسکے گا۔

۲۔ دوسرا اصول یہ طے ہوا کہ کوئی ملک کسی ملک کے ساتھ امتیازی سلوک نہیں کرے گا۔ اگر کوئی ملک ایک ملک کے ساتھ بہتر طریقے سے تجارت کرے اور دوسرے ملک کے ساتھ اور طریقے سے تجارت کرے تو یہ ملک گیٹ میں آواز اٹھا سکے گا۔

۳۔ کسی ملک پر امتیازی محصول نہیں لگایا جائے گا۔ اگر کسی ملک پر امتیازی محصول لگایا گیا تو وہ ''گیٹ'' میں آواز اٹھا سکتا ہے۔

۴۔ غریب ممالک کو بیرونی مصنوعات پر محصول زیادہ لگانے کی اجازت ہوگی، اس لئے کہ غریب ممالک بھی اگر محصول کم رکھیں گے تو بیرونی مصنوعات سستی ملیں گی۔ جس کی وجہ سے ملکی مصنوعات کی مانگ کم پڑے گی اور ملکی صنعت کو نقصان پہنچے گا۔

۵۔ اگر دو ممالک میں تجارتی نزاع پیدا ہوگا تو ''گیٹ'' کے ذریعے باہمی افہام وتفہیم سے حل کیا جائے گا۔

عالمی مالیاتی فنڈ

۲۔ دوسرا ادارہ جو وضع ہوا ''وہ عالمی مالیاتی فنڈ'' تھا جس کو عربی میں "صندوق النقد الدولی" اور انگریزی میں (International Monetary Fund) کہتے ہیں۔ آسانی کے لئے آئی، ایم، ایف (I.M.F) سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے۔ ۱۹۴۴ء میں اس کا قیام طے ہوا اور یہ ۱۹۴۸ء میں وجود میں آیا۔

جس طرح ایک ملک کے کئی بینکوں کا ایک مرکزی بینک ''سنٹرل بنک'' ہوتا ہے ایسے ہی کئی ممالک کے سنٹرل بینکوں کا مرکزی بینک یہ ادارہ ہوتا ہے۔ گویا یہ پوری دنیا کا ایک مرکزی بینک ہے، جو وقتی ادائیگیوں کے لئے ملکوں کو قلیل المیعاد قرضے دیتا ہے۔ کبھی کسی ملک کی مالی حالت تو مستحکم ہوتی ہے، مگر وقتی طور پر کسی تجارت کی ادائیگی کے لئے نقد پیسے اس کے پاس نہیں ہوتے۔ ایسے موقع پر یہ ادارہ قرضہ فراہم کرتا ہے۔

اس ادارے میں ہر ملک کا ایک ''کوٹا'' (Quota) ہوتا ہے یہ کوٹہ اس ملک کی تجارت کا عالمی تجارت کے ساتھ تناسب دیکھ کر مقرر کیا جاتا ہے۔ مثلاً عالمی تجارت ایک ارب ڈالر کی ہوئی اور کسی ملک کی تجارت پانچ کروڑ ڈالر کی ہے تو اس ملک کو پانچ فیصد کوٹا ملے گا۔ اس کوٹے کی شرح میں کمی بیشی بھی ہوتی رہتی ہے۔ پھر اس کوٹے کی رقم ڈالر میں بیان کی جاتی ہے۔ یعنی جس ملک کا کوٹا پانچ فیصد ہے، اس کے بارے میں یہ متعین ہوتا ہے کہ اس کا مطلب اتنے ڈالر ہیں۔ ہر ملک اپنے کوٹے کا ۲۵ فیصد سونے میں اور ۷۵ فیصد اپنے ملک کی کرنسی میں ادارے کے پاس جمع کراتا ہے۔ اس طرح آئی، ایم، الیف کے پاس کچھ سونا اور تمام ممالک کی کرنسیاں جمع ہو جاتی ہیں۔ ہر ملک کو آئی، ایم، الیف میں فنڈ جمع کرانے پر ادارے سے قرض لینے کا حق ملتا ہے، جس کو (Drawing Rights) اور عربی میں "حقوق السحب" کہا جاتا ہے۔ جمع کرائی ہوئی رقم کی متناسب شرح پر قرض کا حق ملتا ہے مثلاً یہ کہ ہر ملک اپنی جمع کرائی ہوئی رقم کا پانچ گنا قرض لے سکے گا۔ اور یہ شرح بدلتی بھی رہتی ہے۔ پھر (Drawing Rights) پر جو قرضہ ملتا ہے اس کو کئی حصوں میں تقسیم کر لیا جاتا ہے۔ ہر حصے کو ٹرانچ[1] (Tranch) کہتے ہیں پہلی ٹرانچ اس قرضے کا ۲۵ فیصد ہوتا ہے جس کے لینے کا کسی ملک کو حق ہوتا ہے، اس ٹرانچ پر قرضہ بغیر کسی شرط کے ملتا ہے اور سود بھی کم ہوتا ہے۔ اس ٹرانچ کو (Gold Tranch) کہتے ہیں۔ اس کے بعد والی ٹرانچوں میں قرض لینے میں مشکلات درجہ بدرجہ بڑھتی جاتی ہیں۔ آئی، ایم، الیف قرض دینے کے لئے بہت سی شرائط عائد کرتا ہے، ان ٹرانچوں میں سود بھی بڑھتا جاتا ہے اور قرضے قلیل المیعاد ملتے ہیں۔ ان ٹرانچوں کو Conditionality Tranches کہتے ہیں۔

اس ادارے کی پالیسیاں ممبر ممالک کی ووٹنگ سے طے ہوتی ہیں۔ اور ووٹنگ کا حق ممالک کی تعداد پر نہیں، بلکہ کوٹے کی بنیاد پر ملتا ہے۔ جس کا کوٹا زیادہ ہوتا ہے اس کو ووٹنگ کا حق بھی زیادہ ملتا ہے اور جس کا کوٹا کم ہے اس کو ووٹنگ کا حق بھی کم ہوتا ہے۔ آئی، ایم، الیف میں ایک اور اکاؤنٹ بھی ہوتا ہے جس کو (Special Drawing Rights) (S.D.R) اور عربی میں ''حقوق السحب الخاصة'' کہتے ہیں۔ جس کا حاصل یہ ہے کہ ممبران طے کر لیتے ہیں کہ اس سال مجوزہ قرضوں کے علاوہ مزید اتنے قرضے اور دیئے جا سکتے ہیں۔ مزید قرضوں کو ممالک پر تقسیم کا تناسب بھی کوٹے کی شرح کے مطابق ہوتا ہے۔

(۱) فرانسیسی زبان کا لفظ ہے، جس کے معنی قاش اور ٹکڑے کے ہیں۔

عالمی بینک

۳۔ تیسرا ادارہ جس کا قیام ''بریٹن ووڈز کانفرنس'' میں طے ہوا۔ اس کا نام (International Bank for Reconstruction and Development) تھا۔ جس کو (I.B.R.D) بھی کہتے ہیں۔ جس کو عربی میں ''البنك الدولي للانشاء والتعمير'' کہتے ہیں۔ آسانی کے لئے اس کا مختصر نام (World Bank) (ورلڈ بنک) ہے۔ اب یہی نام زیادہ معروف ہے، پہلا نام معروف نہیں، مگر اصل نام وہی طے ہوا تھا۔

اس ادارے میں اور آئی، ایم، ایف میں فرق یہ ہے کہ آئی، ایم، ایف قلیل المیعاد قرضے دیتا ہے جس کی مدت تین سے پانچ سال ہوتی ہے اور ورلڈ بینک طویل المیعاد قرضے دیتا ہے جس کی مدت پندرہ سے تیس سال ہوتی ہے۔ ابتداءً اس ادارے نے مشروعات (پراجیکٹس) کے لئے قرضے دیئے، جیسے شاہراہیں بنانا وغیرہ۔ پھر ۱۹۶۰ء کے بعد عمومی قرضے دینے بھی شروع کر دیئے، اب یہ ادارہ پالیسی ساز قرضے بھی دیتا ہے۔ یعنی یوں کہتا ہے کہ اگر تم ملک کی پالیسی اس طرح بناؤ تو اتنا قرضہ ملے گا۔

بریٹن ووڈز کا نظام شرح مبادلہ

بریٹن ووڈز کانفرنس میں جو تین ادارے طے پائے تھے ان کا تعارف تو ہو چکا ہے، اسی کانفرنس میں کرنسیوں کے مبادلے کا جو نظام طے ہوا اس کی وضاحت یہ ہے۔

۱۹۳۱ء میں طلائی نظام تو ختم ہو چکا تھا، اس کانفرنس میں شرح مبادلہ کا ایک اور نیا نظام طے پایا جو (Brettonwoods System of Exchange Rate) کے نام سے معروف ہے۔ اس نظام کا حاصل یہ ہے کہ اب بھی کرنسی کی قدر کا پیمانہ تو بنیادی طور پر سونا ہی رہا، مگر ہر ملک کی کرنسی پر سونا نہیں ملتا تھا، بلکہ بین الاقوامی تجارت میں آلۂ تبادلہ ڈالر کو قرار دیا گیا۔ جس کی تفصیل یہ ہے کہ امریکہ کے ڈالر کو سونے سے وابستہ کر دیا گیا، اس لئے کہ امریکہ کی حالت مستحکم تھی، وہ ڈالر پر سونا دینے کے لئے تیار تھا، چنانچہ ابتداءً ایک اونس سونے کے مقابلے میں ۳۵ ڈالر ہوتے تھے، اس کے بعد امریکہ نے ڈالر کی قیمت بڑھا دی اور ۴۲ ڈالر پر ایک اونس سونا ملنے لگا، صرف ہر ملک کا مرکزی بینک امریکہ کو ڈالر دے کر سونا لے سکتا تھا اور امریکہ دینے کو تیار تھا، مگر عمومی طور پر سونا کوئی ملک نہیں لیتا تھا، ڈالر سے ہی کاروبار چلتا تھا، اس طرح ڈالر سونے سے وابستہ تھا۔ اور باقی تمام ممالک کی کرنسیوں کو ڈالر سے

وابستہ کر دیا گیا تھا، اور آئی، ایم، ایف میں معاہدہ اس طرح طے پایا کہ ''ہر ملک اپنی کرنسی کی شرح بیک وقت ڈالر اور سونے دونوں سے بتائے گا'' مثلاً اتنے روپے میں ڈالر ہوگا اور ان روپوں کے عوض سونا اتنا ہوگا، مگر عملاً کرنسی کی شرح صرف ڈالر سے بتائی گئی۔ اس طرح تمام کرنسیاں ڈالر اور ڈالر سونے سے وابستہ ہوا۔

آئی، ایم، ایف میں یہ معاہدہ بھی طے ہوا کہ کسی ملک کی کرنسی کی جو قیمت ڈالر سے طے ہوئی ہے اگر ملک کی کرنسی کی قیمت میں اتار چڑھاؤ ہوا تو وہ اتار چڑھاؤ اگر دو فیصد تک ہے تو گوارہ ہے۔ یعنی کرنسی کی قیمت طے شدہ ریٹ سے دو فیصد کم یا دو فیصد زیادہ ہوگئی تو یہ گوارا ہے، لیکن اگر کرنسی کی قیمت دو فیصد سے زیادہ بڑھ گئی یا گر گئی تو مرکزی بینک قیمتوں پر اثر انداز ہو کر کرنسی کو طے شدہ قیمت پر لائے گا۔ مرکزی بینک کے اثر انداز ہونے کا طریقہ یہ ہوگا کہ اگر کرنسی کی طے شدہ قیمت بازار میں طے شدہ ریٹ سے کم ہوگئی تو مرکزی بینک زیادہ قیمت پر لوگوں سے کرنسی خریدنے لگ جائے گا تو بڑی حد تک امید ہے کہ قیمت بڑھ جائے گی اور اگر کرنسی کی قیمت بازار میں طے شدہ ریٹ سے زیادہ ہوگئی تو مرکزی بینک کم قیمت پر فروخت کرنے لگے گا، جس کے نتیجے میں قیمت کے کم ہونے کا قوی امکان ہے۔ اگر اس طریقے سے بھی ریٹ کنٹرول نہ ہو تو آئی، ایم، ایف یا تو ریٹ کنٹرول کرنے کے لئے مزید ڈالر دے گا یا اس ملک کی کرنسی کا ریٹ بدل دے گا۔

اس پوری تفصیل سے یہ بات سامنے آگئی کہ بریٹن ووڈز کے اس نظام میں شرح مبادلہ (Exchange Rate) طے شدہ (Fixed) ہے۔ اس لئے اس نظام کو انگریزی میں (Fixed Exchange Rate System) اور عربی میں "نظام سعر الصرف الثابت" کہتے ہیں۔ اس سے پہلے شرح مبادلہ کا جو طلائی نظام جاری تھا اس کی سب سے اہم خصوصیت یہ سمجھی جاتی تھی کہ اس میں کرنسی کے پیچھے سونے کی مقدار طے شدہ ہوتی تھی اور ریٹ ایک ہی (Fixed) رہتا تھا جس کی وجہ سے ہر تاجر کرنسی کے ریٹ میں اتار چڑھاؤ کے اندیشے کے بغیر پُراعتماد ہو کر تجارت کرتا تھا۔ بریٹن ووڈز کے اس نظام میں بھی طلائی نظام کی اس خوبی کو برقرار رکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ طلائی نظام میں ایک سقم تھا، اس سے اجتناب کا راستہ نکالا گیا ہے۔ وہ سقم یہ تھا کہ طلائی نظام میں شرح مبادلہ کی تبدیلی میں حکومت کا عمل دخل نہیں تھا۔ بریٹن ووڈز کے مذکورہ نظام شرح مبادلہ میں تبدیلی کی گنجائش بھی رکھی گئی ہے۔

بریٹن ووڈز کے نظام کا زوال

مذکورہ بالا نظام کا مدار اس بات پر تھا کہ کوئی ایک متمول ملک اپنی کرنسی پر سونا دینے کے لئے تیار ہو، چنانچہ امریکہ اس وقت تیار تھا کہ ڈالر کے بدلے سونا دے گا، مگر عملاً امریکہ سے سونے کا مطالبہ کوئی بھی نہیں کرتا تھا، البتہ فرانس نے امریکہ سے ڈالر پر سونے کا مطالبہ شروع کیا جس سے فرانس اور امریکہ کے حالات بھی سازگار نہیں رہے اور امریکہ کے پاس سونے کا ذخیرہ کم ہونے لگا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۹۷۱ء میں امریکہ نے سونا دینے سے انکار کر دیا اور بریٹن ووڈز کا نظام ختم ہو گیا۔ طے شدہ شرح مبادلہ کا نظام (Fixed Exchange Rate System) قائم نہ رہا۔ اب شرح مبادلہ کے نظام کے لئے دو نظریے سامنے آئے [1] ایک نظریہ یہ کہ جیسے باقی اجناس کا کوئی ریٹ طے نہیں ہوتا، بلکہ آزاد بازار خود ہی طلب و رسد کی بنیاد پر ریٹ طے کرتا ہے، ایسے ہی کرنسی کے ریٹ کو بھی کھلے بازار میں چھوڑ دیا جائے، طلب و رسد کی بنیاد پر خود ہی ریٹ طے ہوتا رہے گا۔ مثلاً ڈالر اور پاکستانی روپے کی طلب و رسد سے پاکستانی روپے کا ڈالر کے ساتھ ریٹ طے ہوگا۔ بین الاقوامی تجارتی منڈی میں طلب و رسد سے باقی کرنسیوں کے ساتھ پاکستانی روپے کا ریٹ طے ہوگا۔ اس نظریے کو (Freely Floating Exchange Rate) کا نظریہ کہتے ہیں۔ اور عربیہ میں ''اسعار الصرف العائمۃ الحرۃ'' کہتے ہیں۔

۲۔ دوسرا نظریہ یہ تھا کہ اصولی طور پر تو ریٹ آزاد ہی رہنا چاہئے تاہم اس کے ساتھ ساتھ حکومت کو چاہیے کہ وہ ریٹ پر نگاہ رکھے۔ اگر ریٹ میں کبھی بہت زیادہ افراط یا تفریط ہونے لگے تو حکومت مداخلت کرے۔ جس کا طریقہ یہ ہوگا کہ حکومت سٹیٹ بینک کو کہے کہ وہ بازار میں آکر قیمتوں پر اثر انداز ہو۔ اس نظریے کو انگریزی میں (Managed Float) کا نظریہ کہتے ہیں۔ عربی میں ''اسعار الصرف العائمۃ المدراۃ'' کہہ سکتے ہیں

کاغذی نوٹ کی حیثیت اور اس کے شرعی احکام

مذکورہ تفصیلات سے یہ بات سامنے آئی کہ کاغذی نوٹ پر کئی ادوار گزرے ہیں۔ پہلے اس کے پیچھے مکمل طور پر سونا ہوتا تھا، جس کو (Gold Bullion Standard) کہتے ہیں۔ پھر (Fiduciary Money) کا دور آیا جبکہ اس کے پیچھے مکمل طور پر سونا نہیں ہوتا تھا، لیکن مخصوص تناسب سے سونا ہوتا تھا۔ پھر ایک دور آیا کہ تمام کرنسیاں ڈالر سے وابستہ تھیں اور ڈالر سونے سے

وابستہ تھا، پھر ۱۹۷۱ء کے بعد امریکہ نے بھی سونا دینے سے انکار کر دیا تو اب اس نوٹ کے پیچھے کوئی چیز نہیں رہی، نوٹ پر لکھی ہوئی عبارت ''حامل ہذا کو مطالبہ پر اتنے روپے ادا کیے جائیں گے'' بے معنی ہوگئی۔ اب صورت حال یہ ہے کہ اب اس کے آلۂ تبادلہ ہونے پر اصطلاح محض ہے، اس کے پیچھے کچھ بھی نہیں ہے۔

اب موجودہ صورت حال میں کاغذی نوٹ کی حیثیت کیا ہے اس کی دو تشریحیں کی جاتی ہیں:

۱۔ زیادہ ماہرین معاشیات یہ کہتے ہیں کہ نوٹ کے پیچھے سونا اس لئے رکھا جاتا تھا کہ سونا بطور آلۂ تبادلہ کے متعارف ہوگیا تھا، ہر جگہ اور ہر ملک میں اس کی بنیاد پر تجارت ہوسکتی تھی۔ اگر یہی مقصد کاغذی نوٹ سے سونے کو واسطہ بنائے بغیر حاصل ہو جائے اور وہ بطور آلہ تبادلہ کے متعارف ہو جائے تو سونے کو واسطہ بنانے کی ضرورت نہیں۔ اس رائے کے مطابق نوٹ ایک خاص قوتِ خرید سے عبارت ہے۔ یعنی اس نوٹ سے اتنی قیمت کی اشیاء خریدی جاسکتی ہیں، تو اب نوٹ کے پیچھے سونے کی بجائے غیر متعین، متفرق اشیاء کا مجموعہ ہے۔ جس کو انگریزی میں (Basket of Goods) اور عربی میں ''سلة البضائع'' کہتے ہیں۔

۲۔ دوسری تشریح جو فقہی مزاج کے زیادہ قریب ہے وہ یہ ہے کہ نوٹ کو زر اصطلاحی اور ثمن عرفی قرار دیدیا گیا ہے، یعنی اس کاغذ کی ذاتی قدر نہیں، لیکن اصطلاحاً اس کو ایک مخصوص مالیت کا آلۂ تبادلہ قرار دیدیا گیا۔

نوٹ کی فقہی حیثیت

نوٹ کی فقہی حیثیت کیا ہے؟ اس سلسلے میں علماء کے کئی نقطہ نظر ہیں۔

۱۔ ماضی قریب میں علمائے ہندوستان میں اکثر کی رائے یہ رہی کہ نوٹ خود مال نہیں، بلکہ دَین کی رسید ہے۔ کسی کو نوٹ دینا دَین کا حوالہ ہے۔ اس پر کئی مسائل متفرع ہوئے۔ مثلاً نوٹ دینے سے زکوٰۃ ادا نہیں ہوگی، جب تک کہ فقیر اس سے کوئی چیز نہ خرید لے، نوٹوں سے سونے اور چاندی کی خریداری جائز نہیں۔ اس لئے کہ نوٹ بھی سونے کی نمائندگی کرتے ہیں، لہٰذا یہ بیع صَرف ہوئی اور جس نے نوٹ لئے ہیں اس نے ابھی سونے پر قبضہ نہیں کیا، لہٰذا تقابض فی المجلس نہ ہوا جو بیع صرف کے جواز کی شرط ہے، بلکہ اس رائے کہ مطابق دو نوٹوں کا آپس میں تبادلہ بھی جائز نہیں ہوگا، اس لئے کہ یہ بیع الدین بالدین (بیع الکالئی بالکالئی) ہے جو ناجائز ہے۔

یہ نقطۂ نظر کسی زمانہ میں درست تھا، مگر اب بوجوہ درست نہیں رہا۔ اس لئے کہ اب نوٹوں کے

پیچھے سونا نہیں ہوتا، بلکہ خود انہی کو ثمن قرار دیدیا گیا ہے، لہٰذا ان کو رسید کہنا مشکل ہے۔

۲۔ ایک نقطہ نظر یہ بھی ہے کہ ایک روپے کا نوٹ خود مال ہے اور باقی نوٹ اس کی رسیدیں ہیں، یہ رائے نظریاتی طور پر تو درست ہوسکتی ہے، اس لئے کہ ایک روپے کے نوٹ اور باقی نوٹوں میں فرق ہے، ایک روپے کا نوٹ حکومت جاری کرتی ہے اور باقی نوٹ اسٹیٹ بینک جاری کرتا ہے۔ بڑے نوٹوں پر یہ لکھا ہوتا ہے کہ ''حامل ہذا کو مطالبہ پر اتنے روپے دیئے جائیں گے'' ایک روپے کے نوٹ پر یہ بات لکھی نہیں ہوتی۔ حکومت کو جب پیسے کی ضرورت ہوتی ہے تو حکومت اسٹیٹ بینک سے قرض لیتی ہے، اسٹیٹ بینک نوٹ چھاپ کر قرض دیتا ہے۔ اس فرق کی اس کے علاوہ اور کوئی تشریح بظاہر ممکن نہیں کہ ایک روپے کا نوٹ خود مال ہے اور باقی نوٹ اس کی رسیدیں ہیں، مگر عملی طور پر بات یوں نہیں ہے۔ اس لئے کہ بڑے نوٹ اس بات کو دیکھ کر نہیں چھاپے جاتے کہ ایک روپے کے نوٹ کتنی مقدار میں ہیں، اتنے ہی بڑے نوٹ چھاپے جائیں، بڑے نوٹوں کا ایک روپے کے نوٹ سے ربط نہیں ہوتا۔ اس کے علاوہ کسی چیز کو ثمن عرفی قرار دینے کے لئے اس قسم کی کوئی شرط نہیں ہے کہ وہ کیا چیز ہے لہٰذا اگر کسی رسید کو ثمن قرار دیدیا جائے تو اس پر بھی ثمن عرفی کے احکام جاری کیے جانے چاہئیں۔

۳۔ اکثر علمائے عرب کی رائے یہ ہے کہ نوٹ ذہب اور فضہ کے قائم مقام ہیں۔ جو احکام سونے، چاندی کے ہیں وہی نوٹوں کے بھی ہیں۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ سونا، چاندی تو آلۂ تبادلہ نہیں رہے۔ سونے چاندی کی جگہ اب نوٹوں نے لے لی ہے، لہٰذا زکوۃ، بیع صرف اور ربوا وغیرہ تمام مسائل میں نوٹوں کا حکم سونے، چاندی والا ہوگا۔ علمائے عرب میں سے بعض نے تو یہاں تک کہہ دیا ہے کہ سونا، چاندی اب ثمن نہیں رہے، بلکہ عروض ہیں، ان پر عروض والے احکام جاری ہوں گے۔ یہ نظریہ اس نقطۂ نظر پر مبنی تھا، کہ کوئی چیز بھی ثمن خلقی نہیں ہوتی، کسی چیز کو لوگ آلۂ تبادلہ کے طور پر استعمال کرنے لگیں تو وہ ثمن ہے، یہ مقبولیت ختم ہو جائے تو اس کی ثمنیت بھی ختم ہو جاتی ہے۔

یہ نقطہ نظر بھی درست معلوم نہیں ہوتا، اس لئے کہ سونے، چاندی اور نوٹوں میں فرق ہے۔ سونے چاندی کو ثمن خلقی کہا جائے یا نہ کہا جائے یہ الگ بات ہے، لیکن اتنی بات طے شدہ ہے کہ سونے، چاندی کو شریعت نے ثمن حقیقی قرار دیا ہے۔ ثمن حقیقی ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اس کی ثمنیت اس کے عرفاً آلۂ تبادلہ کے طور پر معتبر ہونے کے ساتھ وابستہ نہیں۔ لوگ اس کو آلۂ تبادلہ اعتبار کریں یا بطور سلعہ استعمال کریں شرعاً اس کا حکم ایک ہی ہوگا، یہی وجہ ہے کہ سونے، چاندی کا زیور سونے، چاندی کے بدلے میں بیچا جائے تو بھی اس پر صرف کے احکام جاری ہوں گے، حالانکہ یہاں یہ آلۂ تبادلہ نہیں۔ معلوم ہوا کہ سونا اور چاندی ثمن حقیقی اور ثمن شرعی ہیں، جب کہ نوٹ اعتباری ثمن ہیں، لہٰذا

نوٹوں کو سونے، چاندی کے قائم مقام قرار دینا بھی صحیح نہیں، اور یہ کہنا بھی صحیح نہیں کہ سونے، چاندی کی ثمنیت ختم ہو چکی ہے۔

۴۔ صحیح نقطہ نظر یہ ہے کہ نوٹ رسید نہیں بلکہ خود مال ہیں، سونے، چاندی کی طرح ثمن حقیقی نہیں بلکہ ثمن عرفی ہیں، ان کا حکم وہی ہوگا جو فلوس کا ہوتا ہے۔ اس نقطہ نظر کے مطابق نوٹوں کے مسائل کی اجمالی وضاحت یہ ہے۔

نوٹ چونکہ خود مال ہیں، لہٰذا ان کے دینے سے زکوٰۃ ادا ہو جاتی ہے، اور ان کا آپس میں تبادلہ بیع صرف نہیں ہوگا، جب یہ معلوم ہوگیا کہ نوٹوں کا تبادلہ صرف نہیں، تو ان کے باہمی تبادلے کا کیا حکم ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ نوٹوں کے تبادلے کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ ایک ہی ملک کے دو نوٹوں میں تبادلہ ہو۔ جیسے سو کے پاکستانی نوٹ کا تبادلہ دس دس روپے کے دس نوٹوں سے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ ایک ملک کی کرنسی کا دوسرے ملک کی کرنسی سے تبادلہ ہو۔

پہلی صورت کا حکم یہ ہے کہ چونکہ یہ بیع صرف نہیں، اس لئے تقابض فی المجلس تو ضروری نہیں، تاہم احد البدلین پر مجلس میں قبضہ ضروری ہے تاکہ بیع الدین بالدین لازم نہ آئے۔ اب سوال یہ ہے کہ اس تبادلے میں تفاضل جائز ہے یا نہیں؟ مثلاً سو روپے کا تبادلہ نوے روپے کے نوٹ سے ہوسکتا ہے یا نہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اگر دونوں بدل غیر متعین ہوں تو حنفیہ کے تینوں ائمہ کے ہاں تفاضل جائز نہیں، اس لئے کہ فلوس میں جودت رداءت کا تو اعتبار ہے نہیں، لہٰذا یہ امثال متساویہ ہیں قطعاً۔ یہاں ایک بدل کی زیادتی دوسرے بدل کے وصف جودۃ کے مقابلے میں تو ہو نہیں سکتی، اس لئے کہ وصف جودۃ ہدر ہے، لہٰذا یہ زیادتی خالی عن العوض ہے، اسی کو ربوا کہتے ہیں۔ اگر دونوں بدل متعین ہوں تو شیخین کے ہاں تفاضل جائز ہے۔ ان کے ہاں متعاقدین کی تعیین سے ان کی ثمنیت باطل ہوگئی، اب یہ عروض بن گئے ہیں اس لئے ان میں تفاضل جائز ہے۔ امام محمدؒ کے ہاں اس صورت میں بھی تفاضل جائز نہیں، ان کی تعیین سے ان کی ثمنیت باطل نہیں ہوتی۔ آج کل امام محمدؒ کی رائے پر ہی فتویٰ دینا چاہئے، اس لئے کہ اگر شیخین کا قول اختیار کرلیا جائے تو ربوا کا دروازہ کھل جائے گا۔ چنانچہ فقہائے متقدمین میں بھی اس کی نظیر موجود ہے۔ فقہائے ماوراء النہر نے ''عدالی'' اور ''غطارفہ'' میں تفاضل کی حرمت کا فتویٰ دیا تھا، حالانکہ ان میں غش غالب ہوتا تھا اور ایسے نقود میں اصل مذہب کے مطابق تفاضل جائز ہے۔ سد باب ربوا کے لئے تفاضل کو حرام قرار دیا گیا ہے۔ ایسے ہی فلوس میں تفاضل کے بارے میں بھی امام محمدؒ کے قول پر فتویٰ دینا چاہیے۔ لہٰذا ایک ملک کے نوٹوں کی بیع میں تفاضل جائز نہیں، تماثل ضروری ہے۔ اور یہ تماثل نوٹوں کی گنتی سے نہیں ہوگا، بلکہ ان پر لکھی ہوئی قیمت

(Face Value) کے مطابق ہوگا۔

دوسری صورت کا حکم یہ ہے کہ دوملکوں کی کرنسی کے تبادلے میں تفاضل جائز ہے، بشرطیکہ احد البدلین پر قبضہ ہو جائے۔ اس لئے کہ دوملکوں کی کرنسیوں کی جنس مختلف ہوتی ہے، کیونکہ خود نوٹ تو مقصود ہوتے نہیں، بلکہ یہ مخصوص قوتِ خرید کی نمائندگی کرتے ہیں۔ اور ہر ملک کی کرنسی کی قوتِ خرید مختلف ہوتی ہے، لہٰذا ہر ملک کی کرنسی الگ جنس شمار ہوگی اور ان کے باہمی تبادلے میں تفاضل جائز ہے۔

حکومتیں بھی دوسرے ممالک کی کرنسیوں کا اپنے ملک کی کرنسی سے ریٹ طے کر دیتی ہیں۔ اس ریٹ سے کم وبیش پر معاملہ کرنا سود تو نہیں، البتہ خلافِ قانون ہونے اور امام کی جائز امور میں اطاعت نہ کرنے کی وجہ سے گناہ ہے۔ اس مسئلے کی مزید تفصیل احقر کے رسالے ''احکام الاوراق النقدیہ'' میں موجود ہے، جس کا ترجمہ بھی چھپ چکا ہے۔

قدرِزر، افراط وتفریطِ زراور قیمتوں کا اشاریہ

سابقہ تفصیل سے یہ بات واضح ہوگئی کہ کاغذی نوٹ (Paper Currency) کی اپنی حقیقی قدر کچھ نہیں، یہ کچھ اشیاء وخدمات (Goods and Services) کی قوتِ خرید کی نمائندگی کرتے ہیں۔ اسی قوتِ خرید کو ''زر کی قدر'' (Value of Money) کہتے ہیں۔ نوٹ کی قدر کا تعین اشیاء وخدمات کی قیمتوں سے ہوتا ہے۔ اشیاء وخدمات کی قیمتیں کم ہو جائیں تو نوٹ کی قدر کی بڑھ جاتی ہے۔ اور اشیاء کی قیمتیں بڑھ جائیں تو نوٹ کی قدر کم ہو جاتی ہے۔ لہٰذا اشیاء وخدمات کی قیمتیں اور نوٹ کی قدر دونوں متضاد سمتوں میں سفر کرتے ہیں۔ جب ''زر'' کا پھیلاؤ زیادہ ہو جائے تو اشیاء کی طلب بڑھتی ہے، جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اشیاء کی قیمتوں میں بھی اضافہ ہوتا ہے۔ اشیاء کی قیمتوں میں اضافے کی وجہ سے زر کی قدر میں کمی آجاتی ہیں۔ اس صورتحال کو اردو میں ''افراطِ زر'' اور عربی میں ''تضخم'' اور انگریزی میں (Inflation) کہتے ہیں۔ پھر اصطلاح میں عموم ہوا تو اس کو اشیاء کی قیمتوں میں ہر اضافے کے لئے استعمال کرتے ہیں، خواہ وہ اضافہ زر کے زیادہ پھیلاؤ کی وجہ سے ہو یا دیگر عوامل کی وجہ سے ہو۔ اگر افراطِ زر (قیمتوں میں اضافہ) اشیاء کی طلب بڑھ جانے کی وجہ سے ہوتو اس کو (Demand Pull Inflation) اور عربی میں ''تضخم بسبب الطلب'' کہتے ہیں۔ اور اگر افراطِ زر اشیاء کی تیاری کے مصارف میں اضافے کی وجہ سے ہو مثلاً مزدور کی اجرت بڑھ جانے کی وجہ سے تو اس کو (Cost Push Inflation) اور عربی میں ''تضخم بسبب رفع الاسعار'' کہتے ہیں اس کے برعکس اگر قیمتوں میں کمی ہو جائے اور زر کی قدر میں اضافہ ہوتو اس کو اردو

میں تفریط زر، عربی میں "انکماش" اور انگریزی میں (Deflation) کہتے ہیں۔

قیمتوں کا اشاریہ

زر کی قدر، افراط زر اور تفریط زر کی پیمائش اشیاء وخدمات کی قیمتوں سے ہوتی ہے۔ اشیاء کی قیمتوں کو دیکھ کر قدر زر اور افراط زر یا تفریط زر کی پیمائش کے لئے ایک حسابی نظام ہے۔ جس کو عربی میں "قائمة الاسعار" اردو میں "قیمتوں کا اشاریہ" اور انگریزی میں (Price Index) کہتے ہیں۔

اس کا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ ایسی اشیاء جو عام ضرورت کی ہیں اور ان کی قیمتوں میں کمی بیشی لوگوں کو زیادہ متاثر کرتی ہے انکی فہرست بنائی جاتی ہے، پھر جس مدت کے دوران زر کی قدر میں کمی بیشی کا اندازہ لگانا ہے، اس مدت کی ابتداء اور انتہاء کی قیمتیں لے کر ان کا اوسط معلوم کیا جاتا ہے یعنی یہ دیکھا جاتا ہے کہ اس مدت کے دوران قیمتوں میں اوسطاً کتنے فیصد اضافہ یا کمی ہوئی۔ یہ قیمتوں میں اضافے یا کمی کی سادہ اوسط ہے، اس سے قدر زر کی صحیح پیمائش نہیں ہوسکتی، اس لئے کہ یہ اوسط حاصل کرنے کے لئے تمام اشیاء کو یکساں رکھا گیا ہے، حالانکہ تمام اشیاء کی قیمتوں میں کمی بیشی انسان کو یکساں طور پر متاثر نہیں کرتی۔ جن اشیاء کی ضرورت زیادہ پیش آتی ہے ان کی قیمتوں میں کمی بیشی زیادہ متاثر کرتی ہے اور جن کی اہمیت وضرورت کم ہے ان کی قیمتوں میں کمی بیشی اتنی زیادہ متاثر نہیں کرتی۔ لہٰذا صحیح پیمائش کے لئے ہر شے کی اہمیت کے مطابق اس کو ایک وزن دیا جاتا ہے۔ اس وزن کو عربی میں "وزن البضائع" اور انگریزی میں (Weight of Commodity) کہتے ہیں۔ اس وزن کو سادہ اوسط میں ضرب دے کر جو اوسط حاصل ہوگا اس کو "وزن دار اوسط" کہتے ہیں۔ عربی میں "المعدل الموزون" اور انگریزی میں (Weighted Average) کہتے ہیں۔ اس موزوں اوسط کا مجموعہ قیمتوں میں کمی بیشی کا اشاریہ ہوگا۔ اس سے قدر زر میں کمی بیشی کا اندازہ لگایا جاتا ہے۔ درج ذیل خاکے سے (Price Index) کا اجمالی تصور ہوسکتا ہے

اشیاء	۱۹۹۱ء کی قیمت	۱۹۹۲ء کی قیمت	سادہ اوسط	وزن	موزوں اوسط
کھانا	۵۰	۱۰۰	۲	۰٫۵	۱٫۰۰
کپڑا	۲۰	۳۰	۱٫۵	۰٫۲	۰٫۳
مکان	۳۰	۶۰	۲	۰٫۳	۰٫۶
			مجموعہ کی		مجموعہ=۱٫۹
			اوسط=۱٫۸۳		

سادہ اوسط سے یہ معلوم ہوا کہ قیمتیں ایک سے ۱۸۳ء ہو گئی ہیں، لہٰذا قدر زر میں ۸۳ فیصد کمی آئی اور موزوں اوسط سے یہ معلوم ہوا کہ قیمتیں ایک سے ۱۹۰ء ہو گئی ہیں۔ لہٰذا زر کی قدر میں ۹۰ فیصد کمی ہوئی۔

اس تفصیل سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ ''قیمتوں کا اشاریہ'' ایک تخمینی چیز ہے، تحقیقی نہیں، اس لئے کہ اس میں کونسی اشیاء لینی ہیں اس کا فیصلہ تخمینی ہے پھر ہر شے کو جو وزن دیا جاتا ہے وہ بھی تخمینی ہے، ہر شے کی جو قیمت لی جاتی ہے وہ بھی تخمینی ہے۔ بسا اوقات کئی معاملات کو ''قیمتوں کے اشاریئے'' سے وابستہ کر دیا جاتا ہے۔ جیسے کسی وقت پاکستان میں ملازمین کی تنخواہوں کو ''قیمتوں کے اشاریئے'' سے وابستہ کر دیا گیا تھا کہ روپے کی قدر میں جتنی کمی ہوگی، اتنا ہی تنخواہوں میں اضافہ ہوگا۔ کسی چیز کی قیمتوں کے اشاریئے سے وابستہ کرنے کو ''انڈیکسیشن (indexation) کہتے ہیں۔

افراطِ زر کا ادائیگیوں پر اثر

نوٹ کی ایک وہ قیمت ہے جو اس کے اوپر لکھی ہوئی ہوتی ہے، اس کو ''القیمۃ الاسمیۃ'' (Face Value) کہتے ہیں۔ اور ایک قوتِ خرید ہے اس کو ''القیمۃ الحقیقیۃ الاسمیۃ، Real Value) کہتے ہیں۔ لکھی ہوئی قیمت تو ایک ہی رہتی ہے، مگر حقیقی قیمت (قوتِ خرید) افراطِ زر کی صورت میں کم ہوتی ہے۔ اب کسی شخص کا دوسرے کے ذمے دین ہو تو وہ کچھ مدت کے بعد قیمتِ اسمیہ کے مطابق واپس کیا جائے یا قوتِ خرید کے مطابق؟ مثلاً کسی شخص کے دوسرے کے ذمے سو روپے تھے۔ ایک سال کے بعد سو روپے کی قوتِ خرید میں دس فیصد کمی آگئی تو قیمتِ اسمیہ کے مطابق تو سو کا نوٹ ہی دینا ہوگا اور قیمتِ حقیقیہ کے مطابق ایک سو دس روپے دینے ہوں گے۔ یہ سوال آج کل بہت زیادہ اٹھ رہا ہے کہ ادائیگی قیمت اسمیہ کے لحاظ سے ہوگی یا قیمت حقیقیہ کے لحاظ سے؟ اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ قیمت اسمیہ کیساتھ ادائیگی ہو تو اس میں قرض خواہ کا نقصان ہے اور اس پر ظلم ہے۔ خاص طور پر ان ممالک میں جہاں افراط زر کی شرح بہت تیز ہے۔ مثلاً بیروت کی کرنسی (لیرا) ایک وقت میں ڈالر کے قریب تھی اب اس کی قدر اتنی کم ہو گئی ہے کہ ایک ڈالر کے چھ سات سو لیرے ملتے ہیں۔ اس مسئلے کو حل کرنے کے لئے اقتصادیین اور علماء نے مختلف نقطہ نظر اپنائے ہیں، یہاں تمام نقطۂ نظر ذکر کیے جاتے ہیں اور ان پر تبصرہ بھی کیا جاتا ہے۔

۱۔ نوٹ قرض دیئے جائیں تو یہ دراصل وہ سونا قرض دیا گیا ہے، جو اس کی پشت پر ہے۔ اب اسی مقدار کا سونا لینا اس کا حق ہے۔ وہ اتنا ہی سونا یا اس کی قیمت روپے میں لے سکتا ہے۔ لیکن یہ نقطہ

نظر اس مفروضے پر مبنی ہے کہ نوٹ کی پشت پر سونا ہے۔ اور اس مفروضے کا غلط ہونا پہلے واضح ہو چکا ہے۔

۲۔　نوٹ کی پشت پر سونا ہو یا نہ ہو، بہر حال سمجھا یہی جائے گا کہ نوٹ کا لین دین دراصل سونے کا لین دین ہے، اس لئے کہ پہلے سونا ثمن تھا اب نوٹوں نے سونے کی جگہ لے لی ہے، لہٰذا نوٹ کا لین دین سونے کا لین دین ہے۔ لہٰذا ادائیگی سونے کی قیمت سے وابستہ ہے۔

یہ نقطۂ نظر بھی درست معلوم نہیں ہوتا، کیونکہ یہ بات طے شدہ ہے کہ اب نوٹ سونے کی نمائندگی نہیں کرتے ہیں یہ خود ثمن عرفی ہے اور فلوس کی طرح ہیں۔ ثمن عرفی اور فلوس کی اپنی ذاتی قدر کا اعتبار ہوتا ہے، ان کو ادائیگی میں سونے سے وابستہ نہیں کیا جاتا ہے۔ یہاں بعض لوگ حضرت امام ابو یوسفؒ کے مذہب سے استدلال کرتے ہیں ان کا مذہب یہ ہے کہ ادائیگی سے پہلے فلوس کی قیمت بڑھ گئی یا کم ہوگئی تو ادائیگی قیمت کے اعتبار سے ہوگی[1] لیکن یہ استدلال صحیح معلوم نہیں ہوتا اس لئے کہ نوٹ اور فلوس میں فرق ہے، فلوس سونے، چاندی سے مرتبط ہوتے تھے، فلوس کی قیمت سونے، چاندی کی بنیاد پر ہی طے ہوتی تھی، لہٰذا ان فلوس کی حیثیت دنانیر اور دراھم کی ریزگاری کی طرح تھی اور فلوس کو دارھم و دنانیر کیساتھ ایک خاص نسبت ہوتی تھی۔ مثلاً یہ کہ ایک فلس چاندی کے درھم کا عشر (دسواں حصہ) ہے۔ بازار کی اصطلاح میں اس نسبت کے بدلنے کو ہی فلوس کی قیمت میں کمی بیشی سے تعبیر کرتے تھے۔ ایسی صورت میں جب کہ فلوس سونے چاندی سے مرتبط ہوں اور دراہم و دنانیر کے لئے ریزگاری کی طرح ہوں امام ابو یوسفؒ فلوس کی قیمت ادائیگی کو ضروری قرار دیتے ہیں۔ نوٹوں کی صورت حال اس سے بالکل مختلف ہے، یہ سونے چاندی سے مرتبط نہیں، یہ مستقل ثمن اصطلاحی ہیں، ان کی اپنی ایک قدر ہے جس کا سونے چاندی سے کوئی تعلق نہیں۔

پھر اس زمانے کے فلوس اور نوٹوں میں ایک اور فرق بھی ہے۔ وہ یہ ہے کہ فلوس کی قیمت معلوم کرنے کے لئے ایک واضح معیار سونے چاندی کا موجود تھا۔ جس کو سامنے رکھ کر فلوس کی قیمت تحقیقی طور پر معلوم کی جاسکتی تھی، لیکن اب نوٹوں کی قدر کا تخمینی اندازہ تو لگایا جاسکتا ہے، قدر کا حقیقی علم نہیں ہوسکتا ہے، جیسا کہ قیمتوں کے اشاریئے کے مضمون میں یہ بات واضح ہو چکی ہے۔

۳۔　تیسرا نقطہ نظر جو زیادہ شد و مد سے پیش کیا جاتا ہے وہ انڈیکسیشن کا نظریہ ہے، یعنی ادائیگیوں کو ''قیمتوں کے اشاریئے'' (Price Index) سے وابستہ کیا جائے۔ اس نظریئے کی دلیل یوں پیش کی جاتی ہے کہ نوٹ بذاتِ خود کچھ نہیں، یہ "سلة البضائع" (Basket of Goods) یعنی کچھ اشیاء

---

(۱)　رسائل ابن عابدین، ص ۶۰، ج ۲۔

کی ٹوکری کی قوتِ خرید کی نمائندگی کرتے ہیں، لہٰذا جب کسی نے کسی کو کچھ نوٹ قرض دیئے تو گویا اس نے اس کو سلة البضائع" (Basket of Goods) دی ہے۔"الاقراض تقضی بامثالها" کا تقاضا یہ ہے کہ اب یہی (Basket of Goods) واپس کرے، جس کا طریقہ یہی ہے کہ ادائیگی کو (Price Index) (قیمتوں کے اشاریئے) سے وابستہ کیا جائے۔ یعنی ادائیگی کے وقت نوٹوں کی اتنی مقدار ادا کی جائے جو افراط زر کی شرح کے مساوی ہو، مثلاً سو روپے قرض دیئے تھے، اور ادائیگی کے وقت افراط زر میں دس فیصد اضافہ ہوا تو اب ایک سو دس روپے ادا کیے جائیں۔

فقہی لحاظ سے یہ نقطہ نظر بھی بوجوہ غلط ہے۔

پہلی وجہ تو یہ ہے کہ اگر نوٹ کی پشت پر کچھ مخصوص اور متعین اشیاء ہوتیں تو یہ کہا جا سکتا تھا کہ نوٹ دراصل "سلة البضائع" کی نمائندگی کرتا ہے، لیکن پیچھے واضح کیا جا چکا ہے کہ یہ "سلة البضائع" کوئی متعین چیز نہیں، یہ افراد کے لحاظ سے بدلتی رہتی ہے اور اس کی تعیین کا کوئی طریقہ بجز تخمینے کے نہیں ہے، لہٰذا دراصل "سلة البضائع" نوٹ کی حقیقت نہیں، بلکہ اس سے حاصل ہونے والا فائدہ ہے۔ چنانچہ کسی کو نوٹ دینے کا مطلب "سلة البضائع" دینا نہیں بلکہ ایسا آلۂ تبادلہ دینا ہے جس سے "سلة البضائع" خریدی جا سکتی ہے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ اس نظریہ کا حاصل یہ ہے کہ ادائیگی میں مثلیت باعتبار قیمت حقیقیہ (Real Value) معتبر ہونی چاہیے۔ صرف قیمت اسمیہ (Face Value) میں مثلیت کا اعتبار درست نہیں۔ شرعی نقطہ نظر سے جائزہ لیا جائے تو بات اس کے برعکس ہے، شرعاً قرض کی ادائیگی میں مقدار میں مثلیت کا اعتبار ہے، حقیقی قیمت میں مثلیت کا اعتبار نہیں۔ مثلاً کسی نے گندم قرض لی، جب واپسی کا وقت آیا تو وہ گندم کی اتنی ہی مقدار واپس کرے گا خواہ قیمت کم ہو یا زیادہ؟ اس بات پر کہ اعتبار مقدار کا ہوتا ہے، حقیقی قیمت کا نہیں ایک کافی واضح دلیل حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ یہ "نقیع" میں اُونٹ بیچا کرتے تھے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ بیع دراہم پر ہوتی تھی اور ادائیگی دنانیر میں ہوتی تھی اور کبھی بیع دنانیر میں ہوتی اور ادائیگی دراہم میں ہوتی۔ اس کے بارے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا گیا تو آپ نے اس شرط کے ساتھ اجازت دی کہ ادا کے دن کی قیمت کے مطابق ہو۔[1] اس سے معلوم ہوا کہ ذمے میں تو اسی چیز کی مقدار واجب ہوئی ہے جس کی بیع ہوئی تھی، پھر ادا کے وقت اس دن کی قیمت کے لحاظ سے تبادلہ ہو سکتا ہے۔ معلوم ہوا کہ دیون میں جو چیز واجب ہوتی ہے وہ دیون کی مقدار ہے نہ کہ قیمت، اگر قیمت واجب ہوتی تو وجوب کے دن کی

(۱) ابوداؤد کتاب البیوع، ص ۲۵، ج ۳، رقم ۳۳۵۴۔

قیمت کے لحاظ سے تبادلہ ہوتا۔

تیسری وجہ یہ ہے کہ اموال ربویہ میں شریعت نے حقیقی مماثلت کو ضروری قرار دیا ہے۔ اس لئے شریعت نے اموال ربویہ میں مجازفتہ کو جائز نہیں قرار دیا۔ اور ادائیگی کو ''قیمتوں کے اشاریئے'' کے ساتھ وابستہ کرنے میں مجازفة لازم آتی ہے۔ اس لئے کہ یہ بات پہلے واضح ہو چکی ہے کہ ''قیمتوں کا اشاریہ'' تخمینی ہوتا ہے۔

رہا یہ اشکال کہ نوٹ کی قوتِ خرید کم ہونے کے بعد بھی نوٹوں کی اتنی ہی مقدار واپس کرنا جتنی لی تھی، قرض خواہ پر ظلم ہے، اس کے جواب کے لئے درج ذیل باتیں ذہن میں رہنا مفید ہے۔

الف۔ روپے کی قدر کم ہونے میں مستقرض کے بھی کسی فعل کا دخل نہیں، لہٰذا اس کی ذمہ داری اس پر ڈالنا اس پر ظلم ہے۔

ب۔ کسی کو رقم دینے کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ کسی کے منافع میں شامل ہونے کے لئے اس کو رقم دی جائے، تو منافع میں شریک ہونے کا طریقہ قرض نہیں، بلکہ شرکت یا مضاربت ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ ہمدردی کے لئے کسی کو قرض دیا جائے۔ ہمدردی کے لئے کسی کو قرض دینا بالکل ایسے ہی ہے جیسے اپنے پاس رقم محفوظ کر لی جائے۔ اگر قرض دینے والا اپنے پاس رقم محفوظ رکھتا تو قدر میں کمی کا کوئی بھی ذمہ دار نہیں تھا، یہاں بھی کوئی ذمہ دار نہیں ہوگا۔

ج۔ اگر انڈیکسیشن صحیح اصول ہے تو یہ بینکوں کے کرنٹ اکاؤنٹ میں بھی جاری ہونا چاہیے، حالانکہ کرنٹ اکاؤنٹ میں اسے کوئی بھی جاری نہیں کرتا ہے۔

د۔ افراط زر (Inflation) کی صورت میں جیسے زیادہ ادائیگی کو ضروری سمجھا جاتا ہے تو تفریط زر (Deflation) کی صورت میں ادائیگی میں کمی بھی ہونی چاہیے، حالانکہ اس کا کوئی بھی قائل نہیں۔

البتہ جہاں کسی کرنسی کی قیمت اس حد تک گر جائے کہ کساد میں داخل ہو جائے جیسا کہ بیروت میں ہوا ہے تو اس کا حکم مختلف ہوسکتا ہے۔ اس کے علاوہ ایک اور بات علماء کے لئے قابل غور ہے، اور وہ یہ کہ زر کی قیمت میں کمی بعض اوقات اس طرح ہوتی ہے کہ خود حکومت اپنے سکے کی قیمت گرا دیتی ہے جسے (Devaluation) کہتے ہیں۔ اس صورت میں یہ پہلو غور طلب ہے کہ کیا اس صورت میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ حکومت نے پہلے سکے کو باطل کر کے ایک نیا سکہ جاری کیا ہے جس کی قیمت پہلے سکے سے کم ہے۔ اگر سکے کی قیمت میں حکومت کی طرف سے کمی کرنے کی یہ تشریح کی جاسکتی ہو تو اس وقت یہ کہا جاسکتا ہے کہ قرض کی ادائیگی سابق سکے کی قیمت کے برابر نئے سکے میں کی جائے۔ مثلاً کسی نے سو روپے اس وقت قرض لئے تھے جس وقت سو روپے چار ڈالر کے برابر تھے، بعد میں حکومت نے سو

روپے کی قیمت گرا کر اسے تین ڈالر کے برابر کر دیا۔ گویا ایک ایسا سکہ جاری کیا جو پہلے سکے کے مقابلے میں ۳۳ فیصد کم ہے، لہٰذا اب اسے نئے سکے کے ذریعہ ادائیگی کی جائے تو ۱۳۳ روپے دیئے جائیں۔ یہ مسئلہ اہل علم کے لئے قابل غور ہے، لیکن اس کا فیصلہ کرتے وقت یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ حکومت کی طرف سے روپے کی قیمت گرانے کا براہ راست اثر صرف بیرونی کرنسی کی شرح تبادلہ پر پڑتا ہے، اندرونی معاملات میں اس کا اثر بالواسطہ ہوتا ہے۔ دوسرے یہ کہ حقیقتاً نیا سکہ جاری نہیں کیا جاتا، بلکہ پرانے سکوں یا نوٹوں ہی کی قیمت میں تبدیلی کر دی جاتی ہے۔ لیکن نوٹ کی جو بھی قیمت ہے وہ اعتباری ہے، حقیقی نہیں، اس لئے حکومت کے اعلان سے معنوی طور پر وہ نوٹ بدل جاتا ہے۔

بینکاری
(Banking)

بینک کی تعریف

''بینک'' ایک ایسے تجارتی ادارے کا نام ہے جو لوگوں کی رقمیں اپنے پاس جمع کر کے تاجروں، صنعت کاروں اور دیگر ضرورت مندوں کو قرض فراہم کرتا ہے۔ آج کل روایتی بینک ان قرضوں پر سود وصول کرتے ہیں، اور اپنے امانت دار کو کم شرح پر سود دیتے ہیں، اور سود کا درمیانی فرق بینکوں کا منافع ہوتا ہے۔

بینک کی تاریخ

نظامِ زر کے ارتقاء کی گفتگو کرتے وقت بتایا گیا تھا کہ لوگ اپنا سونا صرافوں کے پاس بطور امانت رکھ دیتے تھے اور سنار اس کی رسید لکھ دیتے تھے، پھر رفتہ رفتہ ان رسیدوں سے ہی معاملات شروع ہو گئے۔ لوگ اپنا سونا لینے کم ہی واپس آتے تھے، تو یہ صورتحال دیکھ صرافوں نے سونا قرض دینا شروع کر دیا۔ پھر جب یہ دیکھا کہ لوگ عموماً رسیدوں سے ہی معاملات کرتے ہیں تو صرافوں نے بھی قرض خواہوں کو سونے کی بجائے رسیدیں دینی شروع کر دیں۔ اس طرح بینک کی صورت پیدا ہوئی۔ بعد میں اسی کو ایک منظم ادارے کی شکل دیدی گئی۔

بینک کا قیام

بینک بھی بنیادی طور پر ''جوائنٹ اسٹاک کمپنی'' ہے۔ اس کے قیام کا طریقہ وہی ہے جو کمپنی کے قیام کا ہوتا ہے۔

بینک لوگوں کو اپنی امانتیں جمع کرانے کی دعوت دیتا ہے۔ (جو فقہی طور پر قرض ہی ہوتا ہے) ان کو اردو میں ''امانتیں'' عربی میں ''ودائع'' اور انگریزی میں (Deposits) کہتے ہیں۔ ڈپازٹ کی کئی قسمیں ہوتی ہیں۔

۱۔ (Current Account) (کرنٹ اکاؤنٹ) اس کو عربی میں ''الحساب الجاری''

اور اردو میں ''مدرواں'' کہتے ہیں۔اس میں رکھی ہوئی رقم پر سود نہیں ملتا۔اس اکاؤنٹ میں رکھی رقم کسی وقت بھی، جتنی مقدار میں چاہیں بغیر کسی پابندی کے نکلوائی جاسکتی ہے۔

۲ (Saving Account) جس کو عربی میں "حساب التوفیر" اور اردو میں ''بچت کھاتہ'' کہتے ہیں۔اس میں رقم نکلوانے پر عموماً مختلف پابندیاں ہوتی ہیں،اس پر بینک سود دیتا ہے۔

۳۔ (Fixed Deposit) جس کو عربی میں ''ودائع ثابتہ'' کہتے ہیں۔اس میں مقررہ مدت سے پہلے رقم واپس نہیں لی جاسکتی۔اس میں بھی بینک سود دیتا ہے اور سود کی شرح مدت کے مطابق ہوتی ہے۔طویل مدت میں شرح سود زیادہ ہوتی ہے اور کم مدت پر شرح کم ہوتی ہے۔

جب ان تین قسم کے ڈپازٹ سے بینک کے پاس سرمایہ جمع ہو جاتا ہے اور کچھ بینک کا ابتدائی سرمایہ بھی ہوتا ہے تو اس تمام سرمائے کے استعمال کا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ اس سرمائے کا ایک مقررہ حصہ سیال شکل میں اسٹیٹ بینک کے پاس جمع کرانا ضروری ہوتا ہے،مرکزی بینک میں یہ سرمایہ عموماً ایسے سرکاری تمسکات کی شکل میں رہتا ہے جو بآسانی نقد کی شکل میں تبدیل کیے جاسکیں اور ان پر کچھ سود بھی ملتا رہتا ہے۔مرکزی بینک یہ طے کرتا ہے کہ تجارتی بینک اپنی امانتوں کا کتنے فیصد حصہ مرکزی بینک میں رکھیں گے۔ حالات کے لحاظ سے یہ تناسب بدلتا رہتا ہے۔آجکل امانتوں کا تقریباً چالیس فیصد حصہ اسٹیٹ بینک میں رکھوانا پڑتا ہے۔اسٹیٹ بینک تمام بینکوں کو اس بات کا پابند بناتا ہے۔اس لئے کہ بینک میں بے شمار افراد کی رقمیں ہوتی ہیں۔ اسٹیٹ بینک کے فرائض میں داخل ہے کہ ڈپازیٹر کے مفادات کا تحفظ کرے۔سیال سرمائے سے مراد وہ سرمایہ جو نقد ہو یا جلدی نقد پذیر ہو۔اس کو عربی میں ''السیولۃ'' انگریزی میں (Liquidity) اور اردو میں ''نقد پذیری'' کہتے ہیں۔اس میں کیش دوسرے بینک میں اکاؤنٹس اور ایسی دستاویزات شامل ہیں جو بسہولت نقد میں تبدیل ہوسکتی ہوں جیسے سرکاری تمسکات وغیرہ۔ پھر بینک کچھ سیال سرمایہ اپنے پاس بھی رکھتا ہے، تاکہ ڈپازیٹر کے مطالبات پورے کرسکے۔

بینک کے وظائف

بینک سرمایہ جمع کرنے کے بعد کئی وظائف ادا کرتا ہے۔مثلاً تمویل، تخلیق زر، برآمد، درآمد میں واسطہ بننا وغیرہ۔ یہاں ان وظائف کی قدرے وضاحت کی جاتی ہے۔

تمویل

(Financing)

بینک کا سب سے اہم کام لوگوں کی ضروریات، خصوصاً تجارتی ضروریات کے لئے قرض فراہم کرنا ہے۔ بینک کبھی طویل المیعاد قرضے جاری کرتا ہے، ایسے قرضوں کو عربی میں ''ائتمان طویل الاجل" اور انگریزی میں (Long Term Credit) کہتے ہیں۔ اور کبھی قصیر المیعاد قرضے جاری کرتا ہے جو عموماً تین ماہ یا چھ ماہ تک کے لئے ہوتے ہیں۔ ان کو عربی میں "ائتمان قصیر الاجل" اور انگریزی میں (Short Term Credit) کہتے ہیں۔

بینک سے لوگ تین طرح کے قرضے لیتے ہیں۔ (۱) روزمرہ کی تجارتی ضروریات کے لئے قرض لیا جاتا ہے۔ مثلاً بلوں کی ادائیگی اور تنخواہوں کی ادائیگی کے لئے قرض لیا جاتا ہے۔ ان کو (Over Head Expenses) کہتے ہیں۔ (۲) کاروبار کے رواں اخراجات مثلاً سامانِ تجارت کی خریداری اور خام مال وغیرہ خریدنے کے لئے قرضے حاصل کیے جاتے ہیں۔ ان کو عربی میں ''راس المال العامل" اور انگریزی میں (Working Capital) کہتے ہیں۔ (۳) بڑے بڑے منصوبوں کے لئے جو قرض لئے جائیں ان کو عربی میں ''تمویل المشاریع" اور انگریزی میں (Project Financing) کہتے ہیں۔

قرض دینے کا طریق کار

بینکوں کو قرض دینے کا غیر محدود اختیار نہیں ہوتا کہ جہاں چاہیں اور جتنی مقدار میں چاہیں قرض فراہم کریں، بلکہ مرکزی بینک کی طرف سے ایک حد مقرر ہوتی ہے، اس کے پابند رہتے ہوئے بینک قرضے فراہم کر سکتے ہیں، اس حد کو عربی میں ''سقف الاعتماد" اور انگریزی میں ...... (Credit Ceiling) کہتے ہیں۔ مثلاً آج کل مرکزی بینک کی طرف سے جو ہدایت ہے وہ یہ ہے کہ بینک اپنی تمام امانتوں کا (۴۰% فیصد) مرکزی بینک کے پاس رکھواتا ہے، جس کو عربی میں ''احتیاطی السیولۃ" اور انگریزی میں (Reserve Liquidity) کہتے ہیں۔ اور پانچ فیصد بینک اپنے پاس نقد (Cash) کی صورت میں رکھتا ہے۔ اور تیس فیصد (۳۰%) کی حد تک پرائیویٹ افراد یا اداروں کو قرض فراہم کرسکتا ہے۔ باقی پچیس فی صد (۲۵% فیصد) سے یا تو سرکاری تمسکات

خریدے یا سرکاری اداروں کو قرضہ فراہم کرے، جیسے پی، آئی، اے، واپڈا، اسٹیل ملز وغیرہ۔

"سقف الاعتماد" مقرر کرنے میں کئی عوامل کا دخل ہوتا ہے۔ مثلاً کبھی کسی خاص شعبے مثلاً زراعت یا صنعت وغیرہ میں زیادہ تمویل مطلوب ہوتی ہے تو بینکوں کا رخ ادھر کر دیا جاتا ہے، کبھی افراط زر کو کنٹرول کرنے کے لئے حد مقرر کی جاتی ہے۔ اس لئے کہ بینکوں کے زیادہ قرضے جاری کرنے سے بھی افراط زر میں اضافہ ہوتا ہے، جیسا کہ آگے "تخلیق زر" کے عنوان کے تحت اس کی وضاحت ہوگی۔ اور کبھی مروجہ ٹیکسوں سے حکومت کے اخراجات پورے نہیں ہو رہے ہوتے اور مزید ٹیکس لگانا مشکل ہوتا ہے۔ تو مرکزی بینک کا (Reserve) بڑھا کر اور بینکوں کو سرکاری تمسکات خریدنے کا پابند کر کے عوام کی رقوم کا ایک بڑا حصہ حکومت قرض لے لیتی ہے۔

"سقف الاعتماد" کے اندر رہتے ہوئے بینکوں کے قرض دینے کا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ سب سے پہلے بینک یہ جائزہ لیتا ہے کہ جو شخص قرض لے رہا ہے وہ مقررہ مدت تک قرض واپس بھی کر دے گا یا نہیں؟ اس کی جائیدادیں اور مملوکات کیا ہیں؟ جائزہ لینے کے بعد بینک ایک حد مقرر کر دیتا ہے کہ اتنی مدت میں ہم اتنا قرض دینے کے لئے تیار ہیں، جو حسب ضرورت وقتاً فوقتاً لیا جا سکے گا۔ قرض کی حد مقرر کرنے کو عربی میں "تحدید السقف" اور انگریزی میں (Sanction of the Limit) کہتے ہیں۔ اس تحدید کے بعد اس شخص کے لئے بینک میں ایک اکاؤنٹ کھول دیا جاتا ہے۔ اس اکاؤنٹ سے وہ جب چاہے جتنا چاہے قرض لے سکتا ہے۔ اس اکاؤنٹ کھولنے پر بینک بہت خفیف شرح سے سود بھی لیتا ہے (مثلاً ۵ء % فیصد یا ۱% فیصد) اور جب وہ قرض لے لیتا ہے تو باقاعدہ شرح سے سود لیا جاتا ہے۔ اس مدت کے دوران عموماً یہ ہوتا ہے کہ ایک رقم بینک سے لے کر اس میں سے جو بچ جائے وہ دوبارہ بینک میں واپس کر دی جاتی ہے۔ اس طرح رقم لینے اور واپس کرنے کا سلسلہ چلتا رہتا ہے۔ مدت کے اختتام پر بینک حساب کرتا ہے کہ کتنی رقم کتنے دن اس کے پاس رہی۔ اس حساب کے مطابق اس سے سود لیا جاتا ہے۔

بینک کی اقسام (باعتبار تمویل)

بینک کی کئی قسمیں ہیں۔ بعض بینک خاص شعبوں میں تمویل کرتے ہیں اور بعض عمومی تمویل کرتے ہیں۔ اس طرح بینکوں کی اقسام یہ ہیں۔

۱۔ زرعی بنک۔ جس کو عربی میں "المصرف الزراعی" اور انگریزی میں (Agricultural Bank) کہتے ہیں۔ یہ بینک زراعت کے شعبوں میں قرض فراہم کرتا ہے۔

۲۔ صنعتی بنک ۔ جس کو عربی میں ''المصرف الصناعی'' اور انگریزی میں (Industrial Bank) کہتے ہیں اس کا کام صنعتی ترقی کے لئے قرض فراہم کرنا ہے۔

۳۔ ترقیاتی بنک ۔ جو بینک کسی بھی شعبے میں ترقیاتی کاموں کے لئے قرضے دیتے ہیں ان کو ''ترقیاتی بنک'' کہتے ہیں جن کو عربی میں ''بنوك التنمية'' اور انگریزی میں (Development Bank) کہتے ہیں۔

۴۔ کوآپریٹو بنک ۔ (Cooperative Bank) اس کو عربی میں ''المصرف التعاونی'' کہہ سکتے ہیں۔ یہ بینک امداد باہمی کی بنیاد پر قائم ہوتا ہے۔ اس کا دائرہ کار ممبران تک محدود ہوتا ہے۔ جو لوگ اس کے ممبر ہوتے ہیں، انہی کے ڈپازٹ ہوتے ہیں اور انہی کو قرض دیا جاتا ہے۔

۵۔ انوسٹمنٹ بنک ۔ (Investment Bank) عربی میں ''بنک الاستثمار'' کہتے ہیں، بظاہر مختلف ممالک میں یہ اصطلاح مختلف مفہوم کے لئے استعمال ہوتی رہی ہے۔ ہمارے ہاں اس سے مراد ایسا بینک ہوتا ہے جس میں ڈپازٹ متعینہ مدت کے لئے ہوتے ہیں، عام کرنٹ اکاؤنٹ یا سیونگ اکاؤنٹ اس میں نہیں ہوتے، صرف فکسڈ ڈپازٹ ہوتے ہیں، اور قرضے نہیں دیئے جاتے۔ ان تمام بینکوں کا دائرہ کار محدود ہوتا ہے۔

۶۔ کمرشل بنک ۔ ایسے بینک جو عمومی تمویل کا کام کرتے ہیں، کسی شعبے کے ساتھ مخصوص نہیں ہوتے ان کو ''کمرشل بنک'' (Commercial Bank) اور عربی میں "البنك التجاری" کہتے ہیں۔

درآمد، برآمد میں بینک کا کردار

بینک کے وظائف میں یہ بھی داخل ہے کہ بینک بین الاقوامی تجارت (درآمد و برآمد) میں ایک لازمی ذریعہ ہے۔ بینک کی وکالت اور معرفت کے بغیر برآمد اور درآمد ممکن نہیں۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ جب کوئی شخص دوسرے ملک سے کوئی چیز درآمد کرنا چاہتا ہے تو دوسرے ملک کا تاجر اس بات کا اطمینان چاہتا ہے کہ جب میں مطلوبہ سامان خریدار کو بھیجوں گا تو وہ واقعتاً قیمت کی ادائیگی کر دے گا۔ لہٰذا درآمد کنندہ برآمد کنندہ کو اعتماد دلانے کے لئے بینک سے ایک ضمانت نامہ حاصل کرتا ہے، جس میں بینک بیچنے والے کو اس بات کی ضمانت دیتا ہے کہ یہ چیز فلاں کو فروخت کر دی جائے تو ادائیگی کا ذمہ دار میں ہوں گا۔ اس کو عربی میں ''خطاب الضمان'' یا ''خطاب الاعتماد'' کہتے ہیں۔ اور انگریزی میں (Letter of Credit) کہتے ہیں۔ آسانی کے لئے ایل

سی (L/C) کہہ دیا جاتا ہے۔ یہ ضمانت نامہ حاصل کرنے کو ایل۔سی کھلوانا اور عربی میں "فتح الاعتماد" کہتے ہیں۔ بینک ایل۔سی کھول کر برآمد کنندہ کے بینک کو بھیج دیتا ہے۔ برآمد کنندہ کے بینک کو (Negotiating Bank) کہتے ہیں۔ایل۔سی پہنچنے کے بعد وہاں سے مال جہاز میں بک کرادیا جاتا ہے۔اور جہاز ران کمپنی مال بک ہونے کی رسید جاری کرتی ہے، اس رسید کو عربی میں "بولیصة الشحن" اور انگریزی میں (Bill of Lading) کہتے ہیں۔ برآمد کنندہ کا بینک یہ بل آف لیڈنگ مع کاغذات کے ایل۔سی کھولنے والے بینک کو بھیجتا ہے۔ درآمد کنندہ اپنے بینک سے یہ کاغذ وصول کر کے ایل۔سی سے اس کی مطابقت کرتا ہے۔ان کاغذات میں مال کی جو تفصیل لکھی گئی ہے وہ آرڈر کے خلاف ہو تو کاغذات واپس کر دیئے جاتے ہیں۔اگر کاغذات کی تفصیل ایل،سی کے موافق ہو تو یہ کاغذات دکھا کر بندرگاہ سے مال وصول کر لیا جاتا ہے۔اور بینک یہ کاغذات درآمد کنندہ کو اس وقت دیتا ہے جب وہ قیمت کی ادائیگی کر دے۔ ادائیگی کے لئے بھی بینک اور درآمد کنندہ کے درمیان مختلف معاہدے ہوتے ہیں۔کبھی درآمد کنندہ ایل۔سی کھلواتے وقت ہی پوری رقم کی ادائیگی کر دیتا ہے۔اس صورت کو اصطلاح میں یہ کہا جاتا ہے کہ فل مارجن (Full Margin) پر ایل۔سی کھلوائی گئی ہے،عربی میں اس کو "فتح الاعتمادبغطاء کامل" کہتے ہیں،کبھی ساری ادائیگی بینک سے کاغذات چھڑوانے کے وقت کی جاتی ہے اس کو یہ کہا جاتا ہے کہ "زیرو مارجن" پر ایل۔سی کھلوائی گئی ہے۔کبھی ایل۔سی کھلوانے کے وقت تھوڑی ادائیگی کی جاتی ہے۔اس صورت میں کل رقم کا جتنا ادا کیا گیا ہے اتنے ہی فیصد مارجن پر ایل۔سی کھولنا کہتے ہیں۔مثلاً کل قیمت کا (۲۵٪ فیصد) حصہ ایل۔سی کھلواتے وقت بینک میں جمع کرا دیا گیا تو کہا جائے گا کہ یہ ایل۔سی ۲۵ فیصد مارجن پر کھلوائی گئی ہے۔

کبھی یہ معاہدہ بھی ہوتا ہے کہ کاغذات آنے پر بینک اپنی طرف سے ادائیگی کر دے گا اور درآمد کنندہ ایک معین مدت کے بعد ادائیگی کرے گا۔اس صورت میں بینک کا قرض درآمد کنندہ کے ذمے ہو جاتا ہے جس پر عموماً بینک سود لیتا ہے۔

ایل۔سی پر فیس

بینک کو ایل۔سی کھولنے کے وقت جو خدمات ادا کرنی پڑتی ہیں،ان پر بینک معاوضہ لیتا ہے۔ درآمد کنندہ کے بینک کی تین خدمات ہوتی ہیں۔

۱۔ وکالت (Agency) یعنی بینک درآمد کنندہ کا وکیل بن کر برآمد کنندہ سے معاملات کرتا ہے،

خریدار کے کاغذات برآمد کنندہ کو بھیجتا ہے، اور برآمد کنندہ کے بھیجے ہوئے کاغذات وغیرہ درآمد کنندہ کو سپرد کرتا ہے۔ ان خدمات پر بینک اجرت لیتا ہے۔

۲۔ ضمانت (Guarantee) یعنی اس بات کی ضمانت لیتا ہے کہ اگر خریدار نے رقم ادا نہیں کی تو وہ رقم ادا کرے گا۔ اس پر بھی اجرت لیتا ہے۔

۳- قرض (Credit) یعنی جب تاجر قیمت کی ادائیگی فوراً نہ کرے، اور بینک اس کی طرف سے ادائیگی کر دے تو یہ رقم درآمد کنندہ کے ذمے اس کا قرض ہو جاتی ہے۔ جس پر وہ درآمد کنندہ سے سود وصول کرتا ہے۔

قرضہ دو نوعیت کا ہو سکتا ہے۔ کبھی تو باقاعدہ قرضہ لیا جاتا ہے جب کہ یہ معاہدہ ہو کہ بروقت ادائیگی بینک کرے گا اور درآمد کنندہ کچھ عرصہ بعد بینک کو اس کی ادائیگی کرے گا۔ یہ ایک الگ معاہدہ ہوتا ہے ایل۔سی کی فیس کا اس سے کوئی تعلق نہیں ہوتا، اس پر الگ سے باقاعدہ شرح سے سود لیا جاتا ہے۔ کبھی باقاعدہ تو قرض نہیں لیا جاتا، لیکن خود بخود معاملات کے درمیان میں بینک کا ایل۔سی کھلوانے والے کے ذمے قرض ہو جاتا ہے۔ یہ اس طرح ہوتا ہے کہ کبھی ایل۔سی کھلواتے وقت پوری ادائیگی ہو جاتی ہے، اس کو ۱۰۰ فیصد شرح پر ایل۔سی کھلوانا کہتے ہیں۔ کبھی کچھ ادائیگی ہوتی ہے مثلاً ۲۵ فیصد کی ادائیگی پر ایل۔سی کھلوائی گئی اس کو ۲۵ فیصد شرح پر ایل۔سی کھلوانا کہتے ہیں۔ کبھی ایل۔سی کھلواتے وقت بالکل بھی ادائیگی نہیں ہوتی اس کو زیرو مارجن پر ایل۔سی کھلوانا کہتے ہیں اب اس صورت میں جب کہ ادائیگی کے بغیر یا کچھ ادائیگی پر ایل۔سی کھولی گئی ہو کاغذات آتے ہی بینک ادائیگی کر دے گا، بشرطیکہ سامان کے کاغذات ایل۔سی کی شرائط کے مطابق ہوں اور کوئی عدم ادائیگی نہ پائی گئی ہو، مگر درآمد کنندہ کی طرف سے کسی وجہ سے ادائیگی میں چند دن تاخیر ہو جاتی ہے۔ مثلاً اس لئے تاخیر ہو گئی کہ بینک کی طرف سے رابطہ کرنے میں تاخیر ہو گئی۔ ایسی صورت میں اتنے دن کا قرضہ خود بخود ہو جاتا ہے۔ اس قرضہ پر بھی سود لیا جاتا ہے۔ دوسری طرف برآمد کنندہ کا بینک ضمانت کسی چیز کی نہیں دیتا۔ یہاں بینک کے دو ہی کام ہوتے ہیں، جن پر وہ معاوضہ لیتا ہے۔

۱- وکالت

۲- قرض

یہاں قرض اس طرح ہوتا ہے کہ ایل۔سی میں کبھی تو معاہدہ یہ ہوتا ہے کہ کاغذات آتے ہی ادائیگی ضروری ہوگی، اس کو (L.C at Sight) کہتے ہیں، اس صورت میں برآمد کنندہ کے بینک کو کوئی قرض نہیں دینا پڑتا۔ کبھی معاہدہ یہ ہوتا ہے کہ کاغذات پہنچنے کے اتنے دن بعد خریدار کی طرف

سے ادائیگی ہوگی تو اس صورت میں اگر درآمد کنندہ کا بینک برآمد کنندہ تاجر کو فوراً ادائیگی کردے تو یہ بینک کا برآمد کنندہ کے ذمے قرض ہو جائے گا۔

درآمد کنندہ کے پاس کبھی درآمد کے لئے رقم نہیں ہوتی یا رقم تو ہوتی ہے، مگر وہ اس رقم کو درآمد پر لگا کر منجمد نہیں کرنا چاہتا، تو وہ بینک سے قرض لے کر درآمد کرتا ہے۔ درآمد کے لئے بینک جو قرض دیتا ہے اس کو عربی میں ''تمویل الواردات'' اور انگریزی میں (Import Financing) کہتے ہیں۔ ایسے ہی درآمد کے لئے بھی بینک سے قرض لیا جاتا ہے، یعنی کسی تاجر کے پاس باہر کے کسی ملک سے اشیاء کی خریداری کا آرڈر ہوتا ہے، لیکن وہ اشیاء تیار یا مہیا کرنے کے لئے اس کو رقم کی ضرورت ہوتی ہے جو وہ بینک سے قرض لیتا ہے اور قرض لے کر مطلوبہ اشیاء فراہم کر کے برآمد کرتا ہے اس صورت میں بینک برآمد کنندہ کو جو قرض دیتا ہے اس کو ''تمویل الصادرات'' اور انگریزی میں (Export Financing) کہتے ہیں۔

ہر حکومت برآمدات کی حوصلہ افزائی کرتی ہے تا کہ ملک کا سامان باہر فروخت ہو تو اس سے زرمبادلہ ملک میں آئے۔ پاکستان میں بھی برآمدات کی حوصلہ افزائی کے لئے ''اسٹیٹ بینک آف پاکستان'' نے ایک اسکیم جاری کی ہے، جس کو (Export Refinancing) (اعادة تمو يل الصادرات) کہتے ہیں۔ اس کا طریق کار پہلے یہ تھا کہ مرکزی بینک نے ملک کے کمرشل بینکوں کو یہ ہدایت جاری کی تھی کہ برآمدات کے لئے دیئے جانے والے قرضوں پر سود کم شرح سے وصول کیا کریں، مثلاً عام شرح سود ۱۵ فیصد ہوتی ہے تو برآمداتی قرضوں پر آٹھ فیصد سود لیا کریں۔ اس طرح جو کمرشل بینک قرضے دے گا، مرکزی بینک اتنی ہی رقم اس بینک کو دے دے گا، اور آٹھ فیصد سود میں سے پانچ فیصد سود مرکزی بینک لے گا اور تین فیصد سود کمرشل بینک کا ہوگا، اس صورت میں بینکوں کو یہ فائدہ ہوتا تھا کہ ان کو اپنی رقم لگائے بغیر تین فیصد سود مل جاتا تھا۔ کیونکہ قرض کی رقم مرکزی بینک نے مہیا کی تھی۔

اب اس کے طریق کار میں یہ تبدیلی ہوگئی ہے کہ مرکزی بینک کمرشل بینک کو اتنی رقم دینے کی بجائے اس بینک کے نام کا ڈپازٹ اکاؤنٹ کھول دیتا ہے اور اس پر ٹریژری بل[1] کے حساب سے اس کمرشل بینک کو سود دیتا ہے، جو عموماً چودہ یا پندرہ فیصد ہوتا ہے۔ اور کمرشل بینک کو جو آٹھ فیصد سود قرض لینے والے کی طرف سے ملے گا اس میں سے پانچ فیصد مرکزی بینک کو دے گا۔ اس صورت میں کمرشل بینک کو اس میں سے تین فیصد سود بچے گا اور چودہ یا پندرہ فیصد سود مرکزی بینک کی طرف سے

(۱) اس کی وضاحت مرکزی بنک کے وظائف کے بیان میں ہوگی۔ اس پر نیلام۔ کے ذریعے سود طے ہوتا ہے۔

ملے گا۔اس کا مقصد برآمدات میں تمویل کی حوصلہ افزائی ہے۔

بل آف ایکسچینج

بل آف ایکسچینج ایک خاص قسم کی دستاویز ہے۔ جب کوئی تاجر اپنا مال فروخت کرتا ہے تو خریدار کے نام بل بناتا ہے بعض اوقات اس بل کی ادائیگی آئندہ تاریخ میں واجب ہوتی ہے۔اس بل کو دستاویزی شکل دینے کے لئے مدیون اس کو منظور کر کے اس پر دستخط کر دیتا ہے کہ میرے ذمے اس بل کی ادائیگی فلاں تاریخ کو واجب ہے۔اس کو عربی میں "کمبیالة" اردو میں ''ہنڈی'' اور انگریزی میں (Bill of Exchange) کہتے ہیں۔بل آف ایکسچینج میں ادائیگی کی جو تاریخ لکھی ہوئی ہوتی ہے اس تاریخ کے آجانے کو عربی میں ''نضج الکمبیالة" اور انگریزی میں (Maturity) کہتے ہیں۔اس تاریخ ادائیگی کو (Maturity Date) کہتے ہیں۔ہنڈی میں لکھا ہوا دین تو مدیون سے تاریخ آنے پر ہی لیا جاسکتا ہے۔مگر دائن کو فوری طور پر رقم کی ضرورت ہوتی ہے تو کسی تیسرے شخص کو وہ بل دے کر لکھی ہوئی رقم لے لیتا ہے اور بل کی پشت پر دستخط کر کے اس کے حقوق اس تیسرے شخص کی طرف منتقل کر دیتا ہے۔تیسرا شخص اس پر لکھی ہوئی رقم میں سے کٹوتی بھی کرتا ہے۔مثلاً ہنڈی پر ایک ہزار روپے لکھے ہوئے ہیں تو وہ نوسو پچاس (۹۵۰) روپے دیتا ہے،اس عمل کو عربی میں ''خصم الکمبیالة" اور انگریزی میں (Discounting of the Bill of Exchange) اور اردو میں ''بٹہ لگانا'' کہتے ہیں اور ہنڈی کی پشت پر جو دستخط کیے جاتے ہیں اس کو عربی میں "تظهير" اور انگریزی میں (Endorsement) کہتے ہیں۔اور اردو میں ''عبارت ظہری لکھنا'' کہتے ہیں ہنڈی پر بٹہ لگانے کی شرح (Maturitry)(نضج الکمبیالة) کو مدنظر رکھ کر طے ہوتی ہے۔تاریخ ادائیگی جتنی قریب ہوتی جائے،بٹہ لگانے کی شرح کم ہوتی جاتی ہے۔

بینک بھی بل آف ایکسچینج کی ڈسکاؤنٹنگ کرتے ہیں اور یہ بینکوں کے قصیر المیعاد قرضوں میں داخل ہے۔اس لئے کہ بل آف ایکسچینج کی ادائیگی عموماً تین ماہ میں ہوتی ہے۔

تخلیقِ زر کا عمل

بینک کا ایک اہم کردار جس کا ذکر یہاں بہت ضروری ہے وہ یہ ہے کہ بینک پہلے سے موجود زر میں اضافہ کر کے زر کے پھیلاؤ کو بڑھاتا ہے اور رسد میں اضافے کا کام انجام دیتا ہے،اس کو ''تخلیق زر'' یا ''تخلیق اعتبار'' کہتے ہیں۔ذیل میں اس کی وضاحت کی جاتی ہے۔

لوگوں کے پاس جو رقم آتی ہے اس میں سے بہت تھوڑا سا حصہ اپنے پاس رکھتے ہیں، اس کا زیادہ حصہ بینک میں رکھتے ہیں۔ اسی طرح جب لوگ بینک سے قرض لیتے ہیں تو نقد کی شکل میں لینا ضروری نہیں سمجھتے ہیں، بلکہ قرض دینے کی عموماً صورت یہ ہوتی ہے کہ بینک قرض لینے والے کا اکاؤنٹ کھول کر اس کو چیک بک دیدیتا ہے، تاکہ بوقت ضرورت چیک جاری کر کے بذریعہ چیک ادائیگی کر سکے۔ مثلاً کسی نے بینک سے ایک لاکھ روپے کا قرضہ لیا تو بینک اس کو نقد ایک لاکھ دینے کی بجائے ایک لاکھ روپے کا اس کے نام اکاؤنٹ کھول کر چیک بک اس کو دیدیتا ہے۔ اب اس کو جب بھی کہیں کسی رقم کی ادائیگی کرنا ہوگی تو وہ چیک جاری کر کے ادائیگی کرے گا۔ ان دو باتوں کو سامنے رکھ کر غور کیا جائے تو اندازہ ہوگا کہ بینک کے پاس جتنے نوٹ موجود ہوتے ہیں اس سے کئی گنا زیادہ کا فائدہ اٹھایا جا رہا ہوتا ہے۔ وہ اس طرح کہ جب کسی بینک کے پاس کچھ نوٹ آئے تو بینک مرکزی بینک کا ریزرو نکال کر باقی رقم لوگوں کو قرض دیدے گا۔ جس نے قرض لیا یا تو وہ نقد لے گا ہی نہیں، بلکہ اکاؤنٹ کھلوا کر چیک بک لے گا یا لے کر دوبارہ اسی بینک میں رکھوائے گا۔ اس سے جتنی رقم کا مزید اکاؤنٹ کھولا گیا زر میں اتنا اضافہ ہوا، حالانکہ نوٹ اتنے ہی ہیں جتنے رکھے گئے تھے، پھر قرضدار کا نیا اکاؤنٹ کھولنے سے جو نیا ڈپازٹ بینک کے پاس آیا ہے اس میں سے بھی ریزرو نکال کر باقی رقم بینک آگے دے گا۔ جو شخص رقم لے گا وہ پھر بینک میں رکھوائے گا تو اس سے زر میں مزید اضافہ ہوگا، اس طرح زر میں کئی گنا اضافہ ہو جائے گا اس کو "تخلیق زر" کہتے ہیں۔

مثلاً کسی بینک میں کسی شخص نے ۱۰۰ روپے رکھے۔ بینک نے اس میں سے بیس فیصد یعنی بیس روپے مرکزی بینک کو دے کر باقی اسّی روپے کسی کو قرض دیدیئے۔ اس نے یہ اسی روپے پھر اسی بینک میں رکھ دیئے۔ تو اب بینک کے پاس کل ایک سو اسی روپے کے ڈپازٹ ہو گئے۔ اس کا بیس فیصد یعنی چھتیس روپے (جس میں سے بیس روپے پہلے دے چکا ہے، اس لئے مزید سولہ روپے) مرکزی بینک کو دے کر ۱۴۴ روپے پھر کسی کو قرض دے گا اور وہ بھی اسی بینک میں رکھوائے گا تو بینک کے ڈپازٹ میں ۱۴۴ روپے کا اضافہ ہو جائے گا اور بینک کے پاس ۳۲۴ روپے کے ڈپازٹ ہو جائیں گے۔ اس رقم کا بیس فیصد یعنی ۶۴٫۸۰ روپے (جس میں سے چھتیس روپے پہلے دے چکا ہے، مزید ۲۸٫۸۰ روپے) مرکزی بینک کو دے کر باقی ۱۱۵٫۲۰ روپے کا پھر قرض دے گا اور وہ شخص دوبارہ اسی بینک میں رکھ دے گا۔ اس طرح اب بینک کے پاس ۴۳۹٫۲۰ روپے کے ڈپازٹ ہو گئے، اس طرح بینک مزید قرض دیتا رہتا ہے یہاں تک کہ رقم ختم ہو جاتی ہے۔ اس مثال میں بینک کے پاس سو روپے تھے، مگر اس سے فائدہ ۴۳۹ روپے کا حاصل کیا جا رہا ہے، ہر ڈپازٹ ہولڈر اپنے اپنے ڈپازٹ کی بنیاد پر چیک جاری کر

سکتا ہے۔ تو گویا ۲۹۵ روپے کے چیک جاری ہو سکتے ہیں، جب کہ اصل میں سو روپے تھے مزید ۱۹۵ روپے بینک کے تخلیق کردہ ہیں اور بینک کا یہ عمل "تخلیق زر" ہے۔ اس مثال میں ایک بینک فرض کر کے یہ کہا گیا ہے کہ قرض لینے والا اسی بینک میں رقم رکھوائے گا۔ لیکن عملاً یہ بھی ہوتا ہے کہ وہ رقم اس بینک کے علاوہ کسی اور بینک میں بھی رکھوادے، اس کے نتیجہ میں دوسرے بینک کے ڈپازٹ بڑھ جائیں گے۔ بہر کیف! بنک سے لیے جانے والے قرض کے نتیجے میں کسی نہ کسی بینک کے ڈپازٹ میں اضافہ ہوگا۔ تو اس کے نتیجہ میں تمام بینکوں کا مجموعہ تخلیق زر کا عمل کرے گا۔

بینک کے زر کو بڑھانے میں ایک اور چیز کا بہت دخل ہے، جس کو اصطلاح میں فلوٹ (Float) کہتے ہیں۔ بینک کے پاس جو رقم ڈپازٹ کے طور پر ہے، اس پر بینک کو سود دینا پڑتا ہے۔ یہ سود ان ڈپازٹس کی لاگت (Cost) ہے یعنی یہ سود دے کر بینکوں کو یہ ڈپازٹ حاصل ہوئے۔ لیکن کبھی رقم کچھ مدت کے لئے رہتی تو بینک کے پاس ہی ہے، مگر اس مدت میں وہ بینک کے ڈپازٹ میں شامل نہیں ہوتی اور اس پر بینک کو سود نہیں ادا کرنا پڑتا۔ یہ بینک کا ایسا زر ہے جس پر لاگت کچھ بھی ادا نہیں کرنی پڑتی۔ ایسا کئی صورتوں میں ہوتا ہے، مثلاً ایک بینک کی طرف سے کسی دوسرے بینک کا چیک جاری کیا گیا تو اس بینک کی طرف سے دوسرے بینک کی طرف رقم منتقل ہونے میں کچھ مدت لگ جاتی ہے۔ اس دوران یہ رقم بینک کا فلوٹ ہے۔ اسی کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ بینک نے کسی کو ڈرافٹ دیدیا، جب تک یہ ڈرافٹ کیش نہیں کرالیا جاتا اس وقت تک یہ رقم بینک کے پاس فلوٹ کے طور پر ہے۔ ایک صورت یہ بھی ہے کہ بینک ایل۔ سی کھولتا ہے اور ایل۔ سی کھلوانے والا ادائیگی اسی وقت کر دیتا ہے، مگر بینک آگے ادائیگی اسی وقت کرتا ہے جب کاغذات آجاتے ہیں، اتنی دیر کے لئے وہ رقم بغیر کسی لاگت کے بینک کے پاس رہتی ہے، اسی طرح ریلوے بلٹی میں ہوتا ہے کہ کاغذات بینک میں آتے ہیں۔ بینک میں ادائیگی کر کے کاغذات وصول ہوتے ہیں اور کاغذات وصول کر کے بلٹی چھڑائی جاتی ہے۔ اب کاغذات لیتے ہوئے ادائیگی تو بینک میں کر دی جاتی ہے، مگر بلٹی بھیجنے والے کو یہ رقم ملنے میں تاخیر ہو جاتی ہے۔ یہ بھی بینک کا فلوٹ ہے۔ حج درخواستوں کا معاملہ بھی ایسا ہی ہے۔ اس کے علاوہ فلوٹ کی اور بھی کئی صورتیں ہو سکتی ہیں۔ فلوٹ کے ذریعے بینکوں کو کافی سرمایہ حاصل ہوتا ہے۔

اس سے ایک اور بات سامنے آگئی۔ وہ یہ کہ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ بینک ڈپازیٹر (رقم رکھوانے والوں) کو جو سود دیتا ہے، بینک کی لاگت بھی اتنی ہی ہوتی ہوگی۔ مثلاً ۸ فیصد سود دیتا ہے تو بینک کی لاگت بھی آٹھ فیصد ہی ہوگی، مگر واقعہ میں معاملہ ایسا نہیں، بینک کی حقیقی لاگت اس سے کم ہوتی ہے جو اس نے سود دیا ہے۔ اس لئے کہ بینک کے پاس بہت سی رقم ایسی بھی ہوتی ہے جس پر وہ

سود ادا نہیں کرتا اور اس سے نفع حاصل کرتا ہے۔ ایسی رقم ایک تو فلوٹ کی رقم ہے، دوسری کرنٹ اکاؤنٹ کی رقم ہوتی ہے، اس سے معلوم ہوا کہ بینک کو جو نفع حاصل ہوتا ہے، اس کا آٹھ فیصد سے بھی کم عوام کو ملتا ہے، لہٰذا بینک کے نفع کا رخ عوام کی طرف کم ہے اور سرمایہ داروں کی طرف زیادہ ہے۔

مرکزی بینک

البنك الرئيسي (Central Bank)

یہ ملک کا انتہائی اہم ادارہ ہوتا ہے، جو تمام تجارتی بینکوں (Commerical Banks) کا نگران ہوتا ہے، ملک کے مالیاتی نظام میں اس کا بہت اہم کردار ہوتا ہے، جیسا کہ اس کے وظائف سے معلوم ہوگا۔ اس ادارے کو اردو میں "مرکزی بنک" عربی میں "البنك الرئيسي" اور انگریزی میں (Central Bank) کہتے ہیں۔ مرکزی بینک مختلف ممالک میں مختلف ناموں سے موسوم ہوتا ہے مثلاً پاکستان میں "اسٹیٹ بینک آف پاکستان" مرکزی بینک ہے۔ انگلینڈ میں "بنک آف انگلینڈ" انڈیا میں "ریزرو بینک آف انڈیا" مرکزی بینک ہے۔

مرکزی بینک کے وظائف (Functions)

مرکزی بینک (Central Bank) متعدد وظائف انجام دیتا ہے۔ جن کو یہاں ذکر کیا جاتا ہے۔

۱۔ یہ حکومت کا بینک ہوتا ہے، حکومت کی رقمیں اس میں رکھی جاتی ہیں مگر حکومت کی رقموں پر یہ بینک حکومت کو سود نہیں دیتا ہے۔ اور بوقت ضرورت حکومت کو قرضہ فراہم کرتا ہے اور اس پر معمولی شرح پر سود بھی لیتا ہے۔

۲۔ مرکزی بینک حکومت کا معاشی پالیسیوں میں مشیر بھی ہوتا ہے۔

۳۔ مرکزی بینک زرمبادلہ کو محفوظ رکھتا ہے، اس کو ذخیرہ کرتا ہے اور بوقت ضرورت اس کا اجراء بھی کرتا ہے۔

۴۔ مرکزی بینک کے سب سے اہم کردار دو ہیں۔ ایک یہ کہ تمام تجارتی بینکوں کی نگرانی کرتا ہے اور ان کا نظم وضبط قائم رکھتا ہے تاکہ ان سے مالیاتی فوائد حاصل ہوں اور نقصانات کے پہلو کا سدباب ہو۔ اس مقصد کے لئے مرکزی بینک مختلف کام کرتا ہے۔ مثلاً (ا) کسی بینک کے قائم ہونے سے پہلے اس بینک کو لائسنس دینا مرکزی بینک کا کام ہے۔ مرکزی بینک کی طرف سے لائسنس کے بغیر بینک

قائم نہیں ہوسکتا۔اور لائسنس جاری کرنے سے پہلے مرکزی بینک تمام ضروری باتوں کا جائزہ لیتا ہے۔ (۲) معاشی نقطہ نظر سے جہاں رقم لگانے کی ضرورت زیادہ ہو، مرکزی بینک تجارتی بنکوں کا رخ اس طرف کر دیتا ہے۔مثلاً کسی خاص علاقے میں ترقیاتی کاموں کی ضرورت ہے۔یا کسی خاص شعبے (مثلاً زراعت یا تجارت یا صنعت وغیرہ) میں سرمایہ لگانے کی ضرورت ہو تو مرکزی بینک تجارتی بینکوں کو ان علاقوں یا شعبوں میں زیادہ قرض دینے کا پابند کر دیتا ہے۔ (۳) جن لوگوں (Depositers) نے بینک میں اپنی رقمیں لگائی ہوئی ہیں ان کی رقموں کے تحفظ کے لئے قواعد وضوابط بناتا ہے۔مثلاً رقم کا اتنا حصہ مرکزی بینک میں رکھنا ہوگا اور اتنا حصہ مرکزی بینک اپنے پاس محفوظ رکھے گا وغیرہ۔ (۴) اس بات کی نگرانی رکھتا ہے کہ بینک کی مجموعی حالت مالی طور پر مستحکم ہو اور ان میں اپنے حقوق کی ادائیگی کی صلاحیت اور استعداد رہے۔ (۵) تجارتی بینکوں کے باہمی لین دین کا تصفیہ بھی مرکزی بینک کرتا ہے، اس مقصد کے لئے مرکزی بینک میں ایک شعبہ ہوتا ہے جس کو عربی میں غرفة المقاصة اور انگریزی میں (Clearing House) کہتے ہیں۔اردو میں اس کو ''تصفیہ گھر'' کہہ سکتے ہیں۔تجارتی بینکوں کے درمیان جو لین دین ہوتا ہے، ایک دوسرے کی طرف چیک یا ڈرافٹ جاری ہوتے ہیں، روزانہ غرفة المقاصة میں ان کا حساب کر لیا جاتا ہے۔ (۶) کمرشل (تجارتی) بینکوں کو بوقت ضرورت قرضہ دیتا ہے۔جب کسی بینک سے رقم نکلوانے کے لئے اتنے زیادہ مطالبات آجائیں کہ وہ اپنے سیال اثاثوں سے ان کو پورا نہ کرسکیں تو بینکوں کے پاس آخری چارہ یہی ہوتا ہے کہ وہ مرکزی بینک سے قرض لیں، اسی لئے مرکزی بینک کو ''آخری چارہ کار کے طور پر قرض دینے والا'' (Lender of the Last Resort) کہتے ہیں۔ (۵) مرکزی بینک کی دو اہم ذمہ داریوں میں سے دوسری اہم ذمہ داری یہ ہے کہ بینک ملک میں زر کے بہاؤ کو کنٹرول کرتا ہے۔اگر ملک میں افراط زر زیادہ ہو تو ایسے طریقے اختیار کرتا ہے جس سے زر سکڑنا شروع ہو جائے اور اگر تفریط زر کی صورت حال ہو تو ایسے کام کرے جس سے زر کا پھیلاؤ بڑھے۔زر کو پھیلانے یا سکڑنے کے کئی طریقے ہو سکتے ہیں

۱۔ مرکزی بینک تجارتی بینکوں کو جس شرح پر سود پر قرضہ دیتا ہے اس کو (Bank Rate) ''بینک ریٹ اور عربی میں ''سعر البنك'' کہتے ہیں، اسی کو (Official Rate) اور عربی میں ''السعر الرسمی'' بھی کہتے ہیں۔یہ بینک ریٹ بھی زر کے بہاؤ پر اثر انداز ہوتا ہے۔وہ اس طرح کہ جب مرکزی بینک شرح سود (بینک ریٹ) زیادہ کرے تو اب تجارتی بینکوں کو زیادہ سود پر قرضہ ملے گا، لہٰذا وہ خود بھی عوام کو زیادہ سود پر قرضہ دیں گے، جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ لوگ کم قرض لیں گے۔ جب لوگ کم قرض لیں گے تو بینک کا تخلیق زر کا عمل بھی کم ہوگا اور زر کی گردش بھی کم ہو جائے گی۔اس

کے برعکس مرکزی بینک شرح سود کو گھٹائے گا تو تجارتی بینک بھی گھٹا دیں گے جس کے نتیجہ میں لوگ قرض زیادہ لیں گے اور تخلیق زر کا عمل زیادہ ہو کر زر کی رسد بڑھے گی۔

ٹریژری بل

۲۔ دوسرے طریقہ کو (Open Market Operation) اور عربی میں ''عملیات السوق المفتوحة'' کہتے ہیں۔ اس نظام کو سمجھنے کے لئے پہلے ٹریژری بل کا سمجھنا ضروری ہے۔ حکومت کو جب رقم کی ضرورت ہوتی ہے تو رقم حاصل کرنے کے لئے حکومت مختلف قرضے کی دستاویزات جاری کرتی ہے جن کو ''سرکاری تمسکات'' کہتے ہیں ان کا ذکر پہلے ہو چکا ہے، تجارتی بینکوں سے رقم وصول کرنے کے لئے ''مرکزی بینک'' ایک بل جاری کرتا ہے، جس کو انگریزی میں (Treasury Bill) (ٹریژری بل) اور عربی میں "سندات الخزینة" کہتے ہیں۔ ایک بل کی ''قیمته اسمیة'' (لکھی ہوئی قیمت) (Face Value) سو روپے ہوتی ہے۔

یہ بل مقررہ مدت کے لئے جاری ہوتے ہیں، عموماً چھ ماہ کے لئے جاری ہوتے ہیں۔ یہ بل بذریعہ نیلام بیچے جاتے ہیں اور ان کے ابتدائی خریدار تجارتی بینک ہی ہوتے ہیں۔ دوسرے لوگ بھی بینکوں سے خرید لیتے ہیں۔ نیلام کا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ مرکزی بینک اعلان کر دیتا ہے کہ اتنی رقم (مثلاً دس ارب روپے) کے ٹریژری بل جاری کیے جا رہے ہیں اور بینک اپنی اپنی طلب بتاتے ہیں۔ ہر بینک بتاتا ہے کہ میں اتنی قیمت پر اتنے بل خریدنا چاہتا ہوں، آجکل اس کا ریٹ عموماً ۱۳ یا ۱۴ فیصد ہے یعنی سو روپے کا بل تقریباً ۸۶ یا ۸۷ روپے میں فروخت ہوتا ہے جس جس بینک کی بولی قبول ہوتی جاتی ہے اس کو اس کی طلب کے مطابق بل دے کر رقم اس سے وصول کر لی جاتی ہے۔ اب جس بینک نے یہ بل مثلاً ۸۶ روپے میں خریدا وہ چھ ماہ کے بعد اس کے پورے سو روپے وصول کر لے گا اور چودہ روپے اس کے نفع یا سود کے ہوں گے۔ اس بل کی مدت آنے سے پہلے اسٹیٹ بینک ہی میں یا بازارِ حصص (Stock Exchange) میں اس بل کی ہنڈی کی طرح ڈسکاؤنٹنگ بھی ہو سکتی ہے۔

''اوپن مارکیٹ آپریشن'' کا مطلب یہ ہے کہ زر کے بہاؤ کو کنٹرول کرنے کے لئے مرکزی بینک تجارتی بینکوں پر کسی قسم کی پابندیاں لگانے کی بجائے خود ٹریژری بل کی خرید یا فروخت کے لئے کھلے بازار میں آ کر زر کی رسد اور اس کے بہاؤ پر اثر انداز ہوتا ہے۔ وہ اس طرح کہ جب زر کا بہاؤ کم کرنا ہو تو مرکزی بینک ٹریژری بل کم قیمت پر فروخت کرنے کی آمادگی ظاہر کرتا ہے، جس کے نتیجے میں تجارتی بینک اپنا سرمایہ دے کر بل خریدنے لگتے ہیں اور بینکوں کا زر مرکزی بینک میں واپس ہونا شروع

ہو جاتا ہے، بینکوں کے پاس سرمایہ کم ہو جاتا ہے اور قرضوں کی فراہمی کم ہو کر تخلیق زر کا عمل بھی کم ہو جاتا ہے، اس کے برعکس اگر زر کا پھیلاؤ بڑھانا ہو تو مرکزی بینک ٹریژری بل زیادہ قیمت پر خریدنے کے لئے کھلے بازار میں آجاتا ہے، لوگ بل بیچ کر مرکزی بینک سے رقم لیتے ہیں تو زر پھیل جاتا ہے۔

۳۔ مرکزی بینک ریزرو کی شرح کم یا زیادہ کر کے بھی زر کی رسد پر اثر انداز ہوتا ہے۔ وہ اس طرح کہ ریزرو کم ہوگا تو بینکوں کو زیادہ قرض فراہم کرنے کا موقع ملتا ہے اور تخلیق زر کا عمل بڑھتا ہے۔ ریزرو زیادہ ہو تو بینک کم قرض فراہم کرتے ہیں جس کے نتیجے میں تخلیق زر کا عمل بھی کم ہو جاتا ہے۔ اس لئے مرکزی بینک زر کو پھیلانے کے لئے ریزرو کم کر دیتا ہے اور زر کے پھیلاؤ کو کم کرنے کے لئے ریزرو بڑھا دیتا ہے۔

۴۔ سود کی شرح کم یا زیادہ کر کے بھی زر کے بہاؤ کو کنٹرول کیا جاتا ہے۔ مرکزی بینک تجارتی بینکوں کو شرح بڑھانے کا پابند کر دے گا تو لوگ قرضہ کم لیں گے اور زر کا بہاؤ کم ہوگا، اور اگر شرح سود گھٹانے کا پابند کرے گا تو لوگ قرضہ زیادہ لیں گے اور زر کا بہاؤ بڑھے گا۔

۵۔ قرضہ جاری کرنے کی حد بندی کر کے یا مختلف شعبوں کے کوٹے مقرر کر کے بھی زر کے بہاؤ کو کم کیا جاتا ہے۔ مثلاً یہ پابندی لگا دے کہ بینک اپنی امانتوں کے صرف چالیس فیصد کی حد تک قرضہ دے سکیں گے یا بینک اپنی امانتوں کا ۲۵ فیصد فلاں شعبے میں قرضہ دیں گے۔ ان پابندیوں سے بینک کم قرضہ جاری کر سکیں گے اور تخلیق زر میں کمی ہوگی۔

۶۔ مرکزی بینک کے وظائف میں یہ بھی داخل ہے کہ وہ بینکوں کے لئے قرضہ دینے کا ایسا نظام قائم کرتا ہے، جس سے لوگوں کا بھی نقصان نہ ہو اور ملکی معاشی نظام میں یا بینک کی اپنی حالت میں عدم استحکام پیدا نہ ہو۔

۷۔ اب مرکزی بینک کو بینکوں کے علاوہ دوسرے مالیاتی ادارے (جن کی وضاحت آگے آرہی ہے) کی نگرانی کا اختیار بھی دیدیا گیا ہے۔

دیگر مالیاتی ادارے

المئوسسات المالية (غير المصرفية)

(Non- Banking Financial Institutions)

(N.B.F.I)

کچھ ادارے اتنی بات میں تو بینک کی طرح ہوتے ہیں کہ لوگوں سے رقمیں جمع کر کے ان کے

ذریعے تمویل کرتے ہیں، مگر بینک کے دوسرے وظائف انجام نہیں دیتے۔ مثلاً ان کے بینک کی طرح کرنٹ اکاؤنٹ یا سیونگ اکاؤنٹ نہیں ہوتے، صرف فکسڈ ڈپازٹ ہوتے ہیں، یہ ادارے بینکوں کی طرح بین الاقوامی تجارت میں بھی واسطہ نہیں بنتے۔ ایسے اداروں کو عربی میں ''المئوسسات المالية (غير المصرفية)'' اور انگریزی میں (Non- Banking Financial Institution) (نان بنکنگ فنانشل انسٹی ٹیوشن) کہتے ہیں۔ ایسے مالیاتی اداروں کی کئی قسمیں ہیں، جن کی وضاحت یہاں کی جاتی ہے۔

ا۔ترقیاتی تمویلی ادارے

(Development Financial Institution)

جس کو (D.F.I) کہتے ہیں۔

یہ وہ ادارے ہیں جو ملک میں مختلف ترقیاتی منصوبوں کو بروئے کار لانے کے لئے سرمایہ فراہم کرتے ہیں۔ ابتداءً یہ ادارے بین الاقوامی مالیاتی اداروں کی طرف سے قائم ہوئے تھے۔ وہ امداد ان اداروں میں بھیجتے تھے اور یہ ادارے ترقیاتی منصوبوں میں تمویل کرتے تھے۔ اسٹیٹ بینک بھی بعض مقاصد کے لئے ان کو سرمایہ دیتا ہے، اس قسم کے کئی ادارے ہمارے ملک میں ہیں۔ مثلاً (N.D.F.C) (نیشنل ڈیولپمنٹ فنانس کارپوریشن)، (I.D.B.P) (انڈسٹریل ڈیولپمنٹ بینک آف پاکستان)، (P.I.C.I.C) (پاکستان انڈسٹریل اینڈ کریڈٹ انوسٹمنٹ کاپوریشن)، بینکرز ایکویٹی، پاک سعودیہ، پاک کویت، پاک لیبیا وغیرہ۔

۲۔ (A.D.B.P) ایگریکلچر ڈیولپمنٹ بینک آف پاکستان۔ یہ شعبۂ زراعت میں ترقی کے لئے سرمایہ فراہم کرتے ہیں۔ عالمی ادارے اور اسٹیٹ بینک ان کو سرمایہ دیتا ہے اور یہ آگے تمویل کرتے ہیں۔

۳۔ (Co-operative Society) (کوآپریٹو سوسائٹی) جن کو عربی میں ''جمعية تعاونية'' کہتے ہیں۔ یہ ادارے امداد باہمی کے لئے قائم ہوتے ہیں۔ جو لوگ ان کے ممبر بنتے ہیں صرف انہی کو قرض دیتے ہیں۔

۴۔ لیزنگ کمپنی۔ یہ کمپنیاں اجارے کے طریقے پر سرمایہ فراہم کرتی ہیں جس کی تفصیل انشاء اللہ اگلے باب میں آئے گی۔ پہلے لیزنگ کمپنیوں کو عوام سے سرمایہ لینے کی اجازت نہیں تھی، صرف (N.D.L.C) (نیشنل ڈیولپمنٹ لیزنگ کمپنی) کو اجازت تھی۔ اب تمام لیزنگ کمپنیوں کو عوام سے

سرمایہ لینے کی اجازت دے دی گئی ہے، اس شرط کے ساتھ کہ ایک مہینے سے زیادہ کے انوسٹمنٹ سرٹیفکیٹ جاری کیے جائیں۔

۵۔ (N.I.T) (این، آئی، ٹی) نیشنل انوسٹمنٹ ٹرسٹ

متعدد ممالک میں ''یونٹ ٹرسٹ'' کا تصور موجود ہے۔ وہ یہ کہ ایک فنڈ قائم کیا جاتا ہے جس میں لوگوں سے سرمایہ حاصل کیا جاتا ہے اور پھر اس فنڈ کی رقم سے خود براہ راست کاروبار کرنے کے بجائے رقم مختلف نفع بخش کاموں میں لگائی جاتی ہے۔ ان سے مجموعی طور پر جو نفع ہو وہ لوگوں میں تقسیم کر دیا جاتا ہے۔ این، آئی، ٹی بھی ایک ادارہ ہے جو اسی قسم کے فنڈ کے انتظامی فرائض انجام دیتا ہے، فنڈ کے یونٹ بنا لیے جاتے ہیں، یونٹ بیچ کر لوگوں سے رقم جمع کر کے اس سے سرمایہ کاری کی جاتی ہے۔ عموماً اس کی سرمایہ کاری شیئرز میں ہوتی ہے۔ مختلف کمپنیوں کے شیئرز لے کر نفع حاصل کیا جاتا ہے۔ کسی بھی کمپنی کے شیئرز جاری ہوں تو این، آئی، ٹی کو ترجیحی حق دیا گیا ہے کہ وہ بیس فیصد تک چاہے تو شیئرز لے سکتا ہے۔

۶۔ (I.C.P) (انوسٹمنٹ کارپوریشن آف پاکستان) یہ ادارہ کئی کام کرتا ہے۔ ایک یہ کہ این، آئی، ٹی کی طرح ایک فنڈ جاری کرتا ہے۔ جس کو ''آئی، سی، پی میوچل فنڈ'' کہتے ہیں۔ لوگ اس فنڈ میں رقم لگاتے ہیں۔ این، آئی، ٹی اور این، سی، پی کے فنڈ میں فرق یہ ہوتا ہے کہ این، آئی، ٹی کا یونٹ خرید کر جب چاہیں این، آئی، ٹی کو ہی دوبارہ بیچا جا سکتا ہے مگر آئی، سی، پی کے شیئرز لے کر آئی، سی، پی کو دوبارہ نہیں بیچے جا سکتے ہیں، البتہ کمپنی کے شیئرز کی طرح کسی اور کو فروخت کیا جا سکتا ہے۔

آئی، سی، پی کا دوسرا کام یہ ہے کہ جو لوگ بیرون ملک رہتے ہیں وہ آئی، سی، پی میں اپنی رقم کا اکاؤنٹ کھولتے ہیں۔ ایک وہ اکاؤنٹ جس میں آئی، سی، پی کو اختیار ہوتا ہے کہ جو شیئرز چاہے خرید کر سرمایہ کاری کرے۔ دوسرا وہ اکاؤنٹ جس میں آئی، سی، پی کو یہ اختیار نہیں ہوتا، بلکہ جس کا اکاؤنٹ ہے وہ خود بتاتا ہے کہ فلاں کمپنی کے شیئرز لئے جائیں۔

آئی، سی، پی کا تیسرا کام یہ ہے کہ کسی کو زیادہ قرضے کی ضرورت ہو تو یہ ادارہ کئی بینکوں کو ملا کر مجموعی طور پر قرض کا انتظام کرتا ہے۔

سودی بینکاری کا متبادل نظام

گزشتہ اوراق میں بینکنگ کے مروجہ نظام کی وضاحت کی گئی ہے، اس سے یہ بات واضح ہو گئی ہے کہ موجودہ نظام کی بنیاد سود ہے۔ اب یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر سود ختم کیا جائے تو بینکنگ کے نظام کو چلانے کا متبادل طریقہ کیا ہو؟ اس سلسلے میں اب تک جو تجاویز سامنے آئی ہیں، ان کا ذکر کیا جاتا ہے۔

سودی بینکاری کے متبادل نظام پر گفتگو سے پہلے چند بنیادی باتیں ذہن نشین کرنا ضروری ہیں۔

۱۔ سودی بینکاری کا متبادل تلاش کرنے کا مطلب یہ نہیں ہونا چاہئے کہ مروجہ بینک جتنے کام جس انداز سے کر رہے ہیں، وہ سارے کام کم وبیش اسی انداز سے انجام دیے جاتے رہیں اور ان کے مقاصد میں کوئی فرق واقع نہ ہو، کیونکہ اگر سب کچھ وہی کرنا ہے جو اب تک ہوتا رہا ہے تو ''متبادل طریق کار'' کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

بلکہ ''متبادل'' کا مطلب یہ ہے کہ بینک کے جو کام موجودہ تجارتی حالات میں ضروری یا مفید ہیں، ان کی انجام دہی کیلئے ایسا طریق کار اختیار کیا جائے جو شریعت کے اصولوں کے دائرے میں ہو، اور جس سے شریعت کے معاشی مقاصد پورے ہوں۔ اور جو کام شرعی اصولوں کے مطابق ضروری یا مفید نہیں ہیں، اور جنہیں شرعی اصولوں کے مطابق ڈھالا نہیں جاسکتا، ان سے صرف نظر کی جائے۔

۲۔ چونکہ سود کی ممانعت کا اثر تقسیم دولت کے پورے نظام پر پڑتا ہے، اس لئے یہ توقع کرنا بھی غلط ہوگا کہ سود کے شرعی متبادل کو بروئے کار لانے سے تمام متعلقہ فریقوں کے نفع کا تناسب وہی رہے گا جو اس وقت سودی نظام میں پایا جاتا ہے۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ اگر اسلامی احکام کو ٹھیک ٹھیک روبکار لایا جائے تو اس تناسب میں بڑی بنیادی تبدیلیاں آسکتی ہیں، بلکہ یہ تبدیلیاں ایک مثالی اسلامی معیشت کیلئے ناگزیر طور پر مطلوب ہیں۔

۳۔ آج کل بینک جو خدمات انجام دیتا ہے، ان میں یہ پہلو مفید بلکہ موجودہ معاشی حالات کے پیش نظر ضروری ہے کہ وہ لوگوں کی منتشر انفرادی بچتوں کو یکجا کر کے انہیں صنعت وتجارت میں استعمال کرنے کا ذریعہ بنتا ہے۔ یہ بچتیں اگر ہر شخص کی اپنی تجوری میں پڑی رہتیں تو ان سے صنعت وتجارت کے فروغ میں کوئی فائدہ حاصل نہیں کیا جاسکتا تھا۔ اور ظاہر ہے کہ فاضل دولت کا ست پڑا رہنا نہ شرعی اعتبار سے مطلوب ہے نہ عقلی اور معاشی اعتبار سے اسے مفید کہا جاسکتا ہے۔

لیکن ان بچتوں کو صنعت وتجارت میں مصروف کرنے کے لئے جو راستہ مروجہ بینکوں نے اختیار کیا ہے، وہ قرض کا راستہ ہے چنانچہ یہ ادارے سرمایہ داروں کو اس بات کی ترغیب دیتے ہیں کہ وہ دوسروں کے مالی وسائل کو اپنے منافع کے لئے اس طرح استعمال کریں کہ ان وسائل سے پیدا ہونے والی دولت کا زیادہ حصہ خود ان کے پاس رہے، اور سرمایہ کے اصل مالکوں کو ابھرنے کا کما حقہ موقع نہ مل سکے۔

چنانچہ مروجہ نظام بینکاری کی حیثیت محض ایک ادارے کی ہے جو روپے کا لین دین کرتا ہے، اسے اس بات سے سروکار نہیں ہے کہ اس روپے سے جو کاروبار ہو رہا ہے، اس کا منافع کتنا ہے؟ اور اس سے کس کو فائدہ اور کس کو نقصان پہنچ رہا ہے؟

اسلامی احکام کی رو سے بینک ایسے ادارے کی حیثیت میں باقی نہیں رہ سکتا جس کا کام صرف روپے کا لین دین ہو۔ اس کے بجائے اسے ایک ایسا تجارتی ادارہ بنانا پڑے گا جو بہت سے لوگوں کی بچتوں کو اکٹھا کر کے ان کو براہ راست کاروبار میں لگائے، اور وہ سارے لوگ جن کی بچتیں اس نے جمع کی ہیں، براہ راست اس کاروبار میں حصہ دار بنیں، اور ان کا نفع ونقصان اس کاروبار کے نفع ونقصان سے وابستہ ہو جو ان کے سرمایہ سے بالآخر انجام دیا جا رہا ہے۔ لہٰذا سودی بینکاری کے متبادل جو نظام تجویز کیا جائے گا، اس پر یہ اعتراض نہ ہونا چاہئے کہ بینک نے سابقہ حیثیت ختم کر دی ہے، اور وہ بذات خود ایک تجارتی ادارہ بن گیا ہے، کیونکہ اس کے بغیر وہ ضرورت پوری نہیں ہو سکتی جس کی وجہ سے متبادل نظام کی تلاش کی جا رہی ہے۔

۴۔ چوتھی بات یہ کہ صدیوں سے جمے اور بیٹھے ہوئے کسی نظام کو بدل کر اس کی جگہ ایک نیا نظام جاری کرنے میں ہمیشہ مشکلات ہوتی ہیں۔ لیکن اگر نظام کی تبدیلی ضروری ہو تو صرف ان مشکلات کی بناء پر نئے نظام کو ناقابل عمل قرار دینا کسی طرح درست نہیں۔ ایسے میں ان مشکلات کا حل تلاش کیا جاتا ہے، ان مشکلات کے خوف سے پیش قدمی نہیں روکی جاتی۔

بینکنگ کا شرعی طریق کار

اس تمہید کے بعد اب وہ تجاویز پیش کی جاتی ہیں جو بینکنگ کو شرعی اصول کے مطابق چلانے کے لئے پیش کی گئی ہیں۔ پہلے یہ سمجھنا چاہئے کہ بینکنگ کا تعلق دو طرفہ ہوتا ہے۔ ایک طرف اس کا تعلق ان لوگوں سے ہوتا ہے جنہوں نے اپنی رقمیں بینک میں رکھوائی ہیں۔ دوسری طرف ان کے ساتھ تعلق ہوتا ہے جن کو بینک تمویل کرتا ہے یعنی سرمایہ فراہم کرتا ہے۔ دونوں قسم کے تعلقات پر الگ الگ گفتگو

کی جاتی ہے۔

بینک اور ڈپازیٹر کا تعلق

موجودہ نظام میں بینک میں جو رقمیں رکھوائی جاتی ہیں آجکل بینکنگ کی اصطلاح میں ان کو ''امانت'' کہا جاتا ہے لیکن فقہی اعتبار سے حقیقت میں وہ قرض ہوتا ہے۔ اگر بینک کو اسلامی طریقے سے چلایا جائے تو ''امانت داروں'' کے ساتھ بینک شرکت یا مضاربت کا معاملہ کرے گا۔ اس طریقے میں وہ رقم قرض نہیں ہوگی، بلکہ اب صورتحال یہ ہوگی کہ رقم رکھوانے والے ''رب المال'' ہونگے اور بینک مضارب ہوگا اور لگایا ہوا سرمایہ ''راس المال'' ہوگا جس پر بینک کسی خاص شرح سے نفع دینے کا پابند نہیں ہوگا، بلکہ جو کچھ نفع حاصل ہوگا وہ ایک طے شدہ تناسب کے مطابق تقسیم ہوگا۔

پھر ''کرنٹ اکاؤنٹ'' یا ''الحساب الجاری'' میں بینک آج بھی ڈپازیٹر کو کوئی سود نہیں دیتے۔ اسلامی طریق کار میں بھی اس مد پر کوئی منافع نہیں دیا جائے گا۔ اور کرنٹ اکاؤنٹ میں رکھی ہوئی رقم ڈپازیٹر کی طرف سے بینک کو دیا ہوا غیر سودی قرض سمجھا جائے گا۔ البتہ دوسرے نفع بخش کھاتے ''مضاربت'' یا ''شرکت'' کے کھاتوں میں تبدیل ہو جائیں گے۔

البتہ ان کھاتوں کو مضاربت یا شرکت سے بدلنے میں یہ عملی دشواری معلوم ہوتی ہے کہ شرکت کا عام قاعدہ یہ ہے کہ تمام کھاتہ داروں کی رقم ایک ساتھ مشترک کھاتے میں آئے، اور ایک ہی وقت پر نفع ونقصان کا حساب کر کے تمام شرکاء میں نفع ونقصان تقسیم کیا جائے۔ لیکن بینک میں یہ بات قابل عمل نہیں ہوسکتی، کیونکہ یہاں لوگوں کے رقم رکھوانے اور نکالنے کا سلسلہ مستقل طور پر جاری رہتا ہے۔ فکسڈ ڈپازٹ میں اگرچہ نکلوانے کی مدت تو مقرر ہوتی ہے، لیکن رکھوانے کا وقت مقرر نہیں، ہر شخص ہر روز فکسڈ ڈپازٹ کا کھاتہ کھول سکتا ہے اور سیونگ اکاؤنٹ میں نہ نکلوانے کی تاریخ مقرر ہے نہ رکھوانے کی۔

اس کی ایک صورت تو یہ ہے کہ یہ نظام تبدیل کیا جائے اور لوگوں کو پابند کیا جائے کہ وہ ایک خاص تاریخ میں رقم جمع کرائیں، اور ایک خاص تاریخ ہی میں نکالیں۔ اور شرکت کی مدت سہ ماہی یا ماہانہ مقرر کر لی جائے اور ہر مدت کے اختتام پر نفع ونقصان کا حساب کر کے اس کی تقسیم عمل میں آئے۔ لیکن اس صورت میں اول تو لوگوں کے لئے بینک میں رقم رکھوانے میں مشکلات پیش آئیں گی، ایک تاریخ میں رکھوانے اور ایک ہی تاریخ میں نکلوانے سے بینکوں پر پریشر بھی بڑھے گا، اور اس کے نتیجے میں بہت سی بچتیں کام لگنے سے رہ جائیں گی۔

لہٰذا بینکوں کی شرکت ومضاربت میں نفع کی تقسیم کا ایک طریق کار بعض حلقوں کی طرف سے تجویز کیا گیا ہے جس کو اکاؤنٹنگ کی اصطلاح میں "الحساب الیومی" یا روزانہ پیداوار پر مبنی حساب (Daily Product Basis) کہا جاتا ہے۔اس تجویز کا حاصل یہ ہے کہ شرکاء کو یہ آزادی دی جائے کہ وہ جب چاہیں مخصوص قواعد کے مطابق بینک سے رقمیں نکالتے یا اس میں داخل کرتے رہیں، لیکن جب ایک مدتِ شرکت ختم ہو تو یہ دیکھا جائے کہ اس مدت میں کتنی رقم کتنے دن بینک میں رہی، اور فی روپیہ فی یوم منافع کا اوسط کیا رہا، پھر جس شخص کے جتنے روپے اس مدت کے دوران جتنے دن بینک میں رہے، اس کے حساب سے نفع تقسیم کر دیا جائے۔

شرعی نقطہ نظر سے اس پر یہ اشکال ہوسکتا ہے کہ اس طریقے سے نفع کی تقسیم تقریبی ہوتی ہے۔ اس بات کا اندیشہ ہے کہ کسی کے حقیقی نفع کا کچھ حصہ دوسرے کے پاس چلا جائے۔مثلاً چھ ماہ کے بعد نفع تقسیم ہوا۔ان چھ ماہ میں سے پہلے تین ماہ میں نفع زیادہ ہوا اور آخری تین ماہ میں نفع کم ہوا۔ان چھ ماہ کے دوران زید کی رقم تو چھ ماہ بینک میں رہی اور عمرو کی رقم آخری تین ماہ رہی اور نفع فی یوم برابر ملے گا تو اس صورت میں زید کے حقیقی نفع کا کچھ حصہ عمرو کے پاس جائے گا۔اس میں شک نہیں کہ نفع کی تقسیم کی مذکورہ صورت میں یہ اشکال موجود ہے، لیکن اس کا جواب یہ ہوسکتا ہے کہ شرکت میں شرکاء کے اموال مشاع طور پر مخلوط ہو جاتے ہیں۔لہٰذا نفع تقسیم کرتے ہوئے یہ نہیں دیکھا جاتا کہ ہر ایک کے سرمائے سے حقیقی نفع کیا ہوا، بلکہ تمام مجموعی سرمائے سے جو مجموعی نفع ہوا ہو وہ تقسیم ہوتا ہے۔حالانکہ یہ احتمال موجود ہے کہ ایک سرمائے سے نفع حاصل ہوا ہو اور دوسرے کے سرمائے سے بالکل نفع نہ ہوا ہو۔ معلوم ہوا کہ نفع کی حقیقی تقسیم شرکت میں مطلوب نہیں تقریبی تقسیم بھی کافی ہے بشرطیکہ تمام شرکاء اس پر راضی ہوں لہٰذا مروجہ طریقے سے نفع کی تقسیم کی شرعاً گنجائش معلوم ہوتی ہے، خصوصاً جب کہ رقم رکھواتے ہوئے ہر شخص کو معلوم بھی ہوتا ہے کہ نفع اس تقریبی طریقے سے تقسیم ہوگا، تو باہمی رضامندی سے تقسیمِ نفع کے ایک حسابی طریقہ کو اختیار کرنے میں کوئی مضائقہ نہ ہونا چاہئے۔

یہ ساری تفصیل اس وقت ہے جب کہ کوئی شخص مدت کے درمیان میں بینک میں داخل ہوتا یا درمیان میں رقم نکلواتا اور رکھتا رہتا ہے۔اگر کوئی شخص درمیان مدت میں بینک سے بالکل ہی نکل رہا ہو تو اس صورت میں یہ مسائل نہیں ہونگے۔اس صورت میں بہتر توجیہ یہ ہوگی کہ اب بینک اس کو نفع تقسیم نہیں کر رہا، بلکہ یہ شخص کاروبار میں اپنے حصے کو بیچ رہا ہے اور بینک اس کو خرید رہا ہے۔اور حصہ خریدنے کے لئے بینک نے نفع ونقصان کی صورتِ حال کو دیکھ کر اس کے حصے کی قیمت طے کی ہے۔

اسلام کے طریقہ ہائے تمویل

اب تک اسلامی نظام میں بینک اور رقم رکھوانے والے کے تعلق پر گفتگو ہوئی ہے۔اب بینک کے اہم کام تمویل یعنی سرمایہ فراہم کرنے کے اسلامی طریقے پر گفتگو کی جاتی ہے۔شرعی نقطہ نظر سے اس کے کئی طریقے ہو سکتے ہیں۔

شرکت ومضاربت

سود کا صحیح اسلامی متبادل شرکت اور مضاربت کا طریقہ ہے، جو سود سے بدر جہا اچھے نتائج کا حامل ہے۔ یہ تمویل کا نہایت مثالی، عادلانہ، منصفانہ طریقہ ہے جس کے تقسیم دولت پر بہت اچھے نتائج مرتب ہوتے ہیں۔ اس سے بینکنگ کا یہ تصور بھی ختم ہوسکتا ہے کہ بینک کاروبار کے عمل سے بالکل الگ تھلگ رہتے ہوئے صرف سرمایہ فراہم کرنے کے لئے واسطہ بنتا ہے۔شرکت اور مضاربت کا نظام جاری ہونے کی صورت میں بینک کا نام خواہ بینک ہی رہے لیکن بینک کی حیثیت ختم ہو جائے گی، اب بینک کا باقاعدہ کاروبار میں عمل دخل ہوگا۔

شرکت اور مضاربت میں بنیادی فرق یہ ہوتا ہے کہ شرکت میں شرکاء سرمائے میں بھی حصہ دار ہوتے ہیں اور عمل میں بھی حصہ دار ہو سکتے ہیں۔اگر کوئی عملاً کاروبار میں دخل نہ دے یہ الگ بات ہے۔اور مضاربت میں رب المال کا سرمایہ ہوتا ہے اور مضارب عمل کرتا ہے رب المال کی عمل میں شرکت نہیں ہوتی۔

اب یہاں شرکت اور مضاربت کے چند بنیادی اصول بیان کیے جاتے ہیں، شرکت اور مضاربت کا معاملہ کرتے ہوئے ان کی رعایت ضروری ہوگی۔

۱۔ سرمائے کے تناسب سے نفع مقرر کرنا شرعاً جائز نہیں۔نفع مقرر کرنے کا صحیح شرعی طریقہ یہ ہے کہ جو نفع حقیقت میں ہوگا اس کا فیصد حصہ مقرر کیا جائے۔

۲۔ نفع کا جو تناسب بھی چاہیں باہمی رضامندی سے طے کر سکتے ہیں مثلاً کسی کا سرمایہ چالیس فیصد ہو اور اس کے لئے ساٹھ فیصد نفع کی شرط لگائی جائے اور دوسرے کا سرمایہ ساٹھ فیصد ہو اور اس کے لئے چالیس فیصد نفع کی شرط لگائی جائے یہ جائز ہے۔نفع کی تقسیم بقدر سرمایہ ضروری نہیں۔اس سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ مختلف شرکاء کے لئے نفع کی مختلف شرحیں طے کی جاسکتی ہیں جس کو آج کل کی اصطلاح میں ''وزن'' (Weightage) دینا کہتے ہیں۔مختلف شرکاء کو مختلف وزن دیا جاسکتا ہے۔

البتہ جس شریک نے کام نہ کرنے کی شرط لگالی ہو اس کا نفع اس کے سرمائے کے تناسب سے زائد نہیں ہوسکتا۔

۳۔ نفع میں تو مختلف شرکاء کو مختلف وزن دیا جا سکتا ہے، لیکن نقصان میں اس طرح کرنا جائز نہیں ۔ نقصان بہر حال سرمایہ کے بقدر ہوگا ۔ جس کو فقہا یوں تعبیر فرماتے ہیں ۔

"الربح علی ما اصطلحوا علیه والوضیعة بقدر رأس المال"

شرکت ومضاربہ میں دشواریاں

شرکت اور مضاربہ کے جاری کرنے میں عموماً دو قسم کی دشواریاں بتائی جاتی ہیں ۔

ا۔ ایک یہ کہ آج کل دیانت وامانت کا معیار بہت پست ہو گیا ہے، کسی کو شرکت پر سرمایہ دیا جائے تو وہ کبھی بھی حقیقی نفع نہیں بتاتا، بلکہ نفع کی بجائے نقصان دکھاتا ہے۔ اس لئے شرکت و مضاربت پر عمل مشکل ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ واقعی معاشرے میں بددیانتی کی حالت افسوس ناک ہے، لیکن بددیانتی کی وجہ سے کوئی کام بند نہیں ہوتا۔ مختلف طریقوں سے بددیانتی کا سدباب کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ مثلاً آڈٹ کا نظام، اکاؤنٹس کا نظام، سینٹرل بینک کی نگرانی وغیرہ۔ مشارکہ اور مضاربہ میں بھی اس جیسی کارروائیاں کی جاسکتی ہیں، نیز جس شخص یا ادارے کے بارے میں ایک دفعہ بددیانتی ثابت ہو جائے اس کو تمام بینکوں میں "بلیک لسٹ" کیا جا سکتا ہے۔ جس کا مطلب یہ ہوگا کہ ایسا شخص آئندہ کسی بینک سے سرمایہ حاصل کرنے سے محروم ہو جائے گا۔ اگر اس کو قانون بنا کر موثر طور پر نافذ کیا جائے تو لوگ بددیانتی کرتے ہوئے ڈریں گے، اور بڑی حد تک اس مفسدے کا سدباب ہو جائیگا۔ اور بھی متعدد قانونی کارروائیاں ہوسکتی ہیں۔ ایک بینک تنہا اگر یہ کام کرے تو واقعی اس کے لئے مشکلات ہیں لیکن حکومت کی سطح پر یہ کام کیا جائے اور تمام بینکوں کا نظام اس کے مطابق ہو تو بددیانتی کے سدباب کے طریقے ہوسکتے ہیں۔

۲۔ دوسری دشواری انکم ٹیکس کے نظام کی وجہ سے ہے۔ عموماً تاجر دو قسم کے کھاتے بناتے ہیں۔ انکم ٹیکس کے لئے الگ کھاتے ہوتے ہیں اور واقعی کھاتے دوسرے ہوتے ہیں، اس صورت حال میں مشارکہ یا مضاربہ پر سرمایہ لینے والا حقیقی نفع دکھائے تو انکم ٹیکس والے پکڑ لیتے ہیں اور اگر وہ بینک کو حقیقی نفع نہ دکھائے تو نفع کی حقیقی تقسیم نہیں ہوتی، اس کا جواب یہ ہے کہ جب حکومتی سطح پر اس مسئلے پر غور کیا جائے تو مشارکہ اور مضاربہ کو کامیاب بنانے کے لئے ٹیکس کے نظام کی اصلاح بھی ضروری ہوگی۔ ٹیکس کو آمدنی سے وابستہ کرنے کے بجائے ریاستی ضروریات کے لئے ٹیکس کا کوئی ایسا نظام جاری کیا جاسکتا

ہے جس میں بددیانتی کا یہ دروازہ بند ہو جائے۔

پھر تمویل کی بہت سی مدات ایسی ہیں جہاں شرکت ومضاربت میں بہت لمبے چوڑے حساب وکتاب کی ضرورت نہیں ہوگی۔ مثلاً برآمدات کی تمویل میں پہلے سے برآمد کیے جانے والے سامان کی لاگت اور حاصل ہونے والی متوقع قیمت کا علم ہوتا ہے، لہٰذا اس میں شرکت ومضاربت کرنے میں دھوکہ اور فریب کا امکان بہت کم ہے۔

اسی طرح یہ ضروری نہیں کہ بینک تاجر کے پورے کاروبار میں شریک ہو، وہ کاروبار کے کسی متعین حصے میں بھی شرکت کر سکتا ہے جس میں نفع کا تعین زیادہ مشکل نہیں ہوگا۔ اس کے علاوہ چونکہ بینک کے لئے تاجروں کا ابدی اور دائمی شریک رہنا ضروری نہیں بلکہ تاجروں اور صنعتکاروں نے اپنی عمارت، مشینری وغیرہ پہلے ہی سے لگائی ہوئی ہے، اور بینک چھ ماہ یا سال بھر کیلئے ان سے شرکت کا معاملہ کر سکتا ہے، اس لئے یہ بات بھی باہمی رضامندی سے طے ہو سکتی ہے کہ اس مخصوص اور محدود شرکت میں کاروبار کے صرف براہ راست اخراجات (Direct Expenses) تسلیم کیے جائیں گے، اور اجمالی منافع (Gross Profit) فریقین کے درمیان تقسیم ہوگا۔ اور چونکہ جامد اثاثے تاجر نے فراہم کیے ہیں، اس لئے اس کے نفع کا تناسب بڑھایا جا سکتا ہے، لیکن ان جامد اثاثوں کے اخراجات اور بالواسطہ اخراجات شرکت پر نہ ڈالے جائیں۔ اس طرح حساب وکتاب میں بھی آسانی ہو جائے گی اور بدیانتی کا خطرہ بھی کم ہو جائیگا اور ٹیکس چونکہ صافی منافع پر لگتا ہے، اس لئے ٹیکس کے مسئلے کا بھی حل نکل آئے گا۔ شرکت ومضاربت کو کس کس قسم کی تمویل میں استعمال کیا جا سکتا ہے، اس کی مزید تفصیل ان شاء اللہ آگے آئے گی۔

اصل اسلامی طریقہ تو مشارکہ اور مضاربہ ہی ہے مگر بعض حالات میں مشارکہ اور مضاربہ ممکن نہیں ہوتا مثلاً کسی کسان کو ٹریکٹر خریدنے کے لئے سرمائے کی ضرورت ہو تو اس میں شرکت ومضاربہ ممکن نہیں۔ ایسی صورت میں چند اور بھی تمویل کے طریقے ہیں، جو اب بیان کیے جاتے ہیں۔

اجارہ

یہ بھی تمویل کا ایک شرعی طریقہ ہے، جس کو (Leasing) کہا جاتا ہے۔ اور اس کی وضاحت پہلے (کمپنی کے لئے سرمائے کی فراہمی کے عنوان میں) ہو چکی ہے۔ یہاں اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ محض اجارے کا لفظ دیکھ کر کسی معاملے کو شرعی نہیں قرار دے دینا چاہئے۔ اس لئے کہ آج کل عموماً اجارے کے جو معاملات ہوتے ہیں ان میں اجارے کی حقیقت موجود نہیں۔

اجارے کی حقیقت یہ ہے کہ موجر (Lessor) جو مشینری وغیرہ اجارے پر دے رہا ہو وہ اس کا مالک اور ذمہ دار ہو، مگر تمویلی اجارے میں آج کل عملاً ایسا نہیں ہوتا۔ موجر (Lessor) اس مشینری کی کسی قسم کی ذمہ داری نہیں لیتا ہے، اگر مشینری کا نقصان ہو جائے تو وہ مستاجر (Lessee) کا نقصان سمجھا جاتا ہے، حتیٰ کہ کسی حادثے میں مشینری تباہ ہو جائے تو وہ مستاجر کرایہ دیتا رہتا ہے۔ موجر کا تعلق اس مشینری سے صرف اتنا ہوتا ہے کہ عدم ادائیگی کی صورت میں وہ مشینری کو بیچ کر اپنا قرضہ وصول کر لیتا ہے۔ لہٰذا آج کل عموماً حقیقی اجارہ نہیں ہوتا، اصل مقصد تو سود پر قرض دینا ہی ہوتا ہے، مگر ٹیکس میں بچت کرنے کے لئے اجارے کا نام دے دیا جاتا ہے۔ اس طرح کے معاملات شرعاً جائز نہیں۔ تاہم اگر واقعی موجر مشینری کا مالک ہو اور وہ اس کی ذمہ داری قبول کر کے اس کا اجارہ کرے تو اس کی گنجائش ہے۔ اور کرایہ مقرر کرتے ہوئے اس بات کو مدنظر رکھا جائے کہ مشینری کی قیمت مع کچھ نفع کے وصول ہو جائے تو اس میں بھی کوئی شرعی قباحت نہیں، مگر معاہدے میں یہ شرط نہ لگائی جائے کہ مدتِ اجارہ ختم ہونے پر مشینری خود بخود مستاجر کی ملکیت ہو جائیگی۔ اس لئے کہ اس میں "صفقته فی صفقة" کی شکل بن جاتی ہے۔ البتہ بغیر سابقہ شرط کے مدت ختم ہونے کے بعد اس کی طرف ملکیت منتقل کرنے کی گنجائش ہے۔

مرابحہ مؤجلہ

یہ بھی تمویل کا ایک شرعی طریقہ ہوسکتا ہے۔ جس کا حاصل یہ ہے کہ جب کوئی شخص بینک سے قرضہ لینے کے لئے آئے تو بینک اس سے پوچھے کہ کس چیز کو حاصل کرنے کے لئے رقم درکار ہے؟ بینک اس کو رقم دینے کے بجائے وہ چیز خرید کر مرابحۃً نفع پر ادھار بیچ دیتا ہے۔ نفع بطور مساومہ کے کوئی بھی قیمت طے کر کے لیا جاسکتا تھا، مگر نفع کی ایک شرح طے کر کے مرابحہ اس لئے کیا جاتا ہے تاکہ نظام میں یکسانیت رہے اور تمام لوگوں سے نفع ایک شرح کے ساتھ وصول ہو۔ نفع کی جو شرح طے کی جاتی ہے، اس کو مارک اپ (Mark Up) کہتے ہیں۔

یہ بھی تمویل کا ایک جائز طریقہ ہوسکتا ہے، بشرطیکہ اس کو ٹھیک ٹھیک ضروری شرائط کے ساتھ انجام دیا جائے۔ اس لئے کہ ادھار کی وجہ سے قیمت میں اضافہ کرنا باتفاق فقہاء جائز ہے۔ اسلامی بینکوں میں اس اس طریقے پر بڑی وسعت کے ساتھ عمل ہو رہا ہے، لیکن یہ انتہائی نازک طریقہ ہے، اس میں ذرا سی بے احتیاطی اس کو سودی نظام سے ملا دیتی ہے۔ آج کل بینکوں میں مرابحہ کی حقیقت کو سمجھے بغیر اور اس کی ضروری شرائط کی رعایت کیے بغیر اس پر عمل ہو رہا ہے۔ جس کے نتیجے میں اس میں

بہت سی خرابیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ یہاں ان غلطیوں کی نشاندہی کی جاتی ہے، جو عموماً مرابحہ کا معاملہ کرتے ہوئے بینکوں سے ہو جاتی ہیں۔ اور صحیح طریقے سے مرابحہ کرتے ہوئے ان سے بچنا ضروری ہے۔

مروجہ مرابحہ میں شرعی خامیاں

۱۔ مرابحہ کی صحیح شکل تو یہ ہے کہ بینک کوئی چیز خرید کر نفع (Mark Up) پر بیچ دے، مگر پاکستانی بینکوں میں ایسا بھی ہوتا رہا ہے کہ جس چیز پر مرابحہ کیا جا رہا ہے وہ چیز پہلے سے ہی اس شخص کے پاس موجود ہوتی تھی جو بنک سے قرض لینے کے لئے آیا ہے۔ بینک اس سے اس چیز کو نقد کم قیمت پر خرید کر پھر نفع پر اسی کو دوبارہ ادھار بیچ دیتا ہے۔ اس کو (Buy Back) (بائی بیک) کہتے ہیں۔ اس طرح حقیقتاً مرابحہ کی بجائے نفع (Mark Up) کو "بائی بیک" سے وابستہ کر دیا گیا۔ جو شرعی اعتبار سے بالکل ناجائز ہے، کیونکہ ایک ہی شخص سے کم قیمت پر خرید کر فوراً ہی اسے زیادہ قیمت پر ادھار بیچ دینا درحقیقت سودی قرض ہی کی ایک شکل ہے جب کہ پہلی خریداری میں ہی یہ شرط ہوتی ہے کہ اسے دوبارہ بیچ دیا جائیگا۔

۲۔ (Buy Back) کا حیلہ بھی حقیقت میں نہیں ہوتا، عموماً محض فرضی کارروائی ہوتی ہے۔ ایسا کوئی سامان سرے سے موجود ہی نہیں ہوتا جس پر بائی بیک کیا جا رہا ہو۔ حتیٰ کہ اداروں کے ایسے اخراجات جن سے کوئی چیز خریدی نہیں جاتی مثلاً تنخواہیں، بلوں کی ادائیگی وغیرہ ان کے لئے بھی بینکوں سے مرابحہ قرض مل جاتا ہے۔

۳۔ اگر (Buy Back) نہ ہو، حقیقت میں مرابحہ ہی ہو تو بھی اس بات کا اہتمام نہیں کیا جاتا کہ جس سامان کو مرابحۃً بیچا جا رہا ہے وہ بینک کے قبضے اور ضمان میں آئے حالانکہ مرابحہ کے درست ہونے کے لئے اس سامان کا پہلے بینک کے قبضے اور ضمان میں آنا ضروری ہے۔

۴۔ بینک کے پاس جب کوئی شخص سرمایہ حاصل کرنے کے لئے آتا ہے تو بینک تمویل کی حد مقرر (تحدید السقف) کر دیتا ہے کہ اتنے سرمائے کی حد تک بینک مرابحہ کرنے کے لئے تیار ہے۔ معاہدے (Agreements) پر دستخط کرائے جاتے ہیں۔ اس وقت بینک اس شخص کو سامان خریدنے کا وکیل بھی بنا دیتا ہے۔ لیکن اس وقت کوئی بیع منعقد نہیں ہوتی، بلکہ وہ محض ایک باہمی معاہدہ ہوتا ہے کہ بینک حسب ضرورت ان شرائط پر اپنے گاہک کو اس کی ضرورت کی اشیاء خرید کر فراہم کرے گا۔ اب ضرورت اس بات کی تھی کہ جب گاہک کو اس کی ضرورت ہو تو وہ بینک کو بتائے، پھر بہتر طریقہ

تو یہ ہوتا کہ بینک وہ چیز اپنے ذرائع سے خرید کر اپنے قبضے میں لاتا، پھر گاہک کو فروخت کرتا۔ لیکن اگر بینک خود خریدنے کے بجائے اسی گاہک کو خریداری کا وکیل بنائے تو اس میں کم از کم یہ ضروری تھا کہ پہلے گاہک وہ چیز بینک کے وکیل کی حیثیت سے خرید کر بینک کو مطلع کرے، پھر اس سے ایجاب وقبول کر کے اپنے لیے خریدے۔ یہاں گاہک کی دو حیثیتوں کو ایک دوسرے سے ممتاز رکھنا ضروری تھا۔ پہلے اس کی حیثیت وکیل کی ہے اور جب تک وہ اس حیثیت میں ہے اس پر وکالت کے احکام جاری ہوں گے۔ اور جب تک سامان پر اس کا قبضہ بینک کے وکیل کی حیثیت میں ہے، اس وقت تک وہ سامان بینک کی ملکیت میں ہے اور اسی کے ضمان میں ہے، لہٰذا اگر اس دوران وہ سامان وکیل کی کسی تعدی کے بغیر ہلاک ہو جائے تو بینک کا نقصان ہونا چاہئے۔ پھر وہ بینک کو اطلاع دے کر اس سے وہ سامان اپنے لئے خریدے تو اس وقت سامان گاہک کی ملکیت اور ضمان میں آجائے گا، اور اگر اس کے بعد ہلاک ہو تو گاہک کا نقصان ہوگا۔

گاہک کی ان دو حیثیتوں کا کلی طور پر ایک دوسرے سے ممتاز ہونا نہایت ضروری ہے۔ لیکن آجکل اکثر بینک اس بات کا لحاظ نہیں رکھتے بلکہ تحدید السقف کے وقت یعنی Limit منظور کرتے ہوئے مرابحہ کے معاہدے پر جو دستخط ہوتے ہیں، انہی کو کافی سمجھ لیا جاتا ہے۔ اس کے بعد گاہک سامان خود خرید کر اسے اپنے استعمال میں لاتا رہتا ہے، اور بینک سے خریداری کیلئے کوئی الگ ایجاب و قبول نہیں کیا جاتا۔ جس کے نتیجے میں یہ محض ایک مصنوعی کارروائی ہو جاتی ہے۔ اور عملی نتیجہ یہی ہوتا ہے کہ بینک نے گاہک کو رقم دی، اور ایک مدت کے بعد زیادہ رقم وصول کر لی۔ سامان کا بینک کے ضمان میں آنا، پھر اس کی ملکیت کا گاہک کی طرف منتقل ہونا، اور اسی مقصد کیلئے ایجاب وقبول وغیرہ کچھ نہیں ہوتا۔ یہ طریقہ بالکل حرام اور ناجائز ہے۔

۵۔ یہ غلطی بھی ہوتی ہے کہ تمویل کی حد مقرر کرنے (تحدید السقف) کے معاہدے پر دستخط ہوتے ہی بینک اس شخص سے Bill of Exchange (ہنڈی) یا پرامیسری نوٹ پر دستخط کرا لیتا ہے۔ یہ اس لئے غلط ہے کہ ہنڈی پر دستخط تو اس وقت ہوتے ہیں، جب کوئی شخص مدیون بن جاتا ہے۔ اور یہ شخص ابھی بینک کا مدیون نہیں بنا، ابھی تو آئندہ مرابحہ موجلہ کرنے پر آمادگی کا معاہدہ ہوا ہے۔ گاہک بینک کا مدیون اس وقت بنے گا جب وہ سامان بینک سے اپنے لئے خریدے گا، لہٰذا پرامیسری نوٹ پر دستخط بھی اسی وقت ہونے چاہئیں۔

۶۔ سودی نظام میں قرضہ کی ادائیگی کا وقت آجائے اور مقروض ابھی قرض ادا کرنے کی استطاعت نہ رکھتا ہو یا ابھی ادا نہ کرنا چاہتا ہو تو اس قرض کی مدت بڑھا دی جاتی ہے۔ پہلا سود قرضے

میں شامل ہو جاتا ہے اور اس پر مزید سود لگا کر مزید مہلت دیدی جاتی ہے۔ اس کو (Roll Over) (رول اوور) کرنا کہتے ہیں۔ مرابحہ میں بھی یہی سلسلہ شروع کر دیا گیا۔ مرابحہ کی ثمن کی ادائیگی کی استطاعت نہ ہو تو یہاں بھی قرض کو رول اوور کر دیتے ہیں، حالانکہ یہ تو ایک بیع تھی، اس میں سامان کی ایک قیمت طے تھی، اس قیمت میں اب اضافہ یا کمی ممکن نہیں، نہ اس مرابحہ پر مزید مرابحہ کیا جا سکتا ہے۔ مرابحہ کی حقیقت اور شرائط کو ملحوظ نہ رکھنے کی وجہ سے اس جیسی خرابیاں پیدا ہو جاتی ہیں، جن کی وجہ سے معاملہ شرعی طور پر جائز نہیں رہتا۔ اس لئے مرابحہ پر عمل کرنے کے لئے اس کی شرائط کی رعایت بہت ضروری ہے۔

اب مرابحہ موجلہ سے متعلق مسائل ذکر کیے جاتے ہیں۔

دین کا وثیقہ

مرابحہ موجلہ میں سامان کا ثمن خریدار کے ذمے دین ہو جاتا ہے، لہٰذا بینک دین کے وثیقے کے طور پر کفالت یا رہن کا مطالبہ کر سکتا ہے۔ رہن کی مختلف صورتیں آج کل رائج ہیں، ان کے شرعی احکام پر تفصیلی بحث میرے عربی رسالہ ''احکام البیع بالتقسیط'' میں موجود ہے۔ یہاں اس کا مختصر خلاصہ پیش کیا جاتا ہے۔

ثمن کی توثیق کے لئے مختلف صورتیں اختیار کی جا سکتی ہیں۔

۱۔ مبیع کو ہی بطور وثیقے کے پاس رکھ لیا جائے۔ اس کا حکم یہ ہے کہ استیفاء ثمن کے لئے حبس مبیع کے طور پر مبیع کو اپنے پاس رکھنا جائز نہیں۔ اس لئے کہ بیع موجل (ادھار بیع) میں بائع کو حبس مبیع کا حق نہیں ہوتا[۱] البتہ بطور رہن کے مبیع کو اپنے پاس رکھا جا سکتا ہے، بشرطیکہ خریدار مبیع پر قبضہ کرنے کے بعد پھر رہن رکھے۔[۲] حبسِ مبیع اور رہن میں فرق یہ ہے کہ حبسِ مبیع کی صورت میں وہ سامان مضمون بالثمن ہوگا اور اس کے ہلاک ہو جانے سے بیع فسخ جائے گی۔ اور رہن کی صورت میں وہ سامان مضمون بالقیمۃ ہوگا اور اس کے ہلاک ہونے سے بیع فسخ نہیں ہوگی۔

۲۔ آج کل رہن کی ایک صورت رائج ہے جس کو ''الرھن الساذج'' (Simple Mortgage) یا ''الذمة السائلة'' (Floating Charge) کہتے ہیں۔ جس کا حاصل یہ ہوتا ہے کہ رہن راہن کے قبضے میں ہی رہتا ہے، وہ اس کو استعمال بھی کرتا رہتا ہے، مرتہن رہن پر قبضہ نہیں

---

(۱) الهندية، ج ۳، ص ۱۵ - كتاب البيوع، الباب الرابع

(۲) ردالمحتار مع الدر المختار، ج ٦، ص ٤٩٧، كتاب الرهن

کرتا، البتہ مرتہن کو یہ حق حاصل ہوتا ہے کہ بر وقت دین کی ادائیگی نہ کرنے کی صورت میں اس کو بیچ کر دین وصول کر سکتا ہے۔ اور راہن دین ادا کرنے سے پہلے رہن کو خود تو استعمال کرتا رہتا ہے، مگر اس کی ملکیت کسی اور کی طرف منتقل نہیں کر سکتا۔

اس رہن میں اشکال یہ ہوتا ہے کہ اس میں مرہون شے کا قبضہ مرتہن کی طرف منتقل نہیں ہوتا جب کہ ظاہر یہ ہے کہ مرتہن کا قبضہ رہن کی صحت کیلئے ضروری ہے لیکن بعض وجوہ کی بناء پر (جن کی تفصیل مذکورہ رسالے میں موجود ہے) رہن کی یہ صورت جائز معلوم ہوتی ہے۔

۳۔ دین کی توثیق کی ایک شکل یہ ہے کہ کسی تیسرے شخص کو ضامن بنا لیا جائے، جس کو فقہی اصطلاح میں ''کفالہ'' کہا جاتا ہے۔ یہ صورت بھی جائز ہے اور اس کے تفصیلی احکام فقہاء نے لکھے ہیں، لیکن اس پر اجرت یا فیس لینا شرعاً جائز نہیں ہے۔

ادائیگی میں تاخیر پر جرمانہ

سودی نظام میں تو ادائیگی میں تاخیر کی صورت میں خود بخود سود بڑھتا رہتا ہے، جس کے ڈر سے مدیون دین بر وقت ادا کر دیتا ہے، مگر مشارکہ، مضاربہ یا مرابحہ میں یہ صورت نہیں ہوتی، اس لئے لوگ غلط فائدہ اٹھا کر ادائیگی میں تاخیر کرتے ہیں۔ اس کے سدباب کا کیا طریقہ ہو؟ یہ مسئلہ علمائے معاصرین میں موضوع بحث بنا ہوا ہے۔

اتنی بات تو طے شدہ ہے کہ ادائیگی میں تاخیر مدیون کے اعسار (نادار) ہونے کی وجہ سے ہو تو اس کا حکم قرآن پاک نے بیان کر دیا ہے۔

وان كان ذوعسرة فنظرة الى ميسرة"

یعنی مدیون کو کسی قسم کے اضافے کے بغیر مزید مہلت دینی چاہئے، لیکن اگر وہ مماطل ہو، یعنی سرمایہ پاس ہونے کے باوجود بلاوجہ تاخیر کر رہا ہو تو اس کا سدباب کیسے ہو؟

اس سلسلے میں بعض علمائے معاصرین نے مدیون پر تاخیر کی صورت میں 'تعویض مالی (Compensation) عائد کرنے کو جائز قرار دے دیا ہے۔ اور اس پر بعض بینکوں میں عمل ہو رہا ہے۔ جس کا فارمولا یہ وضع کیا گیا ہے کہ ایک ماہ کے نوٹس کے باوجود بھی اس نے ادائیگی نہ کی تو اب اس نے جتنی مدت تاخیر کی ہے، دیکھا جائے گا کہ بینک کے ''انوسٹمنٹ اکاؤنٹ'' (حساب الاستثمار) میں اس مدت میں کتنا نفع ہوا ہے۔ اسی حساب سے اس پر ہرجانہ لازم کیا جائے گا جو حکومت کو نہیں، بلکہ متضرر فریق یعنی بینک کو ملے گا۔ مثلاً بینک کے انوسٹمنٹ اکاؤنٹ میں پانچ فیصد

نفع ہوا ہے تو دین کا پانچ فیصد اس پر بطور ہرجانہ کے لازم ہوگا۔ اگر بینک کو اس دوران کوئی نفع نہیں ہوا تو اس سے بھی کچھ نہیں لیا جائیگا۔

لیکن اکثر علماء "تعویض مالی" کے قائل نہیں۔ اس کے جواز پر جو دلائل پیش کیے جاتے ہیں وہ مخدوش ہیں۔ (اس کی تفصیل میرے رسالہ "احکام البیع بالتقسیط" میں موجود ہے) شرعاً تو اس کا جواز مخدوش ہے ہی، عملاً بھی مفید نہیں۔ اس لئے کہ اس سے مدیون پر ادائیگی کے لئے دباؤ نہیں پڑے گا۔ اس لئے کہ "انوسٹمنٹ اکاؤنٹ" کا نفع عموماً کم ہوتا ہے اور مرابحہ کی شرح زیادہ ہوتی ہے لہٰذا کوئی شخص زیادہ شرح کے ساتھ طویل مدت کے لئے مرابحہ کرنے کی بجائے کم مدت کے لئے مرابحہ کر کے ادائیگی میں تاخیر کریگا اور "تعویض مالی" کو برداشت کرلے گا اور اس میں اپنے لئے دباؤ نہیں، بلکہ نفع محسوس کرے گا ___ لہٰذا تاخیر کے سدباب کا معقول طریقہ وہ ہے جو میں نے ابتداءً پیش کیا تھا اور بعد میں کافی مقبول ہوا۔ وہ یہ کہ مرابحہ یا اجارہ کے معاہدے (Agreement) میں مدیون یہ بات بھی لکھے کہ اگر میں نے ادائیگی میں تاخیر کی تو اتنی رقم کسی خیراتی کام میں خرچ کروں گا۔ یہ رقم دین کے تناسب سے بھی طے کی جاسکتی ہے۔ ایسی رقم سے ایک خیراتی فنڈ بھی قائم کیا جاسکتا ہے۔ اس فنڈ سے کسی کی امداد بھی کی جاسکتی ہے، اور اس سے لوگوں کو بلاسود قرض بھی دیا جاسکتا ہے۔ لیکن یہ رقم بینک کی آمدنی میں شامل نہیں ہوگی۔ یہ طریقہ زیادہ مفید اس لئے ہے کہ اس طریقے میں رقم کی شرح متعین نہیں ہے، زیادہ سے زیادہ بھی رکھی جاسکتی ہے، اس سے مدیون پر دباؤ ہوگا۔

اس کا جواز یہ ہے کہ یہ رقم نہ جرمانہ ہے اور نہ ربوا، بلکہ مدیون کی طرف سے التزام ہے، جس کو "یمین اللجاج" کہتے ہیں۔ اس التزام کا ذکر امام حطابؒ نے اپنی کتاب "تحریر الکلام فی مسائل الالتزام" میں کیا ہے۔

> "اما اذا التزم المدعی علیه للمدعی انه ان لم یوفه حقه فی وقت کذا و کذا فهذا لا یختلف فی بطلانه لانه صریح الربا-----الی قوله: واما اذا التزم انه ان لم یوفه حقه فی وقت کذا فعلیه کذا لفلان اوصدقة للمساکین فهذا هو محل الخلاف المعقود له هذا الباب فالمشهور انه لایقضی به کما تقدم وقال ابن دینار یقضی به" (ص۱۷٦، طبع بیروت)

اس سے معلوم ہوا کہ یہ التزام دیانۃً بالاتفاق لازم ہوتا ہے۔ اور قضاءً لازم ہونے میں اختلاف ہے۔ موجودہ ضرورت کی بناء پر ان حضرات کے قول پر عمل کرنے میں کوئی حرج نہیں، جو قضاءً بھی اس کے لازم ہونے کے قائل ہیں۔

قبل از وقت ادائیگی کی صورت میں دین میں کمی کرنا

اگر مدیون اپنا قرضہ مقررہ وقت سے پہلے ادا کر دے تو سودی نظام میں سود کم ہو جاتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ ایسی صورت میں مرابحہ کے ثمن میں کمی کی جا سکتی ہے یا نہیں؟ اس مسئلے کے دو پہلو ہیں۔

۱۔ ایک پہلو وہ ہے جس کو فقہاء کے ہاں ''ضع وتعجل'' سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یعنی مدیون اپنے دائن سے یہ کہے کہ تم دین کی کمی کر کے قبل از وقت وصول کر لو۔ اس کے حکم میں فقہاء کا مشہور اختلاف ہے، لیکن جمہور کے ہاں ناجائز ہے اور یہی صحیح ہے۔ (دلائل کی تفصیل رسالہ ''احکام البیع بالتقسیط'' میں ہے)

۲۔ بعض متاخرین حنفیہ نے مرابحہ موجلہ میں حلول اجل سے پہلے ادائیگی کی صورت میں ثمن میں کمی کرنا جائز قرار دیدیا ہے۔

لیکن بینکوں کو اگر اس کی کھلی چھوٹ دیدی جائے تو مرابحہ اور سودی نظام میں کوئی فرق باقی نہیں رہے گا، اس لئے مناسب یہ ہے کہ معاہدے میں تو یہ صراحت نہ ہو کہ پہلے ادائیگی کرنے سے قیمت کم ہو جائیگی، لیکن اگر کوئی شخص قبل از وقت ادائیگی کر دے تو اس وقت کسی سابق قرارداد کے بغیر کمی کر دی جائے تو مضائقہ نہیں۔

اسلامی طریقہ ہائے تمویل کی جزوی تطبیق

اب تک تمویل کے وہ طریقے اصولی طور پر بتائے گئے ہیں جو شرعی اصولوں کے مطابق ہو سکتے ہیں، اب یہ بات قابل غور ہے کہ ان طریقوں کی بینک کی جزئیات پر تطبیق کیسے ہو؟ جب تک بینک کے ایک ایک جزوی معاملے پر ان طریقوں کو منطبق نہ کیا جائے تو عملی طور پر نظام چلانا مشکل ہے، اس لئے اب بینک کے جزوی معاملات پر مختصراً گفتگو کی جاتی ہے۔

یہ بات پہلے (بنک کے وظائف بیان کرتے ہوئے) تفصیل سے بتائی جا چکی ہے کہ بینک کی تمویل کے تین طریقے ہوتے ہیں۔ تمویل کی تین صورتوں کو شرعی سانچے میں ڈھالنے کے لئے یہ غور کرنا ہوگا کہ یہاں کونسا اسلامی طریقہ تمویل اختیار کیا جائے۔

"تمویل المشاریع" (Project Financing) میں شرکت، مضاربہ، اجارہ اور مرابحہ سب طریقوں سے تمویل ہو سکتی ہے۔ اجارہ اس طرح کہ مشینری خرید کر بینک اجارے پر

دیدے۔ مرابحہ اس طرح کہ مشینری خرید کر نفع پر مرابحۃً بیچ دی جائے۔ شرکت اور مضاربہ کو طویل المعیاد تمویل میں استعمال کیا جاسکتا ہے۔

"تمویل رأس المال العامل" (Working Capital Financing) میں خاص معاملات کی حد تک مشارکہ اور مضاربہ ہوسکتا ہے۔ مثلاً بینک جو سرمایہ دے رہا ہے اس سے روئی خریدی جائے گی، اس سے کپڑا وغیرہ بنا کر جو نفع حاصل ہوگا اس میں بینک شریک ہوگا۔ اور خام مال کی ضرورت ہو تو اس میں مرابحہ بھی ہوسکتا ہے۔

Over Head Expenses (وہ اخراجات جن کا براہ راست پیداوار سے تعلق نہیں ہوتا۔ مثلاً تنخواہیں، کرایہ جات، بلوں کی ادائیگی وغیرہ) ان میں تمویل بہت مشکل ہے۔ یہاں اجارے اور مرابحہ کا امکان ہی نہیں۔ یہاں دو ہی راستے ہیں ایک مشارکہ کا طریقہ ہے۔ جتنی رقم کی ضرورت ہے، بینک اتنی رقم دے کر کاروبار کے کسی حصے میں شریک ہو جائے۔ جب بطور شرکت کے ادارے کو رقم مل گئی تو وہ کاروبار کی کسی بھی ضرورت میں خرچ کرسکتا ہے۔ دوسرا طریقہ بلاسود قرض کا ہے، اس میں بینک وہ اخراجات لے سکتا ہے جو اس قرض کا حساب کتاب رکھنے کے لئے ہوئے ہیں۔ اس میں اصل تو یہی ہے کہ حقیقی اخراجات وصول کیے جائیں۔ مگر ایک ایک قرضے پر ہونے والے حقیقی اخراجات معلوم کرنا تقریباً ناممکن ہے۔ اس لئے اس بات کی گنجائش معلوم ہوتی ہے کہ بینک انتظامی کاموں کی ''اجرت مثل'' وصول کرلے، اجرت مثل سے تجاوز نہ کیا جائے۔ اس کی نظیر یہ مسئلہ ہے کہ فتویٰ پر اجرت لینا ناجائز ہے مگر کتابت فتویٰ کی اجرت لینا جائز ہے۔ یہاں فقہاء نے یہ مسئلہ لکھا ہے کہ کتابت کی اجرت ''اجرت مثل'' سے متجاوز نہیں ہونی چاہئے۔

درآمد میں اسلامی بینکوں کا کردار

پہلے یہ بتایا جاچکا ہے کہ موجودہ نظام میں بینک کا درآمد اور برآمد میں بھی بڑا کردار ہوتا ہے۔ درآمد (Import) کی صورت میں بینک ایل سی کھولتا ہے اس پر اپنی خدمت کی اجرت، کفالت کی اجرت اور قرض ہو تو اس پر سود بھی لیتا ہے۔ (جیسا کہ تفصیل پہلے گزر چکی ہے) شرعی نقطہ نظر سے کفالت کی اجرت اور قرض پر سود لینا شرعاً جائز نہیں تو ایل سی کے متبادل دو چیزیں ہوسکتی ہیں۔

موجودہ اسلامی بینکوں میں عام طور پر ایل سی کے معاملات مرابحہ کے طور پر انجام پاتے ہیں۔ وہ اس طرح کہ جس چیز کو درآمد کرنا تھا بینک اس میں وکیل بننے کی بجائے خود اس کو خرید کر درآمد کرتا ہے اور مرابحۃً اس شخص کو بیچ دیتا ہے جو درآمد کرنا چاہتا تھا، ایل سی کی فیس وغیرہ کو مرابحہ کی شرح میں

شامل کر لیتا ہے۔ مرابحہ کی شرائط ملحوظ رکھی جائیں تو اصولی طور پر اس میں کوئی قباحت نہیں، تاہم عملاً یہ طریقہ پسندیدہ معلوم نہیں ہوتا۔ اس کی کئی وجوہ ہیں۔ ایک یہ کہ اس طریقے میں بہت سے مراحل پر مرابحہ کی شرائط پوری کرنا مشکل ہوتا ہے اور بسا اوقات عملاً بہت سی شرائط پوری بھی نہیں ہوتی ہیں۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ یہاں بینک کا ان چیز کو خرید کر مرابحہ کرنا محض ایک مصنوعی کارروائی ہے۔ اس لئے کہ درآمد کنندہ پہلے بائع سے پورا معاملہ طے کر چکا ہوتا ہے، صرف منگوانے کے وقت بینک بیچ میں آجاتا ہے، سرکاری کاغذات میں اور قانونی اعتبار سے درآمد کنندہ (Importer) بینک کو نہیں سمجھا جاتا، بلکہ اصل مشتری کو ہی سمجھا جاتا ہے۔ دوسرے ملک سے جو بائع مال بھیجتا ہے وہ بھی بینک کو خریدار نہیں سمجھتا ہے۔ تیسری وجہ یہ ہے کہ مرابحہ کے جواز کے لئے ضروری ہے کہ وہ چیز جو درآمد کی جارہی ہے، پہلے بینک کے ضمان میں آئے جب کہ بسا اوقات ایسا نہیں ہوتا ــــ ان وجوہ کی بناء پر ایل، سی کا معاملہ مرابحہ طور پر کرنا پسندیدہ نہیں تاہم اگر مرابحہ کی شرائط کا لحاظ صحیح شرعی طریقے سے ہو تو معاملہ جائز ہے۔

ایل، سی کا صحیح متبادل یہ ہے کہ معاملہ شرکت یا مضاربت کے طریقے پر کیا جائے۔ اگر ایل، سی زیرو مارجن پر ہو تو مضاربہ ہوگا اور بینک رب المال اور امپورٹر مضارب ہوگا۔ اور اگر ایل، سی کھلوانے والا کچھ رقم لگا رہا ہے تو شرکت ہوگی۔ مشارکہ یا مضاربہ کی صورت یہ ہوگی کہ بینک امپورٹر سے کہے گا کہ مال کی قیمت ہم ادا کر دیتے ہیں اور مال کو بیچنے سے جو نفع آئے گا وہ طے شدہ تناسب سے تقسیم کر لیا جائے گا۔ اس میں یہ صورت بھی قابل غور ہو سکتی ہے کہ بینک ایک مخصوص مدت کے لئے مشارکہ کرے، اس وقت تک اگر سامان فروخت ہو کر نقد رقم مل گئی تو نفع طے شدہ تناسب سے تقسیم کر لیا جائے اور اگر سامان بازار میں فروخت نہیں ہوا تو امپورٹر بینک کا حصہ خرید کر اسے ادائیگی کر دے۔

برآمد میں اسلامی بینکوں کا کردار

برآمد کے سلسلے میں بینک کے دو کردار ہیں۔ ایک یہ کہ وہ ایکسپورٹر کا بینک (Negotiating Bank) ہونے کی حیثیت سے کئی خدمات انجام دیتا ہے۔ مثلاً مال روانہ کرنے کے کاغذات (Bill of Lading) بھیجتا ہے، امپورٹر سے رقم وصول کرتا ہے اور ان خدمات کی اجرت وصول کرتا ہے وغیرہ۔ اس میں تو شرعاً کوئی اشکال نہیں، اس لئے کہ یہ تمام افعال ایسے ہیں، جن کی اجرت لینا جائز ہے۔ بینک کا دوسرا کردار یہ ہے کہ برآمد کنندہ (Exporter) کو مال خریدنے یا تیار کرانے کے لئے سرمائے کی ضرورت ہوتی ہے اور یہ سرمایہ بینک فراہم کرتے ہیں، جس کو

"تمویل الصادرات" (Export Financing) کہتے ہیں۔ "تمویل الصادرات" کی دو قسمیں ہیں، ان دونوں کو سمجھ کر دونوں کا شرعی طریق کار الگ الگ سمجھنا چاہئے۔ تمویل کی ایک قسم یہ ہے کہ کسی شخص کے پاس باہر سے آرڈر ہے، مگر مال خریدنے اور تیار کرنے کے لئے سرمائے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس مقصد کے لئے بینک تمویل کرتا ہے۔ اس کو "تمویل قبل الشحن" (Pre Shipment Financing) کہتے ہیں۔ دوسری صورت یہ ہوتی ہے کہ ایکسپورٹر نے مال خرید کر تیار کر کے بھیج دیا ہے، مگر رقم آنے میں کچھ دیر لگے گی، اتنی مدت کے لئے وہ چاہتا ہے کہ بینک سے اتنی رقم مل جائے۔ اس کو "تمویل بعد الشحن" (Post Shipment Financing) کہتے ہیں۔ سودی نظام میں تو ان دونوں صورتوں میں سود پر قرضہ دیدیا جاتا ہے۔ ان دونوں قسم کی تمویل کا شرعی طریقہ کیا ہو؟ یہاں اس پر گفتگو کرنی ہے۔

پہلی قسم یعنی "تمویل قبل الشحن" کے دو طریقے ہو سکتے ہیں۔

ا۔ بہت سے اسلامی بینکوں میں یہ صورت چل رہی ہے کہ بینک ایکسپورٹر سے وہ مال خود خرید کر اس کو قیمت ادا کر دیتا ہے۔ ایکسپورٹر نے اپنے امپورٹر سے جو قیمت طے کی ہوتی ہے، بینک اس سے کم قیمت پر مال ایکسپورٹر سے خریدتا ہے اور ایکسپورٹر نے جو قیمت غیر ملکی خریدار سے طے کر رکھی ہے اس پر اپنی طرف سے مال اس کو روانہ کرتا ہے جس سے بینک کو نفع ہو جاتا ہے۔

لیکن اس طریق کار میں کئی قباحتیں ہیں، وہ یہ کہ اس طریقے میں بیع کے شرعی تقاضے عموماً پورے نہیں ہوتے ہیں۔ مثلاً اب ایکسپورٹر بینک کو قرار دینا چاہئے۔ مگر بینک کے اس مال کو خرید لینے کے بعد کسی عمیل (جو شخص بینک سے سرمایہ لینے آیا تھا) کو ہی ایکسپورٹر سمجھا جاتا ہے اور ایکسپورٹر کی سرکاری مراعات بھی اسی کو ملتی ہیں۔ دوسرے ملک میں مال منگوانے والا (Importer) بھی بینک کو بائع نہیں سمجھتا، عمیل ہی کو سمجھتا ہے، حتیٰ کہ مال میں عیب وغیرہ کا دعویٰ بھی عموماً عمیل ہی پر ہوتا ہے، بینک پر نہیں ہوتا۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ بیع محض ایک مصنوعی کارروائی ہے۔ اگر قباحتوں کو دور کر کے واقعتاً بیع کی حقیقت پائی جائے تو یہ طریقہ قابل قبول ہو سکتا ہے۔

یہاں ایک ضمنی وضاحت ضروری ہے کہ موجودہ نظام میں بھی مال روانہ کرنے کے کاغذات (Bill of Lading) وغیرہ بینک کے نام پر ہی بنتے ہیں۔ اس پر (To The Order of the Bank) لکھا ہوا ہوتا ہے۔ اور رقم اور کاغذات کی وصولی بھی بینک ہی کرتا ہے۔ اس سے یہ غلط فہمی نہیں پیدا ہونی چاہئے کہ حقوق عقد بینک کی طرف راجع ہو گئے۔ اس لئے کہ بینک کا نام اس لئے نہیں لکھا جاتا کہ وہ حقیقتاً عاقد ہے، بلکہ بینک کا نام صرف بطور وثیقے کے لکھا جاتا ہے، جب تک بینک

اور عمیل کے معاملات صاف نہ ہوں گے، بینک کاغذات نہیں دے گا۔

۲۔ اس تمویل کی بہتر صورت یہ ہے کہ بینک اور عمیل کے درمیان شرکت یا مضاربت کا معاہدہ ہو۔ اگر عمیل بھی کچھ سرمایہ لگا رہا ہو تو شرکت ہوگی اور اگر وہ اپنا سرمایہ نہ لگا رہا ہو تو مضاربہ کا عقد ہوگا۔ عمیل بینک سے سرمایہ لے کر مال خریدے گا یا تیار کریگا پھر باہر بھیجے گا اور جو نفع ہوگا وہ تقسیم ہو جائے گا۔ اس صورت میں مشارکہ یا مضاربہ آسان بھی ہے، اس لئے کہ عمیل کا دوسرے ملک کے خریدار (امپورٹر) سے معاہدہ ہو چکا ہے اور قیمت بھی طے ہو چکی ہے، ادھر مال کی تیاری پر لاگت کا بھی اندازہ ہے۔ تو اس بات کا بسہولت اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس معاملے کے نتیجے میں کتنا نفع ہوگا؟ ـــــ البتہ اس میں ایک مشکل ہو سکتی ہے کہ عمیل نے مال مطلوبہ صفات کے خلاف بھیج دیا تو دوسری طرف مال وصول نہیں کیا جائے گا اور اس بینک کا بھی نقصان ہوگا۔ اس کا حل یہ ہو سکتا ہے کہ مشارکہ یا مضاربہ کے معاہدے میں بینک یہ شرط لگا دے کہ مال مطلوبہ صفات کے مطابق بھیجنا ہوگا۔ اب بھی اگر اس نے مطلوبہ صفات کے خلاف مال بھیجا تو اس کا ذمہ دار وہ عمیل ہوگا، بینک اس کا ذمہ دار نہیں ہوگا، اس لئے کہ شرط کی مخالفت کی وجہ سے یہ عمیل کی طرف سے تعدی ہے، اور تعدی کی صورت میں شریک یا مضارب کو ضامن بنایا جا سکتا ہے۔

"تمویل بعد الشحن" (Post Shipment Financing) اس کا وہی طریقہ ہوتا ہے جو "بل آف ایکسچینج" کی ڈسکاؤنٹنگ کا ہوتا ہے۔ ایکسپورٹر مال روانہ کر چکا ہے۔ اب اس کے پاس اس مال کا بل ہے، اس بل کو وہ بینک کے حوالے کر دیتا ہے اور بینک اس کی پختگی (Maturity) کو سامنے رکھ کر اس میں کٹوتی کر کے باقی رقم ایکسپورٹر کو دیدیتا ہے اور پختگی (Maturity) کی تاریخ آنے پر بینک یہ رقم امپوٹر سے وصول کر لیتا ہے۔ جیسا کہ بل آف ایکسچینج کی ڈسکاؤنٹنگ کی وضاحت ہم کر چکے ہیں۔

یہاں پہلے "خصم الکمبیالہ" (بل آف ایکسچینج کی ڈسکاؤنٹنگ) کے شرعی حکم پر گفتگو کی جاتی ہے۔ ڈسکاؤنٹنگ کی فقہی حیثیت یہ ہے کہ دائن جس کے ہاتھ میں بل ہے وہ دین کا بٹہ لگانے والے (Discounter) کی طرف حوالہ کر دیتا ہے۔ اور یہ حوالہ بالنقص من الدین ہے جو ناجائز ہے، اس لئے کہ یہ ربوالفضل ہے۔ ڈسکاؤنٹنگ کے اس معاملے کو "بیع الدین" نہیں کہا جا سکتا، اس لئے کہ بیع اور حوالہ میں یہ فرق ہوتا ہے کہ بیع کے بعد دائن بری الذمہ ہو جاتا ہے اور دین کے تمام حقوق اس شخص کی طرف راجع ہو جاتے ہیں جس سے دین کو خریدنا ہوتا ہے۔ اور "حوالہ" میں محیل ہی دائن رہتا ہے، وہ بری الذمہ نہیں ہوتا، اگر محتال کو دین نہ ملے تو وہ محیل کی طرف رجوع کا حق دار ہوتا ہے،

اور آج کل ڈسکاؤنٹنگ میں صورت حال یہی ہوتی ہے کہ اگر "بٹہ لگانے والے (Discounter) کو بل وصول نہ ہوتو وہ اصل دائن سے رجوع کرتا ہے لہٰذا یہ "بیع الدين من غير من عليه الدين "نہیں بلکہ "حوالة الدين بانقص من الدين" ہے۔

اس کی متبادل صورت کے لئے شروع میں احقر نے یہ تجویز پیش کی تھی کہ یہاں دو معاملے الگ الگ کیے جائیں۔ ایک یہ کہ بل میں کٹوتی کرنے کے بعد جتنی رقم باقی بچتی ہے اتنی رقم کا قرض لے لیا جائے۔ دوسرا معاملہ یہ ہے کہ اس کو دین وصول کرنے کا وکیل بنادے اور اس وکالت پر اجرت طے کردے۔ اب بینک بہ حیثیت وکیل دین وصول کر کے اس میں سے اپنی اجرت وصول کرلے اور باقی سے دین کا مقاصہ کرلے۔ مثلاً سو روپے کا بل ہوتو بینک نوے روپے قرض دیدے اور بینک کو بل وصول کرنے کا وکیل بنادیا جائے جس کی اجرت دس روپے ہوگی۔ اب بینک تاریخ آنے پر دوسو روپے وصول کر کے اس میں سے دس روپے اپنی اجرت رکھ لے اور نوے روپے سے اپنے دین کا مقاصہ کرلے، لیکن اس تجویز میں دو باتیں قابل غور ہیں۔ ایک یہ کہ عموماً وکالت کی اجرت کو بل کی رقم کی تعداد کے ساتھ مربوط کیا جائے گا۔ بل کی رقم زیادہ ہوتو اجرت بھی زیادہ ہوگی اور رقم کم ہوتو اجرت بھی کم ہوگی۔ دوسری بات یہ کہ اجرت کو مدت کے ساتھ بھی مربوط کیا جائے گا۔ بل کی پختگی زیادہ مدت کے بعد ہوئی ہوتو اجرت زیادہ ہوگی اور پختگی کم مدت میں ہوئی ہوتو کم اجرت کم ہوگی۔ اب یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ اجرت کو رقم کی تعداد اور مدت پختگی کے ساتھ مربوط کرنا درست ہے یا نہیں؟ اجرت کو رقم کی تعداد کیساتھ مربوط کرنے کا جواز معلوم ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ دلّالی (سمرة) کی اجرت کو مالیت کے ساتھ وابستہ کرنے میں اختلاف ہے، لیکن علامہ شامیؒ نے جواز کو ترجیح دی ہے[۱] دلال نے زیادہ مالیت کی چیز بیچی ہے تو زیادہ اجرت لینا اور کم مالیت کی چیز میں دلال بنا ہے تو کم اجرت لینا جائز ہے۔ اس کی جو وجہ علامہ شامیؒ نے لکھی ہے اس کا حاصل یہ ہے کہ گو یہاں مالیت کم یا زیادہ ہونے کی صورت میں دلال کی محنت اور عمل برابر ہے، مگر اجرت مقرر کرتے ہوئے صرف عمل اور محنت کو نہیں دیکھا جاتا، بلکہ اجرت مقرر ہونے میں عمل کی قدر اور نوعیت کا بھی دخل ہوتا ہے۔ کم مالیت کی چیز کی دلالی کی قدر کم ہے، اور زیادہ مالیت کی چیز کی قدر زیادہ ہے لہٰذا اس کی بناء پر اجرت میں بھی کمی، بیشی ہو سکتی ہے۔[۲] اس پر قیاس کرتے ہوئے وکالت کی اجرت کو مقدار رقم کے ساتھ وابستہ کرنے کی گنجائش معلوم ہوتی ہے، مگر اجرت کو مدت اور زمانے کے ساتھ مربوط کرنے کا کوئی جواز سمجھ میں نہیں آتا۔

(۱) الدر المختار، ج ٦، ص ٦٣، باب الاجارة الفاسدہ۔
(۲) الدر المختار، کتاب الاجارة، مسائل شتی، ج ٦، ص ٩٢، ایچ۔ ایم۔ سعید کمپنی

اس لئے کہ یہ ''عینہ'' والی شکل ہے کہ بلاسود قرض دیکر قرض کی مدت کے حساب سے وکالت کی اجرت وصول کر لی گئی یعنی جو سود قرض پر نہیں لیا جا سکا، وہ وکالت کی اجرت بڑھا کر وصول کر لیا گیا اس لئے یہ تجویز پسندیدہ نہیں۔لہٰذا جب تک ''تمویل بعد الشحن'' کی کوئی بے غبار شرعی صورت سامنے نہ آئے، اس وقت تک اس قسم کی تمویل بند ہی رکھنی ہوگی اور معاملات ''تمویل قبل الشحن'' (Pre-Shipment Financing) ہی کی بنیاد پر کیے جائیں گے، اور اگر ایکسپورٹ کی قیمت حاصل ہونے سے پہلے ایکسپورٹر کو رقم کی ضرورت ہو تو وہ بینک سے کوئی نیا مشارکہ، مضاربہ، یا مرابحہ کر سکتا ہے۔

''اعادة تمويل الصادرات'' کا حکم

درآمد، برآمد میں بینک کا کردار بیان کرتے ہوئے یہ بات بتائی جا چکی ہے کہ ''اسٹیٹ بینک آف پاکستان'' نے برآمدات کی حوصلہ افزائی کے لئے ایک اسکیم جاری کی ہے، جس کو (Export Refinancing Scheme) ''اعادة تمويل الصادرات'' کہتے ہیں۔ اس اسکیم کے دو طریقوں کی وضاحت بھی وہاں ہو چکی ہے۔ یہاں ان کے شرعی حکم پر گفتگو پیش نظر ہے۔

اس اسکیم کا پہلا طریقہ یہ تھا کہ ''اسٹیٹ بنک'' تجارتی بینکوں کو قرض دیتا تھا اور اس پر پانچ فیصد سود لیتا تھا اس کے سود ہونے میں تأمل کی بھی ضرورت نہیں۔لیکن یہ طریقہ ختم کر کے جو نیا طریقہ اختیار کیا گیا ہے، اس میں ''اسٹیٹ بنک'' تجارتی بینک کو باقاعدہ قرض نہیں دیتا بلکہ اس کے نام اکاؤنٹ کھول دیتا ہے، جس میں سے تجارتی بینک کو رقم لینے کا حق نہیں ہوتا۔ یہ حقیقت میں قرض کا معاملہ نہیں، بلکہ محض ایک کاغذی کارروائی (ہزل) ہے۔ اس پر ''اسٹیٹ بنک'' ٹریژری بل کے حساب سے جو رقم تجارتی بینک کو دیتا ہے، اس پر بھی اشکال نہیں۔اس لئے کہ وہ اسٹیٹ بینک کی طرف سے ایکسپورٹ کی حوصلہ افزائی کے لئے ابتداءً انعام کی حیثیت میں ہے، کسی معاملے کے نتیجے میں نہیں۔البتہ اسٹیٹ بینک تجارتی بینک سے پانچ فیصد لے کر یہ نفع دیتا ہے جو عموماً ۱۳ یا ۱۴ فیصد ہوتا ہے اس میں ربوا الفضل کا شبہ ہے۔لہٰذا اگر اسٹیٹ بینک پانچ فیصد تجارتی بینک سے لینا چھوڑ دے، اس کے بجائے وہ اس نفع کی مقدار کم کر دے جو وہ خود دے رہا ہے، مثلاً ۱۳ فیصد کی بجائے ۸ فیصد کر دے تو اس کی گنجائش معلوم ہوتی ہے۔اور سب سے بے غبار طریقہ یہ ہے کہ چونکہ اسٹیٹ بینک کا اصل مقصد برآمدات کی حوصلہ افزائی کے لئے بینکوں کو امداد (Subsidy) دینا ہے، تا کہ وہ کم نفع رکھ کر برآمدات کی تمویل کریں، لہٰذا اس کے لئے وہ براہ راست امداد دے۔

غیر مصرفی مالیاتی اداروں کا شرعی حکم

غیر مصرفی مالیاتی اداروں کا شرعی حکم

اس سے پہلے (Non-Banking Financial Institutions) (N.B.F.I) یعنی المؤسسات المالیة لمصرفیة کا اور ان کی اقسام کا قدرے تعارف پیش کیا جا چکا ہے۔ اس وقت ان میں سے اکثر مالیاتی ادارے سودی ہیں۔ ان کا بنیادی کام تمویل ہی ہے، لہٰذا ان کو شرعی اصولوں کے مطابق چلانے کا طریق کار بھی وہی ہوگا جو بینکوں کے بارے میں پیش کیا گیا ہے۔ البتہ یہاں ان چار اداروں پر گفتگو ہو جانی چاہئے جن کو "اسلامی نظریاتی کونسل" نے سب سے پہلے سود سے پاک کرنے کے لئے منتخب کیا تھا۔ وہ چار ادارے یہ تھے۔

(۱) (N.I.T) (۲) (I.C.P) (۳) (H.B.F.C) (۴) اسمال انڈسٹریز فنانس کارپوریشن۔ ان کو سود سے پاک کرنا آسان تھا، اس لئے "اسلامی نظریاتی کونسل" نے سب سے پہلے ان کے بارے میں تجاویز پیش کی تھیں۔ یہاں ان کا خلاصہ پیش کیا جاتا ہے۔

۱۔ (N.I.T) پہلے بتایا جا چکا ہے کہ یہ ادارہ (نیشنل انوسٹمنٹ ٹرسٹ) دس روپے کی قیمت اسمیہ (Face Value) کے یونٹ جاری کرتا ہے، لوگ یونٹ لے کر اپنی رقم جمع کراتے ہیں۔ ان رقموں سے جو فنڈ تیار ہوتا ہے اس سے سرمایہ کاری کی جاتی ہے اور نفع (Dividend) کی شکل میں یونٹ ہولڈرز میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ اس کے نظام پر جب غور کیا گیا تو اس میں دو باتیں قابل اشکال سامنے آئیں۔ ایک یہ کہ (N.I.T) کی زیادہ سرمایہ کاری شیئرز میں ہوتی ہے۔ اور اس سلسلے میں ہر طرح کی کمپنی کے شیئرز لے لیے جاتے ہیں۔ بینک اور سودی اداروں کے شیئرز اور ایسی کمپنیوں کے شیئرز بھی لیے جاتے تھے جن کا بنیادی کاروبار ہی حرام ہے۔ اس تدارک کے لئے (N.I.T) کو اس بات کا پابند کیا گیا کہ سودی اور حرام کاروبار والے اداروں اور کمپنیوں کے شیئرز نہیں لئے جائیں گے۔ دوسرا اشکال یہ تھا کہ (N.I.T) کے یونٹ ہولڈرز کو اعتماد میں لینے کے لئے حکومت نے اس بات کی ضمانت دی ہوئی تھی کہ اگر نقصان ہوا تو حکومت ادا کرے گی۔ بلکہ نفع نہ ہونے کی صورت میں ڈھائی فیصد تک نفع بھی حکومت دے گی، جب کہ حکومت خود (N.I.T) میں شریک بھی تھی۔ اور ایک شریک کا دوسرے شرکاء کے لئے نقصان کا ضامن بننا یا نفع کا ذمہ دار بننا جائز نہیں۔ اس اشکال کو حل کرنے کے لئے یہ تجویز زیر غور آئی کہ حکومت (N.I.T) سے اپنا حصہ ختم کر لے تو پھر یہ شریک کی ضمانت نہیں

ہوگی، بلکہ طرف ثالث کی ضمانت ہوگی۔ لہٰذا یہ بات قابل غور بن گئی کہ طرف ثالث کا نفع نہ ہونے کی صورت میں ڈھائی فیصد کی حد تک نفع کا اور نقصان کی صورت میں نقصان کا ضامن بننا درست ہے یا نہیں؟ فقہ حنفی کی رو سے تو اس کی گنجائش نہیں جس کی دو وجہیں ہیں۔

۱۔ کفالت اس حق کی صحیح ہوتی ہے جو خود لازم اور مضمون ہو۔ یہی وجہ ہے کہ ''ودیعت'' اور ''عاریت'' کی کفالت صحیح نہیں ہوتی۔ شرکت اور مضاربہ میں سرمایہ مضمون نہیں ہوتا۔ لہٰذا اس کے نقصان کی کفالت لازم و نافذ نہیں ہوگی۔ یہ محض ایک وعدہ ہوگا جو قضاءً لازم نہیں ہوتا۔ (۲) ھدایہ وغیرہ میں ہے ''ضمان الخسران باطل'' جس کا حاصل یہ ہے کہ کوئی شخص کسی کو کہے کہ تم یہ عقد یا کاروبار کرلو، اگر اس میں خسارہ ہوا تو میں ضامن ہوں گا تو ضمانت باطل ہے، نافذ نہیں ــــ البتہ مالکیہ کے ہاں طرف ثالث کی یہ ضمانت قضاءً لازم ہوسکتی ہے۔ وہ اس طرح کہ مالکیہ کا مذہب یہ ہے کہ ایسا وعدہ جس کی وجہ سے موعودلہ کو کسی مؤنۃ میں داخل کیا گیا ہو یا اس کو کسی کام پر آمادہ کیا گیا ہو وہ قضاءً بھی لازم ہو جاتا ہے۔ اس کی روشنی میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہاں حکومت نے طرف ثالث ہونے کی حیثیت سے ڈھائی فیصد نفع اور نقصان نہ ہونے کی ضمانت دے کر لوگوں کو (N.I.T) میں شرکت کی دعوت دی ہے اس لئے یہ ضمانت قضاءً بھی نافذ ہوگی[۱]۔ لہٰذا طرف ثالث کی ضمانت کو نافذ قرار دے کر حکومت کا حصہ (N.I.T) سے ختم کر دیا گیا۔ اور اس ضمانت کو نافذ قرار دیدیا گیا یہی وجہ ہے کہ (N.I.T) کے اشتہارات میں یہ لکھا ہوا ہوتا ہے کہ ڈھائی فیصد نفع یقینی ہے۔

چنانچہ ان تجاویز کی روشنی میں حکومت کی طرف سے احکام جاری ہوئے اور ابتداءً (N.I.T) نے انکے مطابق کام بھی کیا، مگر کارکردگی کی مسلسل نگرانی نہ ہونے کی وجہ سے (N.I.T) میں تبدیلی آئی اس کی وجہ سے نظام پھر غیر شرعی بن گیا، تبدیلی یہ آئی کہ (N.I.T) کے پاس سرمایہ زیادہ جمع ہوگیا۔ اور شیئرز میں سرمایہ کاری کو ناکافی سمجھا گیا تو (N.I.T) نے اور کئی طریقوں سے سرمایہ کاری شروع کر

(۱) بعض علماء نے فقہ حنفی سے ''ضمان خطر الطریق'' والے جزیے کی رو سے حنفیہ کے ہاں بھی اس ضمانت کو لازم قرار دیا ہے۔ اس کا حاصل یہ ہے کہ کسی نے دوسرے کو کہا "اسلك هذا الطريق فانه آمن فان هلك مالك فعلي" اس کے کہنے پر وہ اس راستے پر چلا اور اس کا مال ضائع ہوگیا تو وہ ضامن ہوگیا (شامی ص ۱۷۰ ج ۴ کتاب الجہاد) یہاں یہ ضمان اس شخص پر فی نفسہ لازم نہیں تھا' صرف اس وعدہ کی وجہ لازم ہوا ہے، ایسے ہی یہاں بھی طرف ثالث کے وعدے کی وجہ سے یہ ضمان لازم قرار دیا جاسکتا ہے، لیکن یہ قیاس صحیح معلوم نہیں ہوتا۔ اس لئے کہ ''ضمان خطر الطریق'' کے لازم ہونے کی علت دھوکا ہے۔ یہ کہہ کر کہ اس راستے میں نقصان نہیں ہوگا، اس نے دھوکہ دیا ہے۔ مگر زیر بحث صورت میں حکومت کی طرف سے دھوکہ نہیں، اس لئے حکومت کی ضمانت کا یہ مطلب نہیں کہ (N.I.T) میں نقصان ہوگا ہی نہیں۔ حکومت کا مقصد تو سرمایہ کاری کی ترغیب کے لئے تحفظ کا احساس دلانا ہے۔

دی اور وہ طریقے شرعاً جائز تھے۔ مثلاً

۱۔ مارک اپ پر کاروبار شروع کر دیا اور مارک اپ کا وہی غیر شرعی طریقہ اختیار کیا گیا جو بینکوں میں چلتا ہے۔

۲۔ بینکوں کی طرح اجارہ شروع کر دیا جس میں وہ شرعی خامیاں موجود تھیں جو پہلے بتائی گئی ہیں۔

۳۔ (P.T.C) کی ناجائز شکل اختیار کی گئی۔ پی، ٹی، سی کی حقیقت اور اس کا پس منظر سمجھنا بھی یہاں ضروری ہے۔

''اسلامی نظریاتی کونسل'' نے معیشت کو سود سے پاک کرنے کی تجاویز پیش کی تھیں، ان میں (P.T.C) (پی، ٹی، سی) کی تجویز بھی شامل تھی۔ جس کا حاصل یہ تھا کہ یہ پہلے بتایا جا چکا ہے کہ کمپنی کو کبھی سرمائے کی فراہمی کے لئے بانڈز جاری کرنے پڑتے ہیں جو سودی ہوتے ہیں۔ اس کا متبادل یہ پیش کیا گیا تھا کہ کمپنی مضاربہ کی دستاویزات جاری کرے گی۔ جس کا نام (Participation Term Certificate) (پارٹیسپیشن ٹرم سرٹیفکیٹ) ہوگا۔ یہ ایک معینہ مدت کے لئے مضاربہ کے سرٹیفکیٹ ہو گے۔ جو شخص یہ سرٹیفکیٹ حاصل کریگا وہ اس معینہ مدت میں کمپنی کے اثاثوں میں شریک ہو جائے گا۔ بوقت ضرورت وہ اپنے اس حصے کو بیچ بھی سکے گا ــــ یہ تجویز بعد میں کمپنی لاء کا حصہ بنی اور متعدد کمپنیوں نے ''پی، ٹی، سی'' جاری کیے۔ این، آئی، ٹی نے بھی جاری کرنے شروع کر دیئے، لیکن اس میں پیچیدہ قسم کی تبدیلیاں کر کے اس کو جاری کیا گیا، جس کی وجہ سے یہ ناجائز شکل اختیار کر گئے۔

۴۔ طویل المیعاد سرمایہ کاری کے لئے ٹی ایف سی جاری کیے گئے یعنی پی، ٹی، سی سے ملتے جلتے دستاویزات جاری کیے گئے جن کا نام (Term Finance Certifcate) (ٹرم فنانس سرٹیفکیٹ) تھا۔

اس کے بعد این، آئی، ٹی کے کاروبار میں پھر کچھ اصلاح ہوئی۔ جس میں مرابحہ اور اجارہ کے معاہدات (Agreements) کو درست کر دیا گیا، ''پی، ٹی، سی'' کو ختم کر دیا گیا اور ''ٹی، ایف، سی'' کو مرابحہ میں بدل دیا گیا۔ البتہ اب بھی این، آئی، ٹی کی دو مدیں ناجائز ہیں۔ ایک یہ کہ بینکوں کے ''پی، ایل، ایس'' اکاؤنٹ میں رقم رکھی جاتی ہے، جس کا سود آتا ہے۔ دوسری یہ کہ ''پی'' ''ٹی، سی'' آئندہ کے لئے تو ختم کر دئے گئے مگر پہلے سے جو چل رہے ہیں ان میں سے کچھ کی پختگی (Maturity) نہیں ہوئی، یعنی ان کی مدت پوری نہیں ہوئی۔ اس لئے فارم میں یہ شق رکھ دی گئی کہ ''میں پی، ایل، ایس اور پی، ٹی، سی کی آمدنی نہیں لینا چاہتا۔'' فارم میں یہ شق لکھ دینے کے بعد این، آئی، ٹی یونٹ لینے

کی گنجائش پیدا ہو گئی۔لیکن اب بھی عملاً کام درست ہونے کا کوئی اعتماد نہیں، جب تک مسلسل نگرانی کا کوئی انتظام نہ ہو۔

۲۔ (I.C.P): ''انوسٹمنٹ کارپوریشن آف پاکستان'' کا تعارف پہلے ذکر کیا جا چکا ہے۔اس کی سرمایہ کاری صرف کمپنیوں کے شیئرز میں ہوتی ہے۔اور اصولی طور پر اس کو اس بات کا پابند کیا گیا تھا کہ صرف ان کمپنیوں کے شیئرز لیے جائیں جن کا کاروبار بنیادی طور پر جائز ہو۔مگر عملاً ایسا ہو رہا ہے یا نہیں اس کو بیلنس شیٹ وغیرہ میں دیکھ کر حکم بتانا چاہئے۔

۳۔ اسمال انڈسٹریز فنانس کارپوریشن: یہ ادارہ چھوٹی صنعتوں کو سرمایہ فراہم کرنے کے لئے وجود میں آیا تھا۔پہلے سود پر قرضے دیتا تھا۔پھر ''اسلامی نظریاتی کونسل'' نے مرابحہ اجارہ وغیرہ میں تمویل کی سفارش کی۔

۴۔ (H.B.F.C): ہاؤس بلڈنگ فنانس کارپوریشن۔یہ ادارہ ''ہاؤس فنانسنگ''، یعنی گھر بنانے یا خریدنے کے لئے سرمایہ فراہم کرتا تھا۔مغربی روایتی ادارے تو اس مقصد کے لئے سود پر قرضے دیتے ہیں اور مکان کو رہن رکھ لیتے ہیں۔

''اسلامی نظریاتی کونسل'' نے ہاؤس فنانسنگ کے لئے جو تجاویز پیش کی تھی وہ ایک نئی قسم کا معاہدہ تھا جس کو ''شرکت متناقصہ'' (Decreasing Partnership) کہتے ہیں۔جس کا حاصل یہ ہے کہ تمویلی ادارے اور عمیل (Client) یعنی مکان کے خواہش مند کے مشترک سرمائے سے مکان خریدا یا بنایا جائے گا۔دونوں کے درمیان اپنے اپنے سرمائے کے تناسب سے مکان میں ''شرکت ملک'' ہوگی۔مثلاً ۲۵ فیصد سرمایہ عمیل کا اور ۷۵ فیصد ادارے کا تھا تو مکان دونوں کے درمیان ارباعاً مشترک ہوگا۔ایک چوتھائی حصہ عمیل کا اور تین چوتھائی حصے ادارے کے ہوں گے۔مکان بننے کے بعد عمیل کارپوریشن کو کرایہ ادا کرے گا۔اس کے ساتھ ساتھ مختلف وقفوں میں کارپوریشن کے حصے کو تھوڑا تھوڑا کرکے خریدتا بھی رہے گا۔اس مقصد کے لئے کارپوریشن کے حصے کے متعدد یونٹ بنا لیے جاتے ہیں۔مثلاً کارپوریشن کا حصہ دس یونٹوں میں خریدا جائے گا۔جوں جوں خریدنے کے نتیجے میں کارپوریشن کا حصہ کم ہوتا جائے گا، اسی تناسب سے کرایہ بھی کم ہوتا جائے گا۔جب عمیل کارپوریشن کے سارے حصے کو خرید لے تو کارپوریشن کی ملکیت ختم ہو جائے گی اور عمیل سارے مکان کا مالک بن جائے گا۔اب کرایہ دینے کا سلسلہ بھی ختم ہو جائے گا۔

فقہی نقطۂ نظر سے یہاں تین عقود ہوئے: (۱) شرکت ملک (۲) اجارہ (۳) بیع۔یہ تینوں عقد بغیر کسی شرط سابق کے الگ الگ ہوں تو ان کے جواز میں کوئی اشکال نہیں۔مگر عملاً یہاں ایک معاہدے

میں تین عقد ایک دوسرے کے ساتھ مشروط یا المعروف کالمشروط ہوں گے اور اس طرح معاہدے کے بغیر چارہ کار بھی نہیں۔ یہ صورتحال فقہی طور پر قابل غور ہے۔ یہاں یہ سمجھنا ضروری ہے کہ ایک عقد میں دوسرے عقد کی شرط لگانا اس وقت ناجائز ہے جب کہ صلب عقد میں دوسرے عقد کی شرط لگائی گئی ہو، لیکن اگر صورتحال یہ ہو کہ ایک دفعہ کئی عقود کا اس طرح اکٹھا معاہدہ کرلیا جائے کہ ابھی کوئی عقد انجام نہیں پارہا ہے، فی الحال صرف ان کے انجام پانے کا معاہدہ کیا جارہا ہے۔ پھر وہ عقود اپنی اپنی جگہ اور اپنے اپنے وقت پر انجام پائیں گے اور جب ان میں سے کوئی عقد عملاً ہورہا ہوگا اس وقت دوسرے عقد کی کوئی شرط نہیں ہوگی تو اس صورت پر ''صفقة فی صفقة'' یا ''بیع وشرط'' کے احکام جاری نہیں ہوں گے۔ اس کی نظیر ''بیع بالوفاء'' ہے جس کے بارے میں فقہاء کا اختلاف ہوا ہے اور صحیح یہ ہے کہ وفا کی شرط صلب بیع میں ہوتو ناجائز ہے، اور اگر بیع مطلق عن الشرط ہو اور وفا کا معاہدہ بیع الگ سے کیا گیا ہو تو یہ جائز ہے اور وعدہ وفا قضاءً بھی لازم ہو جائے گا۔ بیع کے بعد تو وفا کا جواز بہت سے فقہاء نے لکھا ہے۔ اور بیع سے پہلے وفا کے وعدہ کا نفاذ بھی ''جامع الفصولین'' میں مصرح ہے۔[1] اس سے معلوم ہوا کہ صلب عقد میں دوسرے عقد کی شرط لگانا جائز نہیں، البتہ عقد سے پہلے یا بعد میں دوسرے عقد کا معاہدہ کرنا جائز ہے۔ شرط لگانے اور وعدہ میں فرق یہ ہے کہ صلب عقد میں شرط لگانے سے بیع کا انعقاد ہی دوسرے عقد سے معلق ہوتا ہے یعنی اگر دوسرا عقد ہوگا تو بیع منعقد ہوگی ورنہ بیع بھی منعقد نہیں ہوگی۔ اور بیع ان عقود میں سے ہے جو تعلیق کو قبول نہیں کرتے ہیں جبکہ الگ سے وعدہ کرنے کی صورت میں بیع کی تعلیق لازم نہیں آتی اس تفصیل کی رو سے شرکت متناقصہ کا جواز معلوم ہوتا ہے اس لئے کہ پہلے ایک بار تین عقود کا معاہدہ ہوجاتا ہے، پھر ہر عقد اپنے اپنے وقت پر بغیر کسی شرط کے ہوتا رہتا ہے۔ لہٰذا مذکورہ تجویز کے مطابق اگر ''ہاؤسنگ فنانسنگ'' کا کام کیا جائے تو وہ جائز ہوگا۔ مگر یہاں بھی مسلسل نگرانی کے فقدان کی وجہ سے عملاً بہت سی شرعی قباحتیں پیدا ہوجاتی ہیں۔ چنانچہ ہاؤس بلڈنگ فنانس کارپوریشن اس وقت جس طرح کام کررہی ہے، اس میں متعدد شرعی قباحتیں موجود ہیں۔

ہاؤس فنانسنگ کو عربی میں التمویل العقاری کہتے ہیں، اور اس موضوع پر احقر کا ایک مستقل مقالہ ہے جو احقر کی عربی کتاب "بحوث فی قضایا فقهیة معاصرة" میں شائع ہوچکا ہے۔

''کینیڈا'' میں ''ہاؤس فنانسنگ'' کے لئے ایک ''کوآپریٹو سوسائٹی'' بھی قائم کی گئی ہے۔ جس کے لوگ ممبر بنتے ہیں اور ممبر ہی اس سے سرمایہ حاصل کرکے مکان خریدتے یا بناتے ہیں۔ اس کا فائدہ یہ ہے کہ سوسائٹی کا نفع پھر ممبران کو مل جاتا ہے اور ممبران ہی کو فائدہ ہوتا ہے۔

---

(۱) جلد اول، ص ۲۳۶، الفصل الثامن عشر۔

بیمہ

تأمین (Insurance)

بیمہ بھی آج کل کاروبار کا بڑا حصہ بن گیا ہے۔کوئی بھی بڑی تجارت اس سے خالی نہیں ہوتی۔ بیمہ کا مفہوم یہ ہے کہ انسان کو مستقبل میں جو خطرات درپیش ہوتے ہیں کوئی انسان یا ادارہ یہ ضمانت لیتا ہے کہ فلاں قسم کے خطرات کے مالی اثرات کی میں تلافی کر دوں گا۔ مشہور یہ ہے کہ اس کا آغاز چودہویں صدی عیسوی میں ہوا۔ دوسرے ممالک کی تجارت میں مال بحری جہاز سے روانہ کیا جاتا تھا۔ بحری جہاز ڈوب بھی جاتے تھے اور مال کا نقصان ہوتا تھا۔ بحری جہاز کے نقصان کی تلافی کے لئے ابتداءً بیمہ کا آغاز ہوا۔ علامہ شامیؒ نے بھی ''متامن'' کے احکام میں ''سوکرہ'' کے نام سے اس کا ذکر کیا ہے۔[1] جن خطرات کے خلاف بیمہ کیا جاتا ہے، ان خطرات کے لحاظ سے بیمہ کی تین بڑی قسمیں ہیں۔

۱۔ تأمین الاشیاء (Goods insurance) اس کا طریق کار یہ ہوتا ہے کہ جو شخص کسی سامان کا بیمہ کرانا چاہتا ہے وہ معین شرح سے بیمہ کمپنی کو فیس ادا کرتا رہتا ہے جسے ''پریمیم'' (Premium) کہتے ہیں، اور چونکہ پریمیم اکثر قسط وار ادا کیا جاتا ہے، اس لئے عربی میں اسے ''قسط'' کہتے ہیں اور اس چیز کو حادثہ لاحق ہونے کی صورت میں کمپنی اس کی مالی تلافی کر دیتی ہے۔ اگر س سامان کو جس کا بیمہ کرایا گیا تھا، کوئی حادثہ پیش نہ آئے تو بیمہ دار نے جو پریمیم ادا کیا ہے، وہ واپس یں ہوتا، البتہ حادثے کی صورت میں بیمے کی رقم بیمہ دار کو مل جاتی ہے۔ جس سے وہ اپنے نقصان کی لافی کر لیتا ہے۔ اس میں جہاز کا بیمہ، گاڑی کا بیمہ، مکان کا بیمہ وغیرہ داخل ہو گئے۔

۲۔ تأمین المسئولیۃ۔ جس کا حاصل یہ ہے کہ کسی پر مستقبل میں کوئی ذمہ داری آسکتی ہے۔ اس ذمہ داری سے نمٹنے کے لئے بیمہ کرایا جاتا ہے۔ مثلاً گاڑی روڈ پر لانے سے حادثے کے نتیجے میں کسی دوسرے کا نقصان ہونے کا خطرہ ہے۔ اس صورت میں گاڑی چلانے والے پر مالی تاوان لازم ہو جائے گا۔ اس کا بیمہ کرالیا جاتا ہے اور حادثے کے وقت تاوان کی ادائیگی بیمہ کمپنی کرتی ہے۔ اس کو عموماً (Third Party Insurance) (تھرڈ پارٹی انشورنس) کہتے ہیں۔ ہمارے ملک میں گاڑی سڑک پر لانے کے لئے یہ انشورنس قانوناً ضروری ہے۔ بعض مغربی ممالک میں یہ ہوتا ہے کہ اگر کسی شخص نے اپنے گھر کے سامنے برف صاف نہ کی اور کوئی شخص اس برف سے پھسل گیا جس سے اس کا

---

(۱) ردالمحتار، ۴: ۱۷۰، ایچ۔ایم۔سعید کمپنی

جسمانی نقصان ہوا تو وہ گھر والے پر مقدمہ کر کے اس سے بھاری تاوان وصول کرتا ہے۔ اس خطرے سے بچنے کے لئے بھی گھر کے مالکان بیمہ کرا لیتے ہیں، یہ بھی ''تامین المسئولیہ'' کی ایک شکل ہے جس میں اگر تاوان دینا پڑے تو بیمہ کمپنی تاوان ادا کرتی ہے۔

۳۔ تامین الحیاۃ۔ جس کو (Life Insurance) (بیمۂ زندگی) کہتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کمپنی بیمہ دار سے یہ معاہدہ کرتی ہے کہ اگر ایک مخصوص مدت میں بیمہ دار کا انتقال ہو گیا تو بیمہ کمپنی طے شدہ رقم اس کے ورثاء کو ادا کرے گی۔ اس کی بہت سی شکلیں ہوتی ہیں۔ بعض صورتوں میں مدت مقرر ہوتی ہے، اس مدت میں انتقال تو ہو گیا تو بیمہ کی رقم ورثاء کو مل جائے گی، اگر اس مدت میں انتقال نہ ہوا تو مدت ختم ہونے سے بیمہ ختم ہو جاتا ہے اور رقم مع سود کے واپس مل جاتی ہے۔ بعض صورتوں میں مدت مقرر نہیں ہوتی جب بھی انتقال ہو گا تو بیمہ کی رقم ورثاء کو مل جاتی ہے۔

''تامین الاشیاء'' اور ''تامین الحیاۃ'' میں بنیادی فرق یہ ہے کہ ''تأمین الاشیاء'' کی صورت میں وہ خطرہ پیش نہ آئے تو جو قسطیں (پریمیم) ادا کی تھی وہ رقم واپس نہیں ملتی ہے۔ اور ''تأمین الحیاۃ'' میں معینہ مدت میں وفات نہ ہونے کی صورت میں دی ہوئی رقم بمعہ سود واپس مل جاتی ہے۔

بیمہ کی طریق کار اور ہیئت ترکیبی کے لحاظ سے تین قسمیں اور ہیں۔

۱۔ التامین الاجتماعی'' حکومت کوئی ایسا طریقہ اختیار کرتی ہے جس میں افراد کے کسی مجموعے کو اپنے کسی نقصان کی تلافی یا کسی فائدے کے حصول کی سہولت حاصل ہو جاتی ہے، اسے ''گروپ انشورنس'' کہتے ہیں۔ مثلاً ملازمین کی تنخواہوں سے تھوڑی سی رقم ہر ماہ کاٹ کر اسے ایک فنڈ میں جمع کر لیا جاتا ہے، پھر ملازم کی وفات یا کسی حادثے کی صورت میں بھاری رقمیں ورثاء کو یا خود ملازم کو ادا کی جاتی ہیں۔ اس کی بے شمار صورتیں ہیں، ان تمام پر ایک اجمالی حکم لگانا مشکل ہے، ہر صورت کا حکم الگ ہوگا۔

۲۔ ''التامین التبادلی'' یا ''التأمین التعاونی'' اس کو انگریزی میں (Mutual Insurance) کہتے ہیں۔ اس کا حاصل یہ ہے کہ وہ لوگ جن کے خطرات ایک ہی نوعیت کے ہوتے ہیں وہ آپس میں مل کر ایک فنڈ بنا لیتے ہیں اور یہ طے کر لیتے ہیں کہ ہم میں سے کسی کو کوئی حادثہ پیش آیا تو اس فنڈ میں سے اس کے نقصان کی تلافی کی جائے گی۔ اس فنڈ میں صرف ممبران کی رقم ہوتی ہے۔ اور نقصان کی تلافی بھی صرف ممبران کی حد تک ہوتی ہے۔ سال کے بعد حساب کر لیا جاتا ہے۔ اگر ادا کیے گئے معاوضات فنڈ کی رقم سے بڑھ جائیں تو اسی حساب سے ممبران سے مزید رقم وصول کر لی جاتی ہے اور اگر فنڈ میں رقم بچ جائے تو ممبران کو واپس کر دی جاتی ہے یا ان کی طرف سے آئندہ سال

کے لئے فنڈ میں حصہ کے طور پر رکھ دی جاتی ہے۔

ابتداءً بیمے کی یہی شکل چلی تھی، اور شرعاً اس میں کوئی اشکال نہیں، اور جتنے علماء نے بیمے پر گفتگو کی ہے وہ اس کے جواز پر متفق ہیں۔

۳۔ "التأمین التجاری" یا "التأمین بقسط ثابت" جس کو انگریزی میں (Commercial Insurance) کہتے ہیں۔ اس کا طریق کار یہ ہے کہ بیمہ کمپنی قائم کی جاتی ہے، اس کمپنی کا مقصد بیمے کو بطور تجارت کے اختیار کرنا ہوتا ہے۔ اور اس کا اصل مقصد بیمے کے ذریعے سے نفع کمانا ہوتا ہے، جیسے دوسری کمپنیاں مختلف کاروبار سے نفع کماتی ہیں۔ یہ کمپنی مختلف قسم کے بیمے کی اسکیمیں جاری کرتی ہیں۔ اس کے بعد بیمہ کمپنی کا معاہدہ ہوتا ہے کہ اتنی رقم کی اتنی قسطیں آپ ادا کریں گے اور نقصان کی صورت میں کمپنی آپ کے نقصان کی تلافی کرے گی۔ کمپنی قسطوں کا تعین کرنے کے لئے حساب کر لیتی ہے کہ جس خطرے کے خلاف بیمہ ہوا ہے وہ کتنی بار متوقع ہے تاکہ ان کے معاوضات ادا کر کے کمپنی کو نفع بچ سکے۔ اس حساب کے لئے ایک مستقل فن ہے جس کے ماہر کو "ایکچوری" (Actuary) کہتے ہیں۔

بیمے کی اسی قسم کا رواج زیادہ ہے، اور اسی کا شرعی حکم علمائے معاصرین میں زیادہ محلِ بحث بنا ہے۔ اس کے بارے میں علمائے عرب میں سے شیخ ابوزہرۃ اور مصطفیٰ الزرقاء کا شدید اختلاف رہا ہے۔ شیخ ابوزہرہ اس کی حرمت قائل تھے۔ اور مصطفیٰ زرقاء اس کے جواز کے قائل تھے۔ اس وقت عالم اسلام کے تقریباً تمام مشاہیر علماء اس کی حرمت کے قائل ہیں۔ البتہ مشاہیر میں سے صرف دو عالم اس کے جواز کے قائل ہیں۔ ایک شیخ مصطفیٰ زرقاء اور دوسرے شیخ علی الخفیف۔

جمہور کا موقف یہ ہے کہ اس بیمے میں قمار بھی ہے اور ربوا بھی۔ قمار اس لئے کہ ایک طرف سے ادائیگی متعین ہے اور دوسری طرف سے ادائیگی موہوم ہے۔ جو قسطیں ادا کی گئی ہیں وہ تمام رقم ڈوب بھی سکتی ہے اور اس سے زیادہ بھی مل سکتی ہے۔ اس کو قمار کہتے ہیں اور ربوا اس طرح کہ یہاں روپے کا روپے سے تبادلہ ہے اور اس میں تفاضل ہے کہ بیمہ دار کی طرف سے کم رقم دی جاتی ہے اور زیادہ رقم ملتی ہے البتہ "تامین الحیاۃ" (بیمہ زندگی) میں قمار نہیں، اس لئے وہاں رقم یقیناً واپس مل جاتی ہے، مگر ربوا اور غرر ہے۔ ربوا تو ظاہر ہے۔ غرر کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ارکان عقد (ثمن، مبیع یا اجل) میں سے کسی چیز کا مجہول ہونا اور غیر معین واقعے پر موقوف ہونا۔ یہاں غرر اس طرح ہے کہ معلوم نہیں کہ کتنی رقم واپس ہوگی، یہ بھی ہوسکتا ہے کہ جتنی رقم دی تھی وہی بمعہ سود کے واپس ملے اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ حادثے کی صورت میں زیادہ رقم مل جائے۔

مصطفیٰ زرقاء اور شیخ علی الخفیف کے دلائل کی تفصیل کا یہاں موقعہ نہیں البتہ انکے دلائل کا حاصل اور خلاصہ پیش کیا جاتا ہے۔انکے دلائل کا خلاصہ چند باتیں ہیں۔

۱۔ قمار اور بیمے میں فرق ہے۔ قمار با قاعدہ عقد نہیں، محض ایک لعب اور ہزل ہے۔اور بیمہ با قاعدہ ایک عقد اور جدّ ہے۔اس کا جواب یہ ہے کہ اس عقد کا قمار، ربوا اور غرر پر مشتمل ہونا ہم واضح کر چکے ہیں۔قمار کیلئے یہ ضروری نہیں کہ وہ لعب یا ھزل ہو جدّ ہونے کی صورت میں بھی قمار متحقق ہو جاتا ہے۔

۲۔ یہاں معقود علیہ وہ روپے نہیں جو حادثے میں کمپنی ادا کرتی ہے، بلکہ وہ امان اور اطمینان ہے جو بیمے کے نتیجے میں حاصل ہوتا ہے۔اور امان کا معاوضہ ادا کرنا جائز ہے۔اس کے لئے وہ چوکیدار کی مثال پیش کرتے ہیں کہ چوکیدار کی تنخواہ اس امان کا معاوضہ ہوتا ہے جو اس چوکیدار کی وجہ سے حاصل ہوتا ہے ــــ اس کا جواب یہ ہے کہ امان معقود علیہ نہیں، معقود علیہ روپے ہی ہیں۔اور امان اس کا ایک ثمرہ اور نتیجہ ہے۔چوکیدار کی مثال میں بھی چوکیدار کا عمل معقود علیہ ہوتا ہے۔امان اس کا ثمرہ ہوتا ہے۔اور چونکہ چوکیدار کا عمل معقود علیہ بن سکتا ہے، اس لئے وہ جائز ہے۔لیکن روپے کو معقود علیہ بنانے کی صورت میں مساوات شرط ہے جو بیمے میں مفقود ہے۔

۳۔ ”التامین التبادلی“ (Mutual Insurance) کے جواز کے تو تمام علماء قائل ہیں۔ اور ”التامین التجاری“ (Commercial Insurance) بھی اسی کی ایک وسیع صورت ہے۔ بڑے پیمانے پر لوگوں کو ممبر بننے کا موقعہ دینے کے لئے ایک وسیع ادارہ تشکیل دیدیا گیا ہے۔اس کے منتظمین کو انتظامات کی اجرت ملنی چاہئے۔ بیمہ کمپنی کو جو نفع ملتا ہے وہ اس کے انتظامات کی اجرت ہے۔اس استدلال کا حاصل یہ ہے کہ ”التامین التجاری“ بھی ”التامین التبادلی“ کی طرح ہے ــــ اس کا جواب یہ ہے کہ ”التامین التبادلی“ ایک تبرع ہے اور ”التامین التجاری“ معاوضہ ہے۔تبرع میں غرر متحمل ہوتا ہے، عقد معاوضہ میں غرر متحمل نہیں ہوتا۔

۴۔ ان کا ایک استدلال یہ بھی ہے کہ ”بیمہ“ ایک عقد جدید ہے۔اور اصل عقود میں اباحت ہوتی ہے، جب تک اس میں کوئی شرعی قباحت نہ ہو۔اور بیمے کی جو توجیہ ہم نے کی ہے، اس میں کوئی قباحت نہیں، لہٰذا اس کی گنجائش ہے۔اس کا جواب یہ ہے کہ بیمے کی شرعی خامیاں قمار، ربوا اور غرر ہم نے بیان کر دی ہیں۔لہٰذا یہاں اباحت اصلیہ کا قاعدہ نہیں چل سکتا۔

بیمہ کا متبادل

بیمہ کا متبادل ایک تو تعاونی (Mutual Insurance) ہے جس میں شرکاء اپنی اپنی مرضی سے فنڈ میں رقمیں جمع کراتے ہیں، اور سال کے دوران جن جن لوگوں کو کوئی نقصان پہنچا، اس فنڈ سے ان کی امداد کرتے ہیں۔ پھر سال کے ختم پر اگر رقم بچ گئی تو وہ شرکاء کو بحصہ رسدی واپس کر دی جاتی ہے یا ان کی طرف سے آئندہ سال کے فنڈ کیلئے چندے کے طور پر رکھ دی جاتی ہے۔

اس کے علاوہ اب عالم اسلام کے کئی ملکوں میں ''شرکات التکافل'' کے نام سے کچھ کمپنیاں قائم ہوئی ہیں جنہیں تجارتی بیمے کے متبادل کے طور پر قائم کیا گیا ہے۔ ان کا بنیادی تصور یہ ہے کہ ہر بیمہ دار کمپنی کا شیئر ہولڈر ہوتا ہے، کمپنی اپنا سرمایہ نفع بخش کاموں میں لگا کر اس کا نفع اپنے شیئر ہولڈرز میں تقسیم بھی کرتی ہے، اور کمپنی ہی کے ایک ریز روفنڈ سے بیمہ داروں کے نقصانات کی تلافی بھی کرتی ہے۔

مجھے ابھی ان کمپنیوں کے مفصل طریقہ کار کی تمام جزئیات پر فقہی نقطہ نظر سے غور کرنے کا موقع نہیں ملا۔ اس لئے ابھی میں اس کے بارے میں کوئی ذمہ دارانہ بات نہیں کہہ سکتا۔

مالیات عامہ

(Public Financing)

اس موضوع سے مراد یہ ہے کہ ملک کے اجتماعی اخراجات کیا ہوتے ہیں، ان کا تعین کیسے ہوتا ہے اور ان اخراجات کی تمویل کیسے ہوتی ہے؟ آئین کے مطابق حکومتیں ٹیکس عائد کرتی ہیں۔ اور پارلیمنٹ اخراجات کی تحدید کر کے ان کی اجازت دیتی ہے۔ ہر سال حکومت کی آمدنی اور اخراجات کے تعین کے لئے جو دستاویز تیار کی جاتی ہے، اسے اردو میں میزانیہ اور انگریزی میں بجٹ کہتے ہیں۔

بجٹ وفاقی حکومت کا الگ ہوتا ہے، صوبائی حکومتوں کا الگ اور مقامی انتظامیہ کا الگ ہوتا ہے۔ ایک مجموعی بجٹ وفاقی اور چاروں صوبائی بجٹ کو ملا کر بھی تیار کیا جاتا ہے۔ جس کو (Consolidated Budget) کہتے ہیں۔

بجٹ کے دو حصے ہوتے ہیں ایک حصے میں یہ بات درج ہوتی ہے کہ آنے والے سال میں متوقع اخراجات کیا ہیں اور دوسرے حصے میں اندازہ لگایا جاتا ہے کہ سال آئندہ کتنی آمدنی کی توقع ہے۔ اگر متوقع آمدنی اخراجات کے مقابلے میں کم ہو تو کہا جاتا ہے کہ بجٹ میں خسارہ ہو گیا۔ اگر

آمدنی اور اخراجات برابر ہوں تو اسے متوازن بجٹ سمجھا جاتا ہے اور اگر آمدنی اخراجات سے زائد ہو تو اسے فاضل بجٹ کہا جاتا ہے۔

اخراجات

اخراجات دو قسم کے ہوتے ہیں۔

۱۔ جاری (Current) اخراجات۔ اس سے مراد وہ اخراجات ہیں جن کا فائدہ صرف اس دورانیہ میں حاصل ہوگا، جس کے لئے بجٹ بنایا گیا ہے۔ بجٹ ایک سال کا ہے تو ایک سال کی حد تک ہی فائدہ ہوگا۔ مثلاً حکومت کو جو سود ادا کرنا ہے وہ جاری اخراجات میں شامل ہے۔

۲۔ جامد اخراجات۔ وہ اخراجات جن کا فائدہ اس دورانیے کے بعد بھی ہوگا۔ جیسے سڑکوں، پل وغیرہ پر جو اخراجات ہوئے۔ ان کو ترقیاتی اخراجات بھی کہتے ہیں۔ مثلاً ۹۳-۱۹۹۲ کے بجٹ میں اخراجات اس طرح ہیں۔

جاری اخراجات	:	۲۵۷ ارب روپے
ترقیاتی اخراجات	:	۷۳ ارب روپے
کل اخراجات	:	۳۳۰ ارب روپے

آمدنی

آمدنی بھی دو قسم کی ہوتی ہے۔(۱) محصولاتی۔(۲) غیر محصولاتی

محصولاتی آمدنی:

اس سے مراد وہ آمدنی ہے جو حکومت کو ٹیکسوں سے حاصل ہوتی ہے۔ ٹیکس دو قسم کے ہوتے ہیں:

۱۔ بلاواسطہ۔ (Direct Tax) جو افراد پر اس طرح عائد ہو کہ وہ اس کا بار کسی اور پر نہ ڈال سکیں۔ جیسے آمدنی، تنخواہ، اور جائیداد پر ٹیکس۔

۲۔ بالواسطہ ٹیکس۔ (Indirect Tex) ایسا ٹیکس جس کا بار دوسرے کی طرف بھی منتقل کیا جاتا ہے۔ جیسے دکان اور کارخانے پر ٹیکس کہ دکاندار یا کارخانہ دار قیمتیں بڑھا کر دوسروں پر اس کا بار ڈال سکتا ہے۔ یا ''سیلز ٹیکس'' جو وصول تو دکاندار سے کیا جاتا ہے، لیکن دکاندار ہر چیز کی فروخت کے وقت یہ ٹیکس اپنے خریدار سے وصول کر لیتا ہے۔

معاشیات میں ٹیکس کے اصول بھی بتائے جاتے ہیں۔ ٹیکس لگاتے ہوئے ان اصولوں اور خصوصیات کی رعایت ہونی چاہئے۔

(۱) ٹیکس کی تعداد میں ابہام نہ ہو (۲) ٹیکس کی ادائیگی کا نظام آسان ہوتا کہ ٹیکس ادا کرنے کے لئے لوگوں کو مشکلات کا سامنا نہ کرنا پڑے (۳) ٹیکس بقدر کفایت ہو۔ حکومت کی ضرورت سے زیادہ بھی نہ ہو اور کم بھی نہ ہو (۴) تمام طبقات پر مساوی درجے میں عائد ہو (۵) اتنا زیادہ ٹیکس نہ ہو کہ اس سے لوگ یہ محسوس کرنے لگیں کہ ہمیں کاروبار کا فائدہ ہی کچھ نہیں ہوتا، لہٰذا اس کے نتیجے میں ملک میں عمل پیدائش متاثر ہونے لگے (۶) ٹیکس کی مقدار لچکدار ہو۔ اشیاء کی قیمتوں اور آمدنی میں اتار چڑھاؤ سے خود بخود بدل جاتا ہو، بار بار بدلنا نہ پڑے۔ مثلاً کسی چیز پر مقدار مقرر کر کے ٹیکس لگانا غیر لچکدار ہے۔ اور قیمت کے فیصدی تناسب سے ٹیکس طے کیا جائے تو یہ لچکدار ہے جو اس چیز کی قیمت بدلنے سے بدلتا رہے گا (۷) ٹیکس کا نظام ایسا نہ ہو جو معاشی ترقی پر اثر ڈالے۔

غیر محصولاتی آمدنی:

اس سے مراد وہ آمدنی ہے جو سرکاری یا نیم سرکاری اداروں سے حاصل ہوتی ہے، مثلاً واپڈا، فون، پی آئی اے، پوسٹ آفس اور ریلوے وغیرہ سے جو آمدنی حاصل ہوتی ہے وہ غیر محصولاتی آمدنی ہے۔

خسارہ اور خساراتی تمویل

اخراجات میں سے آمدنی منہا کر کے جو باقی بچے وہ خسارہ ہے۔ مثلاً پاکستان کے ۹۳-۱۹۹۲ کے بجٹ میں خسارہ کی صورت یوں ہے۔

کل اخراجات	:	۲۳۰ ارب روپے
کل آمدنی	:	۲۶۵ ارب روپے
خسارہ	:	۶۵ ارب روپے

اس خسارے کو پورا کرنے کے لئے سرمایہ فراہم کرنا "خساراتی تمویل" (Deficit Financing) کہلاتا ہے۔ خسارے کی تمویل کے لئے حکومت قرضے لیتی ہے۔ قرضے دو قسم کے ہوتے ہیں۔

۱۔ بیرونی قرضے۔ (Foreign Loans) جو دوسرے ممالک کی حکومتوں یا بین الاقوامی اداروں سے لئے جاتے ہیں۔

۲۔ داخلی قرضے (Internal Lonans) جو اندرون ملک موجود بنکوں، مالیاتی اداروں یا عوام سے لئے جاتے ہیں۔

پھر داخلی قرضے دو قسم کے ہوتے ہیں۔

(۱) غیر بینکی (Non - Banking) جو عوام سے لئے جاتے ہیں۔ عوام سے قرضے لینے کے لئے ''سرکاری تمسکات'' جاری کیے جاتے ہیں۔ آج کل حکومت کی طرف سے مختلف سیونگ اسکیمیں اسی غرض سے جاری کی گئی ہیں۔ اس میں عام آدمی یہ ''سرکاری تمسکات'' خرید کر پیسے حکومت کو دیدتا ہے، مثلاً انعامی بانڈ، نیشنل ڈیفنس سیونگ سرٹیفکیٹ، خاص ڈپازٹ سرٹیفکیٹ وغیرہ۔ ان تمام تمسکات پر آج کل عوام کو سود دیا جاتا ہے۔

(۲) بینکی قرضے (Banking Loans) اس کو ''نوٹ چھاپنے'' سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے۔ لیکن واقعتاً حکومت نوٹ نہیں چھاپتی ہے۔ اسلئے کہ آئینی طور پر نوٹ چھاپنے کا اختیار حکومت کو نہیں بلکہ اسٹیٹ بینک آف پاکستان کو ہے۔ اس تمویل کا طریقہ یہ ہے کہ حکومت ''ٹریژری بل'' جاری کر کے اسٹیٹ بینک سے قرضہ لیتی ہے۔ اتنی رقم حکومت کے اکاؤنٹ میں جمع کر دی جاتی ہے۔ اسی کو ''نوٹ چھاپنا'' کہہ دیتے ہیں۔ حکومت جب اسٹیٹ بینک کو ادائیگی کرتی ہے تو عموماً آج کل اس کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ رقم کے مزید ''ٹریژری بل'' جاری کر دیتی ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ حکومت اسٹیٹ بینک کو کہہ دیتی ہے کہ میرے اکاؤنٹ سے اتنی رقم کم کر دو۔

پھر قرضے کی تین مدات ہوتی ہیں جو بجٹ میں لکھی جاتی ہیں۔

۱۔ مستقل قرضے (Permanent Loans) یہ وہ قرضے ہیں جو حکومت ''سرکاری تمسکات'' کے ذریعے عوام سے وصول کرتی ہے۔ جو واپس نہیں کیے جاتے ہیں۔ البتہ ان ''تمسکات'' کو ثانوی بازار (Secondary Market) میں بیچا جاسکتا ہے جیسے پرائز بانڈ وغیرہ۔

۲۔ رواں قرضے (Floating Loans) اس سے مراد وہ قرضے ہوتے ہیں جو حکومت اسٹیٹ بینک سے لیتی ہے۔

۳۔ قصیر المیعاد قرضے (Unfunded Loans) اس سے مراد وہ دستاویزات ہیں جو کم مدت کے لئے ہوں۔ جیسے ڈیفنس سیونگ سرٹیفکیٹ، نیشنل ڈپازٹ سرٹیفکیٹ، ماہانہ آمدنی، خاص ڈپازٹ وغیرہ۔

خساراتی تمویل میں زیادہ حصہ داخلی قرضوں کا ہوتا ہے۔ بیرونی قرضے اس کے مقابلے میں بہت کم ہوتے ہیں۔ مثلاً ۹۳۔۱۹۹۲ء میں جو قرضے لئے گئے ان کی تفصیل اس طرح ہے۔

داخلی بنکی قرضے	:	۱۲۱ارب روپے
داخلی غیر بنکی قرضے	:	۴۸اارب روپے
بیرونی قرضے	:	۱۷اارب روپے
کل قرضے	:	۱۸۶ارب روپے

قرضوں کی رقم صافی طور پر لکھی جاتی ہے۔یعنی صرف قرضے کی رقم ہی لکھی جاتی ہے۔اس پر جوسود ادا کرنا ہوگا وہ اخراجات میں لکھا جاتا ہے۔آج کل ہمارے ملک میں سود کی مقدار اصل رقم سے زیادہ ہوتی ہے۔مثلاً ۹۳۔۱۹۹۲ء میں حکومت کو ادائیگی کرنی ہے وہ یہ ہے

اصل قرضے	:	۳۳ارب روپے
سود	:	۸۶ارب روپے
کل ادائیگی	:	۱۱۹ارب روپے

پھر سود میں بھی زیادہ حصہ داخلی قرضوں کا ہوتا ہے۔بیرونی سود اس کے مقابلے میں بہت کم ہے۔مثلاً مذکورہ بالا ۸۶ارب روپے میں ۵۸ ارب روپے داخلی سود ہے اور ۱۵ارب روپے بیرونی سود ہے۔(باقی ۱۳ارب کی بجٹ میں وضاحت نہیں کی گئی)۔

اب تک جو قرضے حکومت کے ذمے واجب الاداء ہیں ان کی تفصیل یہ ہے۔

کل قرضے	۱۳۰۰ارب روپے
داخلی	۱۰۰۰ارب روپے
بیرونی	۳۰۰ارب روپے

داخلی قرضوں کی تفصیل

کل قرضے	۱۰۰۰ارب روپے
اسٹیٹ بینک	۶۷۵ارب روپے
عام بینک	۱۱۰ارب روپے
خاص ڈپازٹ	۲۰۰ارب روپے

بیرونی قرضوں کی تفصیل

بیرونی حکومت سے لیے گئے	۱۹۰ارب روپے
عالمی اداروں سے لیے گئے	۱۱۰ارب روپے
کل	۳۰۰ارب روپے

ان تمام اعداد وشمار سے معلوم ہو گیا کہ حکومت کی تمام ادائیگیوں کا بہت زیادہ حصہ داخلی ہے اور کم حصہ بیرونی ہے۔

خساراتی تمویل کا متبادل طریقہ

جب غیر سودی معیشت کی بات کی جاتی ہے تو خاص طور پر ترقی پذیر ممالک میں سب سے مشکل سوال یہ سمجھا جاتا ہے کہ اگر سود پر قرض لینے کا دروازہ بالکل بند کر دیا جائے تو بجٹ کا خسارہ پورا کرنے کے لئے جو اندرونی اور بیرونی قرضے لیے جاتے ہیں ان کے حصول کی کیا صورت ہوگی؟ کیونکہ جہاں تک تجارتی اداروں کا تعلق ہے، ان میں شرکت اور مضاربت متصور ہو سکتی ہے۔ لیکن حکومت کو جن اخراجات کے لئے قرض لینے کی ضرورت پیش آتی ہے ان میں سے بہت بھاری تعداد ایسے کاموں کی ہے جو نفع بخش نہیں ہے۔ مثلاً سڑک، پل، اور ڈیم وغیرہ بنانا۔ افواج کے لئے جدید اسلحہ فراہم کرنا، اور اس طرح کے دوسرے ایسے منصوبے جن کا فائدہ پوری قوم کو پہنچتا ہے لیکن ان سے براہ راست کوئی آمدنی نہیں ہوتی۔

اس سوال کے جواب میں سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ بجٹ کے خسارے کو کم کرنے کے لئے سب سے پہلے ان مسرفانہ اخراجات کو ختم کرنے کی ضرورت ہے جن کا مظاہرہ شب وروز حکومت کے مختلف اقدامات میں ہوتا رہتا ہے، اور جن کا ایک غریب ملک میں جواز نہیں، اسی طرح ہمارے ملک میں رشوت اور بدیانتی کی بنیاد پر بھی بہت بھاری رقمیں ضائع ہوتی ہیں، جن کے سدباب کی ضرورت ہے، لیکن یہ حقیقت پھر بھی اپنی جگہ ہے کہ مسرفانہ اخراجات ختم کرنے اور بدیانتی کو دور کرنے کے باوجود بھی ملکی ضروریات کے پیش نظر بجٹ کا خسارہ پورا کرنے کے لئے دوسرے ذرائع تمویل کی ضرورت باقی رہے گی، موجودہ حالات میں اس غرض کے لئے اندرونی اور بیرونی قرضے سود پر لیے جاتے ہیں، سود کے خاتمے کے بعد حکومت کی مختلف ضروریات کے لئے مختلف طریقہ ہائے تمویل اختیار کیے جاسکتے ہیں، جن میں سے چند یہ ہیں:

۱۔ حکومت کے جو ادارے نفع بخش ہیں، ٹیلیفون اور ٹیلیگراف کا محکمہ، ان کی تمویل کے لئے مضاربہ سرٹیفکیٹ جاری کیے جاسکتے ہیں، یعنی جو لوگ یہ مضاربہ سرٹیفکیٹ لیں، وہ اس تجارتی ادارے کے منافع میں بحصہ رسدی شریک ہوں۔ اسی طرح سے اگر کوئی شاہراہ یا پل تعمیر کرنا ہے۔ تو اس کے استعمال پر فیس عائد کی جاسکتی ہے جس سے وہ منصوبہ بھی نفع بخش ہو جائے اور اس میں بھی عوام کو مضاربہ سرٹیفکیٹ جاری کیے جاسکتے ہیں۔

۲۔ جو منصوبے کسی بھی صورت میں نفع بخش نہ ہوں، ان کی تمویل کے لئے ایسے غیر سودی بونڈ جاری کیے جا سکتے ہیں، جن پر کوئی معاوضہ نہ دیا جائے، البتہ ان کے حاملین کو ٹیکس میں چھوٹ دی جائے۔ ٹیکس کی چھوٹ کو زیادہ سے زیادہ پر کشش بنایا جا سکتا ہے، ٹیکس چونکہ عوام پر حکومت کا کوئی دین نہیں ہے، اس لئے اس کی معافی یا اس میں رعایت سود میں داخل نہیں ہوگی۔ حکومت ٹیکس لگانے میں اور بعض شعبوں کو چھوٹ دینے میں مختلف عوامل کو پیش نظر رکھتی ہے اگر یہ عامل بھی پیش نظر رہے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔

۳۔ ایک یہ تجویز بھی قابل غور ہے کہ حکومت کو قرضے دے کر سرکاری تمسکات لینے والوں کو ان کے قرضوں پر کوئی مشروط اور طے شدہ اضافہ تو نہ دیا جائے لیکن کبھی کبھی کیف ما اتفق کچھ انعام دیدیا جائے، جس کے مطالبہ کا قانوناً کسی کو کوئی حق نہ ہو، ملیشیا میں اس تجویز پر عمل ہو رہا ہے۔ چونکہ اس طریق کار میں انعام نہ مشروط ہے، اور نہ اس کی شرح طے شدہ ہے، اور نہ اس کا ملنا یقینی ہے، اور نہ اس کا قرض دینے والوں کی طرف سے مطالبہ ہے، اس لئے نظریاتی اعتبار سے اس پر ربا کی تعریف صادق نہیں آئے گی۔ لیکن اندیشہ یہ ہے کہ متواتر عمل کے نتیجے میں یہ "المعروف کالمشروط" کی زد میں آجائے۔ لہٰذا ایک تجویز اور بھی ہے کہ اس زیادہ ادائیگی کو ملک کی مجموعی قومی پیداوار کے ساتھ منسلک کر دیا جائے۔ یعنی قرض کی مدت میں مجموعی قومی پیداوار میں جتنا اضافہ ہو، اتنا ہی اضافہ عوام کو دیا جائے۔ اور اگر کوئی اضافہ نہ ہو تو کوئی اضافہ نہ دیا جائے۔ اس تجویز کے بارے میں ابھی احقر کو نفیاً یا اثباتاً کسی جانب جزم نہیں ہے، لیکن اہل علم کو اس پر غور ضرور کرنا چاہئے۔

۴۔ حکومت کو خود اپنے سرکاری کاموں کے لئے، نیز افواج کے لئے بہت سے مشینی سامان کی ضرورت ہوتی ہے، اس کی تمویل کے لئے اجارہ کا طریقہ بھی بآسانی اختیار کیا جا سکتا ہے۔ بعض مالیاتی اداروں سے وہ سامان اجارہ پر حاصل کر لیا جائے۔

۵۔ اس کے علاوہ ایک کثیر المقاصد طریق کار یہ ہو سکتا ہے کہ حکومت اپنے اخراجات کی تمویل کے لئے ایک تجارتی مالیاتی ادارہ قائم کرے۔ (یہ ادارہ سرکاری شعبے میں بھی قائم کیا جا سکتا ہے، اور اسے نیم سرکاری بھی بنایا جا سکتا ہے)۔ یہ ادارہ عوام کے لئے مضاربہ سرٹیفکیٹ جاری کرے، اور ان سرٹیفکیٹ کے ذریعہ عوام کی رقموں سے حکومت کو مختلف کاموں میں شرکت، مضاربت اجارہ اور مرابحہ کی بنیاد پر تمویل کرے، جن کا تفصیلی طریق کار بینکاری کے بیان میں گزر چکا ہے۔ اس تمویل کے نتیجے میں جو آمدنی حاصل ہو، وہ مضاربہ سرٹیفکیٹ کے حاملین میں بحصہ رسدی تقسیم کی جائے۔ یہ مضاربہ سرٹیفکیٹس ثانوی بازار میں قابل بیع و شراء بھی ہو سکتے ہیں اور اس طرح عوام کو یہ اطمینان بھی

حاصل ہو سکتا ہے کہ وہ اپنی لگائی ہوئی رقموں کو جب چاہیں، ثانوی بازار میں فروخت کر کے واپس حاصل کر سکتے ہیں اور اگر سرٹیفکیٹ اپنے پاس رکھنا چاہیں تو مذکورہ ادارے کی آمدنی میں حصہ دار ہو سکتے ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ مختلف ضروریات کے سلسلے میں مختلف طریق کار اختیار کیے جا سکتے ہیں اور ان کا بہتر نظام وضع کیا جا سکتا ہے۔

اس کے علاوہ اندرونی قرضوں میں ایک بہت بڑی تعداد اسٹیٹ بینک کے قرضوں کی ہوتی ہے۔ اس پر سود کا لین دین محض ایک کتابی جمع خرچ ہے، اس کو ختم کرنے میں کوئی دشواری نہیں۔ اسی طرح وفاقی اور صوبائی حکومتوں کے درمیان قرضوں کے لین دین میں بھی سود کی کاروائی بآسانی ختم کی جا سکتی ہے، جس میں دشواری نہیں۔

جہاں تک بیرونی قرضوں کا تعلق ہے ان کے بارے میں اگر حکومت سنجیدگی کے ساتھ کوشش کرے تو دوسرے ممالک کو بھی اسلامی طریق ہائے تمویل کی بنیاد پر رقمیں فراہم کرنے پر آمادہ کر سکتی ہے۔ بیرونی قرضے دینے والوں کو اصل غرض اس بات سے ہے کہ انہیں نفع حاصل ہو، نفع حاصل کرنے کا طریق بذات خود مقصود نہیں۔ اس کی ایک سادہ سی مثال یہ ہے کہ اب بھی بہت سے ممالک قرض دینے کے ساتھ ساتھ یہ شرط عائد کرتے ہیں کہ سامان ہمارے ملک سے ہی خریدا جائے، جب سامان ان سے خریدنا ہی ہے تو قرض کے بجائے سامان ہی کو مرابحہ مؤجلہ کی بنیاد پر لینے میں کیا دشواری ہے؟ اور اب پوری دنیا میں اسلامی طریقہائے تمویل رفتہ رفتہ پہچانے جانے لگے ہیں۔ آئی، ایم، ایف (I.M.F) اور ورلڈ بینک میں ان پر باقاعدہ ریسرچ ہو رہی ہے اور ان میں سے بعض کی تائید میں مغربی مصنفین کے مقالات بھی آ رہے ہیں۔ آئی ایف سی I F C (انٹرنیشنل فائنانس کارپوریشن) جو عالمی بینک کے طرز کا ایک ادارہ ہے اور نجی تجارتی اداروں کو قرضے دیتا ہے، اب اسلامی بینکوں اور مالیاتی اداروں سے اسلامی طریقہ ہائے تمویل کی بنیاد پر از خود معاملات کر رہا ہے۔ ان حالات میں اگر اسلامی ممالک سنجیدگی اور اہتمام کے ساتھ دوسری حکومتوں سے اس بنیاد پر معاملات کرنے کی کوشش کریں تو اس میں کامیابی زیادہ مشکل نہیں۔

وآخر دعوانا ان الحمد لله رب العالمين

والصلاة والسلام على نبيه الكريم وعلى آله وصحبه اجمعين

تصانیف

مولانا جسٹس (ر) مفتی محمد تقی عثمانی

﴿اُردو﴾

☆ **اسلام اور جدید معاشی مسائل** (کامل سیٹ ۸ جلد)

☆ تجارت کے فضائل و مسائل (جلد اوّل)

☆ خرید و فروخت کی جائز و ناجائز صورتیں (جلد دوم)

☆ خرید و فروخت کے جدید طریقے اور ان کے احکام (جلد سوم)

☆ مخصوص اشیاء کی خرید و فروخت اور ان کے احکام (جلد چہارم)

☆ اسلامی بنکاری اور دورِ حاضر میں اس کی عملی شکل (جلد پنجم)

☆ سود اور اس کا متبادل (جلد ششم) ☆ اسلام کا معاشی نظام (جلد ہفتم)

☆ اراضی کا اسلامی نظام (جلد ہشتم) ☆ اسلام اور جدید معیشت و تجارت

☆ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور تاریخی حقائق ☆ حجیت حدیث

☆ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا (انتخاب احادیث) ☆ حکیم الامت کے سیاسی افکار

☆ تقلید کی شرعی حیثیت ☆ جہانِ دیدہ (بیس ملکوں کا سفرنامہ)

☆ اندلس میں چند روز ☆ اسلام اور سیاستِ حاضرہ ☆ اسلام اور جدت پسندی

☆ اصلاحِ معاشرہ ☆ اصلاحی خطبات (کامل سیٹ) ☆ اصلاحی مواعظ (کامل سیٹ)

☆ اصلاحی مجالس (کامل سیٹ) ☆ احکامِ اعتکاف ☆ اکابر دیوبند کیا تھے؟

☆ آسان نیکیاں ☆ بائبل سے قرآن تک (۳ جلدیں) ☆ بائبل کیا ہے؟

☆ پُرنور دعائیں ☆ تراشے ☆ درسِ ترمذی (۳ جلد)

☆ دنیا مرے آگے (سفرنامہ) ☆ دینی مدارس کا نصاب و نظام ☆ ذکر و فکر

☆ ضبطِ ولادت ☆ عیسائیت کیا ہے؟ ☆ علوم القرآن

☆ عدالتی فیصلے (کامل سیٹ) ☆ فرد کی اصلاح ☆ فقہی مقالات (کامل سیٹ)

☆ آثارِ حضرت عارفیؒ ☆ میرے والد میرے شیخؒ ☆ ملکیت زمین اور اس کی تحدید

☆ نشری تقریریں ☆ نقوشِ رفتگاں ☆ نفاذِ شریعت اور اس کے مسائل

☆ نمازیں سنت کے مطابق پڑھیے ☆ ہمارے عائلی مسائل ☆ ہمارا معاشی نظام

☆ ہمارا تعلیمی نظام ☆ اسلامی بنکاری ☆ ذکر و فکر

﴿عربی﴾

☆ تکملہ فتح الملہم (شرح صحیح مسلم ٦ جلد عربی) ☆ ماھی النصرانیہ ؟ (عربی)

☆ نظرة عابرة حول التعليم الاسلامی (عربی) ☆ احکام الذبائح (عربی)

☆ بحوث فی قضایا فقہیة المعاصرة (عربی)

~.~.~.~.~.~.~.~.~

☆English☆

- ☆ TheNoble Qur'an (2 Vols)
- ☆ An Introduction to Islamic Finance
- ☆ The Historic Judgment on Interest
- ☆ The Rules of Etikaf
- ☆ The Language of the Friday Khutbah
- ☆ Discourses on the Islamic Way of Life
- ☆ Easy Good Deeds
- ☆ Sayings of Muhammad ﷺ
- ☆ The Legal Status of Following a Madhab
- ☆ Spritual Discourses
- ☆ Islamic Months
- ☆ Perform Salah Correctly
- ☆ Radiant PrayersHB
- ☆ Quranic Science
- ☆ Islam and Modernism
- ☆ What is Christianity
- ☆ The Authority of Sunnah
- ☆ Contemporary Fatawa

~ ~ ~ ~ ~ ~ ~ ~ ~

﴿صاحب تصنیف﴾

نام: مولانا مفتی محمد تقی عثمانی ابن حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ
(مفتی اعظم پاکستان، بانی جامعہ دارالعلوم کراچی)۔

ولادت: ۵ شوال المکرم ۱۳۶۲ھ (اکتوبر 1943ء)

تعلیم: ۱۔ تکمیل درسِ نظامی جامعہ دارالعلوم کراچی ۱۳۷۹ھ (1960ء)
۲۔ فاضل عربی پنجاب بورڈ (امتیازی درجہ کے ساتھ) (1958ء)
۳۔ بی۔اے کراچی یونیورسٹی۔ (1964ء)
۴۔ ایل۔ایل۔بی کراچی یونیورسٹی (امتیازی درجہ کے ساتھ) (1967ء)
۵۔ ایم۔اے عربی پنجاب یونیورسٹی (امتیازی درجہ کے ساتھ) (1970ء)

تدریس: ☆ شیخ الحدیث جامعہ دارالعلوم کراچی (۴۹ سال سے زائد عرصہ سے جامعہ دارالعلوم کراچی میں حدیث وفقہ کے علاوہ مختلف اسلامی علوم کی تدریس)

صحافت: ۱۔ نگران شعبہ تصنیف وتالیف۔جامعہ دارالعلوم کراچی
۲۔ مدیر اعلیٰ۔ ماہنامہ ''البلاغ'' (1967ء) سے تا حال
۳۔ مدیر اعلیٰ۔ ماہنامہ ''البلاغ انٹرنیشنل'' انگریزی (1989ء) سے تا حال

مناصب: ۱۔ نائب صدر جامعہ دارالعلوم کراچی (1976ء) سے تا حال
۲۔ چیئر مین '' انٹرنیشنل شریعہ سٹینڈرڈز کونسل (International Shariah Standards Council) (ذیلی ادارہ)۔
''اکاؤنٹنگ اینڈ آڈیٹنگ آرگنائزیشن فار اسلامک فنانشل انسٹی ٹیوشنز''
(Accounting & auditing Organization For Islamic Financial Institutions).
۳۔ مستقل ممبر ''انٹرنیشنل اسلامک فقہ اکیڈمی''۔جدہ (ذیلی ادارہ۔O.I.C)
۴۔ ممبر ''اسلامک فقہ اکیڈمی آف رابطہ عالم اسلامی'' (مکہ مکرمہ)
۵۔ چیئر مین مرکز الاقتصاد الاسلامی (centre for Islamic Economics) 1991ء سے تا حال۔

۶۔جج شریعت ایپلٹ بینچ (سپریم کورٹ آف پاکستان) (1982تا مئی2002)
۷۔جج ''فیڈرل شریعت کورٹ آف پاکستان'' (1980ء تا 1982ء)
۸۔ممبر آف سنڈیکیٹ کراچی یونیورسٹی (1985ء تا 1988ء)
۹۔ممبر ''بورڈ آف گورنرز، انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی۔اسلام آباد''(1985ء تا 1989ء)
۱۰۔ممبر ''انٹرنیشنل انسٹیٹیوٹ آف اسلامک اکنامکس''(1985ء تا 1988ء)
۱۱۔ممبر ''اسلامی نظریاتی کونسل پاکستان'' (1977ء تا 1981ء)
۱۲۔ممبر ''بورڈ آف ٹرسٹیر انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی، اسلام آباد۔(2004ء تا 2007ء)
۱۳۔ممبر ''کمیشن فور اسلامائیزیشن آف اکنامی پاکستان''۔